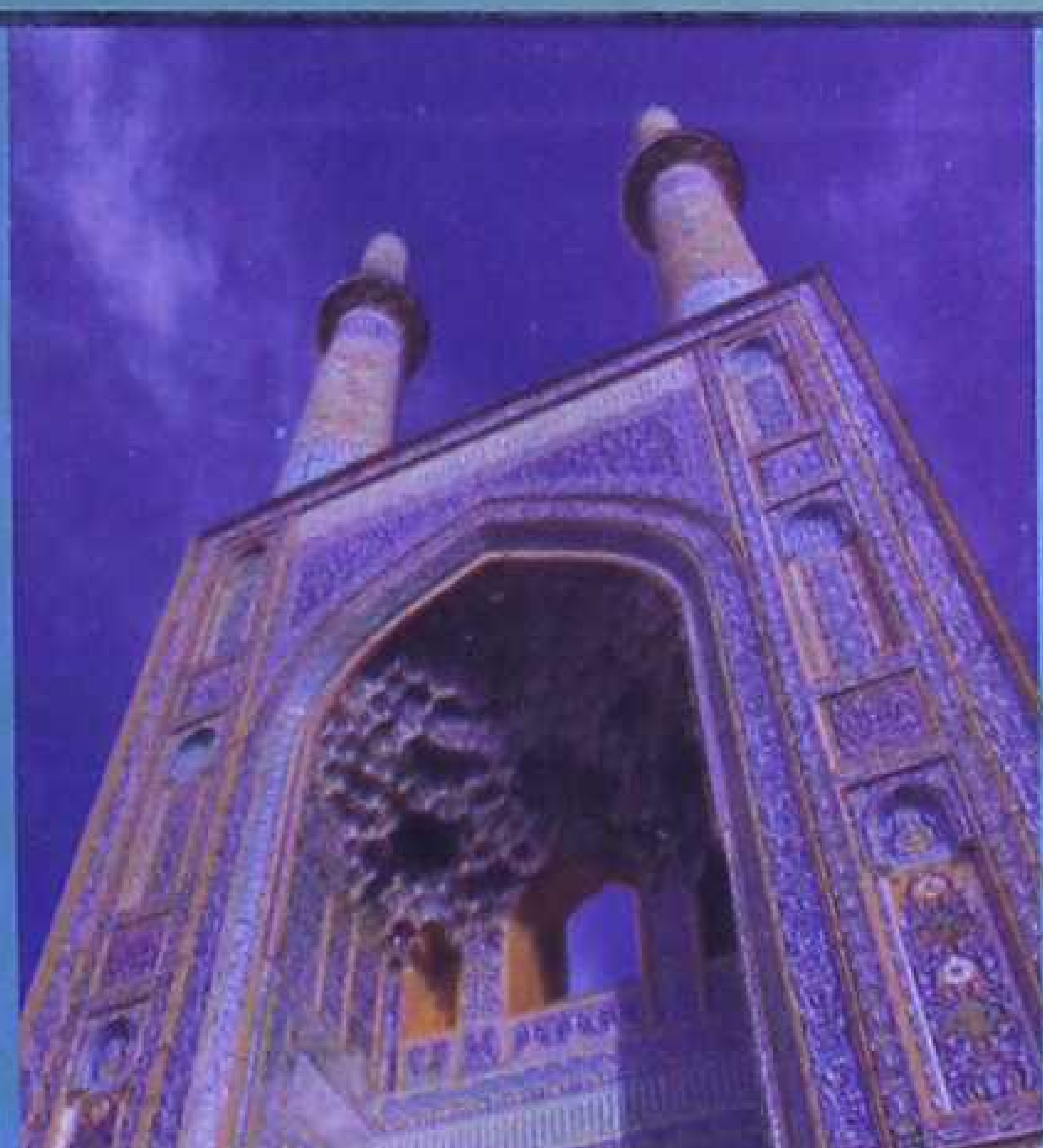


خطبات و تقاریر

ڈاکٹر محمود احمد غازی

# مسلمانوں کا دینی و عصری نظام تعلیم



مرتب

ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن

الشریعہ اکادمی

# مسلمانوں کا دینی وعصری نظام تعلیم

خطبات وتقاریر:

ڈاکٹر محمود احمد غازی

مرتب:

ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن

(سلسلہ مطبوعات:۱۷)

کتاب: مسلمانوں کا دینی وعصری نظام تعلیم

خطبات وتقاریر: ڈاکٹر محمود احمد غازی

مرتب: ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن

ناشر: الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ

مطبع — اشتیاق مشتاق پرنٹرز لاہور

اشاعت اول: دسمبر ۲۰۰۹

قیمت: 175 روپے

# فہرست

# انتساب

ماہر تعلیم، استاد، محقق، ماہر لسانیات اور سیرت نگار

## ڈاکٹر سید محمد ابو الخیر کشفی رحمہ اللہ

کے نام

# پیش گفتار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کسی بھی قوم کے عروج وزوال میں تعلیم اور نظام ونصاب تعلیم کا کردار کسی ذی شعور سے پوشیدہ نہیں۔ دینی امور ہوں یا دنیاوی، ہر معاملے میں تعلیم کا کردار نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ خود مسلمانوں کا حال ہمارے سامنے ہے۔ ان کی پوری تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جب تک ان کا نظام تعلیم درست نہج پر استوار اور مستند ہاتھوں میں رہا، اس وقت تک ان کا جھنڈا بلند اور ان کا نام کامیابیوں کی ضمانت سمجھا جاتا رہا اور جب مسلمان اپنے نظام ونصاب تعلیم کے حوالے سے تساہل پسندی کا شکار ہوئے تو ان کی دنیاوی وجاہت اور دینی وقار دونوں رفتہ رفتہ ان کے لیے اجنبی ہوتے چلے گئے۔

مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں برصغیر پاک وہند کے تجربات نہایت اہم ہیں۔ یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے تاریخ نے ایک نیا موڑ لیا۔ اس نے اس خطے کے مسلمانوں کی تعلیم، ثقافت، تہذیب، تمدن، علوم وفنون، رہن سہن ہر چیز کا جغرافیہ بدل کر رکھ دیا۔ اس کے شواہد بہ کثرت موجود ہیں کہ یہی کچھ مقصود بھی تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں شکوہ ان سے نہیں، اپنے آپ سے ہونا چاہیے۔ وہ تو غیر تھے، وہ یہ کچھ نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟ کیا وہ ہمارے مقاصد کی تکمیل کے لیے اس خطے میں آئے تھے؟ سوال یہ ہے کہ ہم نے کیا کیا؟ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ سوال اہم ہے کہ ہم آج کیا کر رہے ہیں؟ ہم تو آج تک اس بحث بلکہ کج بحثی سے باہر نہیں نکل سکے کہ علی گڑھ تحریک نے کیا کیا

غلطیاں کیں اور دارالعلوم دیو بند کے فکر و عمل میں کیا کیا کوتاہیاں رہیں۔ ان اداروں کی تاریخ میں جو خوبیاں پنہاں ہیں اور ان اداروں نے ہمیں جو کچھ عطا کیا، اس کی روشنی میں ہم آئندہ کے لیے بلکہ اپنے ''آج'' کے لیے اگر کچھ کر گزریں، پھر ان کی فروگزاشتوں پر تبصرہ فرمائیں، تب بھی کوئی بات ہے۔ محض بحث برائے بحث اور صدی ڈیڑھ صدی پہلے گزر جانے والوں کی خطا شماری سے، جبکہ مقصد آج بھی ان سے سبق حاصل کرنا نہ ہو، ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔

ہمارے تعلیمی مسائل پر مختلف جہتوں سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس موضوع سے تعلق رکھنے والے مختلف ادارے اور شخصیات اپنی آرا سے قارئین کی راہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیمی موضوعات پر ایک وقیع سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے، مگر عام طور پر یہ ہوا ہے (گو اس میں استثنائی صورتیں موجود ہیں) کہ تعلیمی مسائل کے حوالے سے قلم اٹھانے والے فضلا یا تو عصری علوم سے واقفیت رکھتے ہیں اور دینی علوم اور ان کی تعلیم میں مسلمانوں کے منہج اور اس کی تاریخ و روایت سے زیادہ آگاہ نہیں ہوتے اور یا دینی حوالے سے قلم اٹھاتے ہیں تو محض دینی تعلیم کی اہمیت کا اظہار ان کا مقصود ہوتا ہے۔ یہ صورت حال تحریر کو یک طرفہ بناتی ہے اور ایسی صورت میں حقائق تک رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔

زیر نظر کتاب کے فاضل مولف جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی کے تعارف کی نہ ضرورت ہے اور نہ راقم اس کا اہل ہے۔ اس کتاب کے مباحث درحقیقت جناب غازی صاحب کے مختلف محاضرات ہیں جو متفرق مواقع پر دیے گئے۔ ان میں سے ہر محاضرہ یا خطبہ اپنی جگہ ایک مستقل کتاب کی اہمیت رکھتا ہے اور اسی سبب سے یہ الگ الگ کسی نہ کسی شکل میں شائع ہو کر وسیع حلقے میں مقبول بھی ہو چکے ہیں۔ راقم کی نظر میں ان محاضرات کی دو خوبیاں اسے تعلیم کے حوالے سے موجود ذخیرے سے ممتاز کرتی ہیں۔ ایک تو یہ ڈاکٹر صاحب کا تجزیہ نہایت محتاط ہے اور انھوں نے اسلاف کی خطا شماری کو مقصود بنائے بغیر ماضی کا بے لاگ تجزیہ کیا ہے اور مستقبل کے لیے ہماری راہیں متعین کی ہیں۔

دوسرے وہ جدید وقدیم، دینی وعصری دونوں طرح کے علوم سے نہ صرف پوری طرح واقف ہیں بلکہ ایک عرصے سے تدریسی ذمہ داریاں بھی انجام دے رہے ہیں۔ اس بنا پر تعلیمی مسائل پر ان کی نظر وسیع بھی ہے اور عمیق بھی۔ وہ مسائل پر بات کرنے سے پہلے ان اسباب پر بات کرتے ہیں جن سے ان مسائل نے جنم لیا اور پھر ان کے حل کے لیے نہ صرف راہیں متعین کرتے ہیں بلکہ اس راستے میں پیش آنے والی ممکنہ رکاوٹوں کا ذکر کر کے ان اقدامات کی بھی نشان دہی کرتے ہیں جو ان رکاوٹوں کو دور کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے بعض مقامات پر تنقید بھی کی ہے مگر یہ تنقید تعمیری تنقید ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بات دلیل کے ساتھ ہے، ان کا اسلوب حکیمانہ ہے اور ان کی تنقید ہمیں آگے بڑھنے کی تحریک بھی دیتی ہے۔ ان کا لہجہ ایک دل دردمند کا لہجہ ہے جو حالات حاضرہ پر صرف کڑھنے کو کافی نہیں سمجھتا، بلکہ سوئے ہوؤں کو بیدار کرنے کی تڑپ بھی رکھتا ہے۔ کتاب کا موضوع اہم ہے، مگر اس سے زیادہ دلوں میں اتر جانے والا وہ اسلوب اہم ہے جو ہر سننے اور پڑھنے والے پر اپنا تاثر بھی چھوڑتا جاتا ہے اور عمل کا داعیہ بھی پیدا کرتا ہے۔

راقم نے ان مباحث کی اہمیت کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب سے انھیں مرتب کرنے کی اجازت چاہی اور ڈاکٹر صاحب نے ہمیشہ کی طرح شفقت کا مظاہرہ فرماتے ہوئے اجازت عطا فرمائی جس پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔ راقم نے کوشش کی ہے کہ اس مجموعے کے مندرجات میں تکرار کم سے کم ہو، مگر چونکہ یہ تمام محاضرات مختلف اوقات میں اور مختلف مواقع پر دیے گئے ہیں، اس بنا پر قدرے تکرار ناگزیر ہے۔ کچھ مقامات پر آیات اور احادیث کے حوالے درج کرنے کی بھی کوشش کی ہے تاکہ یہ مجموعہ قارئین کے لیے زیادہ مفید ثابت ہو سکے۔

یہ کتاب الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ سے شائع ہو رہی ہے۔ کتاب کی ترتیب واشاعت میں الشریعہ اکادمی کے ڈائریکٹر اور ہمارے مخدوم مولانا زاہد الراشدی اور ان کے ساتھ ساتھ الشریعہ

اکادمی کے روح رواں برادرم جناب عمار ناصر صاحب کی خصوصی دلچسپی میرے لیے موجب امتنان ہے۔ برادر محترم جناب شبیر احمد خان میواتی کا بھی شکریہ کہ وہ اس کتاب کی ترتیب کے محرک رہے اور انھوں نے بعض خطبات کی فراہمی میں بھی تعاون کیا۔

کتاب اپنا تعارف خود ہے۔ قارئین سے فاضل مولف، گرامی قدر ناشرین اور حقیر مرتب کے لیے دعاؤں کی درخواست ہے۔

سید عزیز الرحمٰن
دارالعلم والتحقیق، کراچی
یکم محرم ۱۴۳۱ھ/۱۹/دسمبر ۲۰۰۹ء

# دیباچہ

نحمده تبارك وتعالى ونصلي ونسلم على رسوله الكريم وعلىٰ آله واصحابه واتباعه اجمعين۔

عالم اسلام پر مغربی استعماری ممالک کے تسلط کے گزشتہ دوصدیوں پر محیط دورانیے پر ایک نظر ڈالی جائے تو جہاں ایک طرف یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ سیاست، معیشت، ایڈمنسٹریشن، عسکری قوت، تعلیم، سائنس، ٹیکنالوجی اور اس نوعیت کے دیگر اجتماعی شعبوں میں مسلمانوں کو دنیا بھر میں مغربی استعمار کی یلغار کے سامنے مسلسل سپر انداز ہونا پڑا ہے اور وہ اپنی روایتی شناخت اور امتیاز سے بتدریج محروم ہوتے چلے گئے ہیں، وہاں یہ منظر بھی ہمارے سامنے ہے کہ عقیدہ وثقافت کے محاذ پر مغربی استعمار کی یہ یلغار مسلمانوں کے قدموں کو ڈگمگانے میں کامیابی حاصل نہیں کر سکی، بلکہ دینی تعلیمات اور مذہبی اقدار کی طرف مسلمانوں کی واپسی کی رفتار اور تناسب میں مسلسل اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے جس پر آج کی مغربی دانش کو سخت پریشانی کا سامنا ہے، اس لیے کہ تمام تر خرابیوں کے باوجود ایک مسلمان کی ذاتی اور خاندانی زندگی میں آج بھی مذہب سب سے بڑا حوالہ ہے اور قرآن وسنت اس کی عقیدت ووفاداری کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ عام مسلمان کی عقیدت اور جذباتی وابستگی میں کوئی فرق نہیں آیا جس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ قرآن کریم کسی تحریف وتبدل کے بغیر اصلی حالت میں مسلمانوں کے پاس موجود ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

کے ارشادات واعمال اور حالات وواقعات کا مستند اور جامع ذخیرہ اس کی راہ نمائی کے لیے میسر ہے، لیکن اس کے ساتھ ان افراد وطبقات کی مخلصانہ مساعی بھی اس سلسلے میں کلیدی کردار کی حیثیت رکھتی ہیں جنھوں نے قرآن وسنت اور ان سے متعلقہ علوم کی حفاظت اور ان کی ترویج وتدریس میں بے پناہ ایثار واستقامت کے ساتھ قابل قدر قربانیاں دی ہیں اور تعلیمات کے تحفظ وترویج کے ساتھ ساتھ ان پر عمل درآمد کے ماحول کو باقی رکھنے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس میں جہاں مساجد، مدارس اور خداترس بزرگوں کی خانقاہوں کا کردار نمایاں ہے، وہاں ان دانش وروں اور اصحاب علم کی خدمات بھی انتہائی اہمیت کی حامل ہیں جنھوں نے دینی علوم کے علاوہ عصری علوم میں بھی مہارت حاصل کی، قدیم وجدید کے علمی ذخیروں پر مکمل دسترس کے ساتھ اسلامی عقیدہ وثقافت اور علوم وروایات کے تحفظ وترویج کا محاذ سنبھالا، مغرب کی فکری وثقافتی یلغار کا پورے اعتماد اور حوصلے کے ساتھ سامنا کیا اور دلیل ودانش کے ساتھ اسلام کا مقدمہ نئی نسل کے سامنے پیش کر کے اسے گمراہی اور ارتداد سے محفوظ رکھنے میں کافی حد تک کامیاب رہے۔

آج کی مسلمان نسل میں اگر دین کے ساتھ وابستگی کا ذوق موجود ہے بلکہ ترقی کرتا نظر آ رہا ہے اور اسلامی عقائد وروایات کی طرف رجوع کا رجحان مسلسل بڑھ رہا ہے تو اس کے پیچھے جہاں مساجد ومدارس کے عمومی ماحول اور دعوت وتبلیغ کے پھیلتے ہوئے دائرے کارفرما ہیں، وہاں ان ارباب فکر ودانش کی سعی ومحنت کا حصہ بھی اس میں کم نہیں ہے جو بظاہر عصری تعلیمی اداروں میں عصری علوم وفنون کی تدریس میں مصروف ہیں، لیکن ایک سچے اور بصیرت وحکمت سے بہرہ ور مسلمان کے طور پر نئی نسل کو فکری گمراہی اور ثقافتی کج روی سے محفوظ رکھنے کے لیے بھی پوری فکرمندی اور حوصلہ واستقامت کے ساتھ خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ہمارے دور میں اس ذوق کی نمائندگی کرنے والوں میں محترم ڈاکٹر محمود احمد غازی صف اول کے راہ نما اور دانش ور ہیں جو اگرچہ علماء کے روایتی حلقے کے نمائندہ نہیں سمجھے جاتے، لیکن دین کی علمی روایت کو آگے بڑھانے اور غیر روایتی حلقوں میں اسلامی تعلیمات وروایات پر استقامت اور پختگی کا

ذوق بیدار کرنے میں ان کا کردار اپنی اہمیت وافادیت میں کسی بڑے روایتی ادارے سے کم نہیں ہے۔ڈاکٹر محمود احمد غازی اس حلقے میں بیٹھ کر منطق واستدلال اور فکر ودانش کے ہتھیاروں کے ساتھ دینی روایت کی جنگ لڑ رہے ہیں جسے عام طور پر گم راہی اور کج روی کا شکار سمجھا جاتا ہے اور ان کا وجود اس ماحول میں اسلام کی علمی روایت اور دینی اقدار کے ساتھ اپنا شعوری رشتہ قائم رکھنے کے خواہش مند افراد وطبقات کے لیے بہت بڑا سہارا ہے۔

مختلف موضوعات پر ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کے محاضرات، مقالات اور بیانات وخطبات قدیم وجدید دونوں حلقوں کے لیے یکساں افادیت کے حامل ہیں اور اپنے مواد، قوت استدلال اور ندرت فکر کے حوالے سے اہل علم کے لیے بیش بہا تحفہ ہیں۔ان کے مقالات وخطبات کا زیر نظر مجموعہ دینی وعصری تعلیم کے موضوع پر جن عنوانات کا احاطہ کرتا ہے، وہ آج کے اہم اور حساس موضوعات ہیں اور ان پر ڈاکٹر صاحب کا اظہار خیال آج کی ضروریات اور تقاضوں کی طرف ارباب علم ودانش کو توجہ دلانے کی ایک کامیاب کوشش ہے جس پر وہ شکریہ وتبریک کے مستحق ہیں۔ عزیز گرامی ڈاکٹر سید عزیز الرحمٰن نے ان خطبات ومقالات کو ایک مجموعے کی شکل دے کر ایک اہم علمی خدمت انجام دی ہے اور الشریعہ اکادمی کے زیر اہتمام اسے اس دعا کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے کہ اللہ رب العزت اس مجموعے کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے راہ نمائی کا ذریعہ بنائیں اور ڈاکٹر صاحب موصوف کو صحت وعافیت کے ساتھ زیادہ دیر تک دین اور علم کی خدمت کرتے رہنے کی توفیق سے نوازیں۔آمین یارب العالمین۔

ابوعمار زاہد الراشدی

ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ

(۱۹/دسمبر ۲۰۰۹ء)

# دینی مدارس:
# مفروضے، حقائق، لائحہ عمل

[۳؍اگست ۲۰۰۰ء کو انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد
کے زیر اہتمام منعقدہ ایک تقریب سے خطاب]

برادران محترم!

دینی مدارس نے پچھلے دوسو سال سے خاص طور پر اور اس سے پہلے پوری اسلامی تاریخ میں عام طور پر ایک انتہائی فعال، تعمیری اور موثر کردار ادا کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ہاں دینی مدارس اور غیر دینی مدارس کی تفریق نہیں تھی۔ تقریباً بارہ سو سالہ اسلامی تاریخ میں دنیائے اسلام اس تفریق سے نا آشنا رہی ہے۔ جس نظام تعلیم کی پیداوار مجدد الف ثانیؒ (م: ۱۳ ر نومبر ۱۶۲۴) تھے ـــــ جنہیں دنیائے اسلام نے دوسرے ہزاریے کا مجدد قرار دیا، جن کو علامہ اقبالؒ نے مسلم ہندوستان کا سب سے بڑا Religious genius یعنی دینی نابغہ قرار دیا ـــــ اسی نظام تعلیم کی پیداوار اس دور کے دوسرے تمام اہل علم، ارباب سیاست وحکومت اور دیگر اصحاب ادب ودانش بھی تھے۔ حضرت مجددؒ صاحب اور سلطنت مغلیہ کے وزیر اعظم نواب سعد اللہ خان مرحوم دونوں ہم درس تھے۔ وہ ایک ہی درس گاہ میں اور ایک ہی استاد کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کر کے تیار ہوئے تھے۔ تاج محل اور دوسری عظیم الشان عمارتیں بنانے والا ماہر تعمیرات بھی انہی درس گاہوں کا پڑھا ہوا تھا جن درس گاہوں سے شاہ ولی اللہؒ کے والد شاہ عبدالرحیمؒ پڑھ کر تیار ہوئے تھے۔

اس لیے میں یہ بات بلا خوف تردید عرض کر سکتا ہوں کہ تعلیم کی وحدت، نظام تعلیم کی یکسانیت اور یکجہتی، ملت اسلامیہ کی یکسانیت، یکجہتی اور یک رنگی کے لیے ایک لازمی شرط ہے۔ ایسی ہر صورت حال جس سے مسلمان دو مختلف طبقوں یا ایک سے زائد طبقوں میں تقسیم ہو جائیں ـــــ وہ طبقے تعلیم کے نام پر قائم کیے جائیں، وہ طبقے کسی کی آمدنی کے نام پر قائم کیے جائیں یا رنگ اور نسل کی بنیاد پر قائم کیے جائیں ـــــ ان تمام طبقوں کی بنیاد پر الگ الگ تعلیمی، دینی اور مذہبی اداروں کا وجود اسلام کے مزاج کے خلاف اور غیر اسلامی ہے۔ اس لیے میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ ملک میں دینی تعلیم

اور غیر دینی تعلیم کے جداگانہ اور بالکل الگ الگ ادارے جس انداز سے قائم ہیں، اس سے ملک و ملت کی وحدت اور یکجہتی متاثر ہو رہی ہے۔ اس سے روزانہ، آنے والا ہر لمحہ اور ہر صبح طلوع ہونے والا سورج ملک میں دوئی، ثنویت اور افتراق کے جراثیم لے کر آ رہا ہے۔ اگر اجازت دی جائے تو سخت الفاظ استعمال کرنا چاہتا ہوں کہ یہ دوئی سیکولرزم کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہے۔ ہم نے بطور قوم اور ملک غالباً اس بات کو عملاً قبول کر لیا ہے، یا کم از کم ہم میں سے بہت لوگوں نے قبول کر لیا ہے کہ دین اور دنیا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دین کے مقاصد کی خاطر فلاں اداروں میں لوگ تیار ہوں گے اور دنیا کے مقاصد کی خاطر فلاں اداروں میں تیار ہوں گے۔ میں انتہائی ادب سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دین و دنیا کی اسی ابتدائی فکری اور نظری تفریق کی بنیاد پر سیکولرزم کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

پچھلے چند مہینوں میں مجھے خاص طور پر ملک کے انتہائی جید اہل علم سے، بالخصوص بعض جید محترم علمائے کرام سے تبادلہ خیال اور استفادہ کا موقع ملا ہے۔ علمائے کرام کی قابل لحاظ تعداد اس ضرورت کو محسوس کرتی ہے کہ ''دینی مدارس کے نظام اور نصاب میں مثبت تبدیلی لائی جانی چاہیے'' لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ ملک کی دینی قیادت میں بعض انتہائی قابل احترام بزرگ ابھی تک ایک مختلف تصور پر سختی کے ساتھ قائم ہیں۔ مجھے ان میں سے بعض کی خدمت میں نیاز حاصل کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے جنہوں نے ہر ایسے موضوع پر کسی قسم کی گفتگو کرنے، گفتگو میں حصہ لینے سے یا گفتگو میں شریک ہونے سے صاف صاف انکار فرمایا جس کا مقصد یہ ہو کہ دینی مدارس کی پیداوار یا دینی مدارس کے طلبہ کا معاشرے میں مسجد کی خدمت کے علاوہ بھی کوئی اور رول یا کردار ہو سکتا ہے۔ ایک بزرگ نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ:

> ''ہم تو مسجد کے ٹکڑوں پر پلنے والے کٹھ ملا ہی تیار کرنا چاہتے ہیں، اس کے علاوہ ہمارا کوئی مقصد نہیں۔ دینی مدارس اس وقت تک ہی قائم رہ سکتے ہیں جب تک ان کو صرف مسیتے پیدا کرنے ہوں۔''

یہ الفاظ خود انہوں نے اپنی زبان مبارک سے ادا فرمائے۔ یقیناً ایسے بزرگوں کی تعداد بہت کم ہے، لیکن ایسے حضرات ہمارے اکابر کی صفوں میں موجود ہیں۔ میرا تاثر یہ ہے کہ شاید انہی اکابر کی شدتِ احساس کی وجہ سے یہ خیال پھیل گیا ہے کہ حکومت پاکستان دینی مدارس میں مداخلت کا کوئی

ارادہ رکھتی ہے یا مداخلت کا کوئی منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے۔

آپ میں سے اکثر بزرگ اور احباب مجھ سے شخصاً بھی واقف ہیں اور شاید یہ حسن ظن بھی رکھتے ہیں کہ میں کوئی جھوٹا یا غیر ذمہ دار آدمی نہیں ہوں اور نہ مجھے بددیانت سمجھتے ہیں۔ اس حسن ظن کی بنا پر جو آپ حضرات کو میری نسبت حاصل ہے، میں واضح طور پر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسا کوئی پروگرام حکومت پاکستان کے پیش نظر نہیں ہے اور اگر خدانخواستہ ایسا کوئی پروگرام ہوا تو میں پہلا آدمی ہوں گا جو اس سے اظہار براءت کرے گا۔

دینی مدارس کو خیر کا موثر مرکز بنانے کے لیے میں نے حکومت پاکستان کے ذمہ داران سے انہی میدانوں میں اور انہی خطوط پر بات کی ہے جو آج انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے اس سیمینار میں آپ حضرات کے پیش نظر ہیں۔ آپ حضرات بھی سب ہی لوگ دین دار، دین سے محبت رکھنے والے اور مخلص خادمان دین ہیں۔ اس محفل میں کوئی مغرب زدہ یا مغرب سے مرعوب فرد بیٹھا ہوا نہیں ہے۔ بہرحال حکومت کے ذمہ داران کے ذہن میں اگر کچھ ہے تو وہی ہے جو انہی خطوط پر انہیں بتایا گیا ہے جسے آپ اپنے مباحث میں اٹھا رہے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ (صدر) جنرل پرویز مشرف صاحب کے ذہن میں کوئی تصور دینی مدارس کی آزادی اور خودمختاری کو مجروح کرنے کا نہیں ہے اور نہ وہ کوئی ایسا ایجنڈا ہی لے کر آئے ہیں۔ یہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۹۹ء کی بات ہے جب میری ان سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی تھی۔ تب میں نے واضح طور پر ان سے یہ بات کہی تھی کہ ''دینی مدارس کے نظام میں اگر کوئی ایسی کوشش کی گئی جس سے ان کی آزادی اور خودمختاری میں کوئی فرق پڑا تو نہ صرف یہ کہ ایسی کوئی کوشش قابل عمل نہیں ہوگی، بلکہ یہ ملک وملت کے دینی مستقبل کے لیے انتہائی نقصان دہ اور تباہ کن بھی ہوگی۔'' میں نے جنرل مشرف سے کہا تھا: ''حکومت پاکستان نے فیلڈ مارشل ایوب خان مرحوم (۱۹۵۸ء۔۶۹) کے دور جاہ وجلال میں تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے اور ملک کی شاید دو لاکھ مساجد میں صرف آٹھ سو مساجد کا انتظام وانصرام مشرقی اور مغربی پاکستان کے صوبائی اوقاف کے محکمے مشترکہ طور پر سنبھال سکے۔ آج مغربی پاکستان سے چاروں صوبوں کی ان مساجد یا ان میں سے چند مساجد سے ملحق مدارس کی کیفیت اور دوسرے

غیر سرکاری مدارس کا انتظام دیکھ لیجیے تو معلوم ہو جائے گا کہ سرکاری انتظام میں اور بیوروکریسی کے ہاتھوں میں اگر دینی معاملات دے دیے جائیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ پھر میں نے وفاقی کابینہ اور نیشنل سیکیورٹی کونسل کے مشترکہ اجلاس میں تقریباً دو گھنٹے تک اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔

میں یہ چاہتا تھا کہ وہ حضرات جن کو دینی مدارس سے واقفیت نہیں ہے یا انہیں دینی مدارس کے پس منظر سے واقف ہونے کا موقع نہیں ملا اور اس اجتماع میں غالب اکثریت ایسے ہی حضرات کی تھی، ان کو تفصیل سے بتایا جائے کہ دینی مدارس کی تاریخ کیا رہی ہے اور کس انداز سے انہوں نے ملک وملت کو پوری تاریخ میں بالعموم اور انگریز کی دوسوسالہ تاریخ میں بالخصوص یہاں اسلامی تہذیب، اسلامی تمدن، مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا تحفظ کیا۔ اس لیے دینی مدارس میں اگر کسی اصلاح یا بہتری کی کوئی خواہش یا کاوش ہو تو اس کی اولین شرط یہ ہے کہ دینی مدارس کی آزادی اور خودمختاری میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔

دینی مدارس کا موجودہ نظام اور نصاب ملا نظام الدین سہالویؒ کا مرتب کیا ہوا ہے۔ جملہ معترضہ کے طور پر عرض کرتا ہوں۔ ابھی چند مہینے پہلے کی بات ہے کہ ایک محترم بزرگ سے بات ہوئی۔ انہوں نے فرمایا: ''اس پر تو علمائے امت کا اجماع ہے کہ دینی تعلیم کے لیے واحد نظام درس نظامی ہے۔'' میں نے پہلے تو سمجھا کہ شاید میں غلط سن رہا ہوں۔ اپنی غلط فہمی دور کرنے کے لیے دوبارہ عرض کیا کہ ''حضرت کیا فرمایا ہے؟'' تو انہوں نے پھر یہی جملہ دہرایا۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ ان کے نزدیک ''اجماع'' کا مفہوم کیا ہے؟ بھلا دینی مدارس کے لیے درس نظامی کے اختیار کرنے یا نہ کرنے جیسے خالص انتظامی معاملے کا اجماع امت کی خالص فقہی اور اصولی اصطلاح سے کیا تعلق ہے؟ پھر انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا: ''یہ تو امام غزالی کے دور سے مدرسہ نظامیہ کے وقت سے چلا آرہا ہے۔'' حدِ ادب کا پاس ولحاظ کرتے ہوئے میں نے احتراماً اس کی تردید نہیں کی، وضاحت بھی نہیں کی لیکن اس سے آپ کو یہ ضرور اندازہ ہو جائے گا کہ کس طرح کے تاثرات اور کس طرح کے خیالات یا غلط فہمیاں بعض دینی حلقوں میں موجود ہیں۔

سوال یہ ہے کہ درس نظامی کا یہ نصاب ملا نظام الدین سہالوی مرحوم ومغفور نے کیوں اور کس مقصد کی خاطر مرتب کیا تھا؟ اس پر اگر ذہن صاف ہو اور تاریخی حقائق سامنے ہوں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ برصغیر میں سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں، جس کو اب برصغیر کی اسلامی تاریخ کا دور زوال اور دور انحطاط بھی کہہ سکتے ہیں، ریاستی نظام چلانے، اسلامی عدالتوں کو قاضی، مفتی اور مقنن فراہم کرنے کی خاطر یہ نصاب تیار کیا گیا تھا۔ یہ زمانہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ابتدائی دور تھا۔ جب اٹھارویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاہ عالم سے دیوانی خرید لی تو کمپنی کے زیر انتظام صوبوں کے بارے میں یہ شرط رکھی گئی کہ وہاں کا نظام بدستور فقہ حنفی کے مطابق چلتا رہے گا۔ اس نظام کے لیے کمپنی کے کارپردازوں نے بھی اپنے اہتمام میں درس نظامی کے کئی ادارے قائم کیے۔ یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کے مکمل اور حتمی سقوط تک جاری رہا۔ بہرحال، اس کے بعد چونکہ یہی نصاب موجود تھا اور اسی نصاب کے تیار کردہ علما دستیاب تھے، اس لیے جب دارالعلوم دیوبند اور دوسرے مدارس قائم ہوئے تو انہوں نے اسی نصاب کو قابل عمل پایا اور اس کو اختیار کر لیا لیکن دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد خود اس نصاب میں پچھلے سو سال میں اب تک جتنی بڑی تبدیلیاں ہوئی ہیں، انہوں نے اس نصاب کو ''حقیقی درس نظامی'' نہیں رہنے دیا۔ آج کا رائج الوقت درس نظامی اصل درس نظامی سے بہت مختلف چیز بن چکا ہے، لیکن تاریخی تسلسل میں اگر اس کو ''درس نظامی'' کہا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی۔

دینی مدارس کا نظام، وہ درس نظامی ہو یا اس کی کوئی مزید بہتر شکل، اس کا بنیادی مقصد دینی علوم کے محققین، محدثین، مفسرین، فقہا، مبلغین اور مربی پیدا کرنا ہے۔ میرے یا حکومت کے ذمہ داران میں سے کسی کے ذہن میں یہ مقصد نہیں ہے کہ دینی مدارس مثلاً جامعہ اشرفیہ لاہور، جامعہ سلفیہ فیصل آباد، جامعہ خیر المدارس ملتان، جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور، دارالعلوم غوثیہ محمدیہ بھیرہ، دارالعلوم کراچی، جامعۃ المنتظر لاہور یا مدرسہ تفہیم القرآن مردان وغیرہ جیسے اداروں میں محدثین، مفسرین، متکلمین اور فقہائے اسلام کے بجائے کمپیوٹر کے ماہرین پیدا ہوں۔ یہ دینی تخصص کے ادارے ہیں اور انہی رجال کار کی تیاری کے ادارے رہیں گے۔ لیکن ہم سب لوگ فرداً فرداً یہ بات محسوس کرتے

ہیں کہ دینی مدارس کے متخصصین، علما، فقہا، محدثین، مفسرین کو عصر حاضر میں اپنے تخصص کو عام لوگوں تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ اس تخصص کے مطابق ملکی نظام کو ڈھالنے اور اس کے مطابق ملک کے مختلف اداروں کی تشکیل نو کے لیے بعض جزوی، معنوی تبدیلیوں یا جامع علوم اور مہارتوں کی ضرورت ہے جس کے بغیر دور جدید میں دینی تعلیم کے تقاضوں پر کماحقہ عمل درآمد نہیں کیا جاسکتا۔

اگر دینی قیادت پر فائز حضرات کا خدانخواستہ تصور سیکولر ہی ہے کہ مذہب، اہل مذہب کے لیے ہے اور دنیا، اہل دنیا کے لیے ہے، قیصر کو قیصر کی چیز دے دو اور پادری کو پادری کا علاقہ دے دو تو پھر بے شک دین ودنیا کی تفریق کے اس ابلیسانہ تصور پر کار بند رہیے۔ اگر نعوذ باللہ، ان اداروں کے قیام سے یہی مقصد پیش نظر ہے، تو پھر یاد رکھیے کہ لادینیت کا یہ نظام اسی طرح چلتا رہے گا۔

یہاں یہ امر واضح کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ انگریزوں کے دور استعمار میں اس دوئی کو برداشت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ انگریز یہ بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں تھا کہ ملک وملت کا نظام، معاشیات یا بنکاری کا نظام دینی تعلیم سے جزوی طور پر بھی متاثر ہوسکتا ہے، لیکن پاکستان جس کی تاسیس ہی اس مقصد کے لیے ہوئی ہے کہ یہاں اسلام کے احکام پر مبنی ادارے قائم کیے جائیں گے اور ملک وملت کا نظام شریعت کی بنیاد پر استوار ہوگا، یہاں حالات کا وہ جبر نہیں ہے جس کے تحت ۱۸۵۷ء کے بعد کے سالوں میں اکابر اسلام نے دوئی اور ثنویت پر مبنی اس صورت حال کو برداشت کیا تھا۔ آج اگر آزاد اسلامی جمہوریہ پاکستان میں دینی تعلیم کا مقصد پاکستان کی تمام دینی ضرورتوں کی تکمیل نہیں ہے تو میں اپنے دل کے زخموں سے مجبور ہوکر سخت الفاظ کہنے پر اپنے کو مجبور پاتا ہوں۔ وہ یہ کہ پھر سوچا جانا چاہیے کہ کیا ایسی دینی تعلیم کی ضرورت بھی ہے کہ نہیں؟ اگر پاکستان کی موجودہ دینی تعلیم پاکستان کو، پاکستان کے مسلمانوں کو اور پاکستان کے اداروں کو اسلام کے مطابق نہیں ڈھالنا چاہتی اور ڈھالنے کے لیے رجال کار تیار کرنے کے لیے آمادہ نہیں تو پھر اس دینی تعلیم کی ضرورت پر ازسرنو غور کرلینا چاہیے کہ اس کی ضرورت بھی ہے کہ نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ سب حضرات اس سے اتفاق کریں گے کہ ہمارے ہاں دینی تعلیم کے متخصصین، محدثین، مفسرین اور فقہا پیدا کرنے کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ پاکستان کو ایک اسلامی

ریاست بنایا جائے، پاکستان کے مسلمانوں کو ایک صحیح مسلمان بننے میں مدد دی جائے، امت مسلمہ کی تشکیل صرف ان خطوط پر ہو جو قرآن وسنت میں بیان ہوئے ہیں۔ اگر یہ مقصد ضروری ہے تو بجا طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بنکاری کے نظام کو اسلامی خطوط پر ڈھالنے کے لیے ہمیں ایسے ماہرین کی ضرورت نہیں ہے جو صحیح معنوں میں فقہی تخصص اور تعمق (depth) رکھتے ہوں اور جدید بنکاری کے نظام سے بھی ضرورت کی حد تک واقف ہوں؟ میں یہ نہیں کہتا اور کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ خدانخواستہ فقہ، حدیث کی تعلیم ختم کر کے ان کو بینکار اور اکانومسٹ بنا دیا جائے۔ بینکار اور اکانومسٹ الگ رہیں گے، البتہ ان کو بھی شریعت اور اسلام کا بنیادی فہم دینے کی ضرورت ہے جیسا کہ ماضی میں اسلام کے متخصصین نے کیا۔

سچی بات یہ ہے کہ ''دور جدید'' ایک پیچیدہ دور ہے۔ اس دور کے ارادے، تصورات اور اس دور کے معاملات اتنے پیچیدہ ہیں کہ اس کے لیے بڑی خصوصی مہارتیں درکار ہیں۔ اس وقت پاکستان میں مثال کے طور پر ''بلاسود بینکاری'' کا ایک بڑا چیلنج درپیش ہے، لیکن پاکستان میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو شریعت کا بھی عمیق علم رکھتے ہوں اور جدید بینکاری کے تقاضوں کو مکمل طور پر سمجھتے ہوں اس طرح کہ دنیا بھر کی سطح پر بینک کاروں سے مقابلہ کر سکیں؟

دنیا بھر کے بینک، مسلمان بینکاروں کو چلنے نہیں دیتے۔ B.C.C.I کو چلانے والے کوئی مذہبی لوگ نہیں تھے اور نہ وہ مذہبی انداز میں چلا رہے تھے، لیکن چونکہ بینک مسلمانوں کا تھا، دولت زیادہ تر مسلمانوں کی تھی اور اس کا فائدہ زیادہ تر کچھ مسلمانوں کو ہو رہا تھا، اس لیے اس کے ساتھ جو حشر ہوا، وہ سب کے سامنے ہے۔ اس طرح کی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ جہاں اس چیلنج کا مقابلہ کرنا خاصی فنی مہارت کا تقاضا کرتا ہے۔ جہاں وہ فنی مہارتیں ہیں، وہاں بدقسمتی سے شریعت کا علم نہیں ہے اور جہاں شریعت کا علم ہے، وہاں جدید فنی مہارتیں نہیں ہیں۔ تو کیا یہ ہم پر فرض کفایہ نہیں ہے کہ ہم شریعت کے ایسے متعمق ماہرین پیدا کریں جو دینی ماحول، دینی تربیت اور دینی ذوق ومزاج کے ساتھ ساتھ دور جدید کے معیار کی فنی مہارت رکھتے ہوں؟

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک قول مجھے بہت یاد آتا ہے کہ ایک دفعہ کسی ذمہ داری پر

تعین کے لیے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر رہے تھے۔ مجلس میں موجود بعض لوگوں نے ایک خاص شخص کا نام لیا کہ ''جی وہ بہت نیک آدمی ہیں، بڑے بزرگ اور تہجد گزار ہیں'' اور آخر میں فرمایا کہ ''وہ اتنے نیک ہیں''"کانہ لایعرف الشر"، ''گویا وہ شر کو جانتے ہی نہیں''۔ اس پر حضرت عمر فاروق نے فرمایا کہ ''ایسا آدمی نہیں چاہیے جو شر کو نہیں جانتا، اس لیے کہ "اذا یوشك ان یقع فیہ" کہ جو شر کو نہیں جانتا، وہ شر میں جلدی مبتلا ہو جائے گا، وہ تو شر کا شکار ہو جائے گا۔ اس لیے ایسا آدمی درکار ہے جو خیر کو بھی جانتا ہو اور شر کو بھی جانتا ہو۔

امام احمد بن حنبلؒ سے زیادہ متبع سنت اور شریعت کا مزاج شناس ان کے دور میں کوئی نہیں گزرا۔ ان سے کسی نے مشورہ کیا کہ فلاں جگہ جہاد کا معاملہ درپیش ہے، مختلف علاقوں سے فوجیں اور رضا کاروں اور مجاہدین کے دستے جا رہے ہیں۔ ایک فوجی کمانڈر کی سربراہی میں ایک بڑا دستہ تیار ہو رہا ہے۔ وہ کمانڈر بڑا متقی اور پرہیز گار ہے، بڑا نمازی اور تہجد گزار ہے، لیکن سیاسی وعسکری معاملات میں وہ خاص ماہر نہیں ہے، البتہ ایک دوسرا شخص ہے جو زیادہ دین دار اور نیک تو نہیں ہے لیکن اس کی عسکری مہارت بڑی مسلم ہے۔ تو فرمایئے ہمیں کس کے ساتھ جانا چاہیے؟ (ہم تو اللہ کی رضا کے لیے جا رہے ہیں)۔ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا:

> ''جو شخص نیک و متقی ہے، لیکن عسکری مہارت میں کم درجہ رکھتا ہے، اس کی نیکی و تقویٰ کا فائدہ اس کی ذات کو ہوگا اور اس کی عسکری عدم مہارت کا نقصان پوری قوم اور اسلامی فوج کو ہوگا۔ جو شخص زیادہ نیک نہیں ہے، اس کی نیکی کی کمی کا جو نقصان ہے تو وہ صرف اس کی ذات کو ہوگا، لیکن اس کی عسکری ''مہارت'' کا فائدہ پوری مسلمان امہ کو ہوگا۔''

اس لیے ان فنی مہارتوں کی ہر دور کے لحاظ سے ضرورت اور اہمیت بدلتی رہتی ہے۔ ایک زمانہ تھا منجنیق کا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ کو یمن بھیجا تاکہ منجنیق بنانا سیکھ کر آئیں اور وہاں سے لے کر بھی آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کے معرکے میں وہ استعمال بھی فرمائیں۔ منجنیق کو آج کے ''ٹینک'' کا پیش رو (pioneer) کہہ سکتے ہیں۔ وہ ایک بہت بڑی گاڑی ہوا کرتی تھی جو قلعوں کی دیوار وغیرہ توڑنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اس پر چٹان یا بڑے پتھر رکھ دیے

جاتے اور لکڑی کی بنی ہوئی پتوار قسم کی ایک چیز کھینچی جاتی تھی۔ اس پر ایک شدید ضرب کے نتیجے میں ایک اسپرنگ کے طاقت ور push کے ساتھ پتھر نکلتا اور قلعے کی دیوار پر لگتا تو قلعے کی دیوار ٹوٹ جاتی تھی۔ صحابہ کرامؓ نے یمن کے عیسائیوں سے اس کی تعلیم سیکھی اور پھر آ کر اس مہارت کو طائف کی فتح میں استعمال فرمایا۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اور ابن تیمیہؒ نے السیاسۃ الشرعیۃ میں لکھا ہے کہ ایسی تمام مہارتوں وتخصصات کا حاصل کرنا مسلمانوں کے ذمے فرض کفایہ ہے جن کے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان، غیر مسلموں کے محتاج بن کر رہیں۔ مسلمانوں کو غیر مسلموں کی محتاجی سے بچانا اور ان کو اپنے تمام دینی ودنیوی معاملات میں خودکفیل بنانا یہ مسلمانوں کے ذمہ فرض کفایہ ہے۔

اس دور میں فقہ کی تعلیم سے دنیا کے بھی بڑے فائدے ملتے تھے۔ آدمی فقہ پڑھ کر قاضی بن جاتا تھا، مفتی بن جاتا، وزیر اور گورنر بن جاتا تھا۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے: طلبہ فقہ تو بہت پڑھتے ہیں، لیکن طب، ہندسہ کوئی نہیں پڑھتا۔ (اس زمانے میں الٹ تھا۔ آج لوگ میڈیکل اور انجینئرنگ تو پڑھتے ہیں، لیکن فقہ نہیں پڑھتے) امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں شکایت کی ہے اور اس بات کی تاکید کی ہے کہ لوگوں کو ان علوم (میڈیکل اور انجینئرنگ) کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے، اس لیے کہ یہ فرض کفایہ ہے اور ان کے نہ ہونے کی وجہ مسلمان، غیر مسلم طبیبوں، مہندسوں اور انجینئروں کا محتاج رہے گا اور اس احتیاج کو ختم کرنا مسلمانوں کے ذمے فرض کفایہ ہے۔

آج قیادت جس طبقے کے ہاتھ میں ہے، وہ طبقہ ایک خاص انداز کا تربیت یافتہ ہے۔ ۳۵-۱۸۳۴ء یعنی لارڈ میکالے کے زمانے سے آج تک چار پانچ نسلیں اس طبقے کے زیر اثر ایک خاص ماحول میں پرورش پا چکی ہیں۔ اس کے اپنے تعلیمی ادارے ہیں جن کا اپنا مخصوص ماحول ہے۔ وہ طبقہ اپنے قرب وجوار میں سڑک بھی نہیں بننے دیتا، پرائمری اسکول بھی نہیں بننے دیتا، لیکن اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے اس نے خصوصی ادارے بنا رکھے ہیں۔ ان کے آپس کے سیاسی اور ہر طرح کے دوسرے اختلافات تو موجود ہیں، مگر اس کے باوجود جس تعلیمی ادارے میں ان کے بچے پڑھتے ہیں، وہاں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ وہ سب مل جل کر انہیں مضبوط، موثر اور ترقی یافتہ بنانے

کے لیے پوری دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ گویا یہ مفادات کی جنگ ہے۔ اس کے بعد جب یہاں ان کی تعلیم مکمل ہو جاتی ہے تو اس کے بعد وہ اپنے بچوں کو انگلستان اور امریکہ کے تعلیمی اداروں میں بھیج دیتے ہیں۔ وہاں سے اعلیٰ تربیت پا کے وہ یہاں آتے اور ہم پر حکومت کرتے ہیں۔ یہ پچھلے ڈیڑھ دو سو برس سے ہو رہا ہے۔

اب ایک صورت تو یہ ہے کہ جیسے یہ سلسلہ چل رہا ہے، اس کو آپ چلنے دیں۔ وہ طبقہ ہم پر حکومت کرتا ہے اور اسلامی تعلیم اور اسلامی ماحول کا یہ جزیرہ سمٹتا جائے اور سمٹتے سمٹتے نہ معلوم کہاں تک پہنچ جائے اور کتنا رہ جائے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ اس طبقے کے اسلحے سے اس کا مقابلہ کریں اور جس اسلحے سے کام لے کر وہ طبقہ اسلام کا راستہ دانستہ یا نادانستہ طور پر روک رہا ہے (اس طبقے میں اکثر لوگ نادانستہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں) اس طبقے کے ہتھیار لے کر اسلام کا دفاع کریں۔

آج سے تقریباً بارہ تیرہ سو سال پہلے جب یونانیوں کے علوم وفنون کی کتب کا ترجمہ عربی زبان میں شروع ہوا تو قریب قریب وہی صورت حال پیش آئی جس سے ہم آج دوچار ہیں۔ یونانی منطق، مسلمان علما وفضلا کی بنائی ہوئی نہیں تھی۔ ارسطو [م ۳۲۲ ق م] اور افلاطون [م: ۳۴۷ ق م] کوئی متقی لوگ نہیں تھے بلکہ بت پرست اور مشرکین تھے، لیکن جب ان کا تیار کردہ علم منطق مسلمانوں میں رائج اور مقبول ہونا شروع ہوا تو بعض اہل علم کی رائے تھی کہ اس کو نہیں سیکھنا چاہیے۔ اس زمانے کے فتاویٰ موجود ہیں کہ منطق اور یونانی علوم کا سیکھنا ناجائز اور حرام ہے، جیسے آج ہماری بعض محترم شخصیتوں کی رائے انگریزی زبان اور جدید مضامین کے بارے میں ہے۔ لیکن ایک دوسری انتہائی اہم اور حکیمانہ رائے یہ بھی تھی اور تاریخ نے ثابت کیا کہ یہ رائے زیادہ صائب اور درست تھی کہ یونانی علوم وفنون سیکھ کر ہی ہم اس کا جائزہ لے سکیں گے کہ ان میں کون سی چیز غلط ہے اور کیا چیز ہمارے لیے اسلامی نقطہ نظر سے قابل قبول ہے؟ جو غلط ہے، دلائل سے اس کی تردید کر کے نظر انداز کر دیں اور جو لوگ اس کا شکار ہو رہے ہیں، ان کو بھی اس غلط عنصر کے منفی اثرات سے محفوظ کر لیں، لیکن ان علوم وفنون میں جتنا اور جو حصہ ہمارے نقطہ نظر سے مفید ہے، اس سے استفادہ کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہیے۔

وہ مسلمانوں کے لیے گم شدہ میراث کی حیثیت رکھتا ہے:

"خذ ما صفا ودع ما كدر"

"جو صاف اور اچھا ہے، اسے لے لو اور جو گندہ، غلط اور مکدر ہے، اس کو نظر انداز اور مسترد کر دو۔"

چنانچہ اس دوسرے گروہ کے اہل علم نے جو رائے اختیار کی تھی، تاریخ نے ثابت کیا کہ یہی رائے صائب تھی۔ مسلمانوں کے اجتماعی مزاج نے اس رائے کو اختیار کیا، یہاں تک کہ یہ کیفیت ہوئی کہ پھر وہ منطق اور فلسفہ جس سے شروع میں مسلمانوں کو خطرہ تھا کہ شاید مسلمانوں کے دین اور ایمان اس سے متاثر ہوں، اسی فلسفے اور منطق سے مسلمانوں نے اسلام کی خدمت کا کام لیا۔

امام غزالیؒ کی کتاب "المستصفی" دیکھ لیجیے جو "اصول فقہ" کی کتاب ہے، لیکن ساری کی ساری منطقی اصولوں پر مبنی ہے۔ امام صاحب نے اصول فقہ کے احکام و مباحث کو خالص منطقی اصولوں پر مرتب کیا ہے۔ اگر کوئی منطق کی اصطلاحات نہ جانتا ہو، وہ یہ کتاب نہیں سمجھ سکتا۔ امام رازیؒ کی تفسیر کبیر تو ساری کی ساری منطق و فلسفہ کی ہی اصطلاحات سے بھری ہوئی ہے۔ اصول فقہ کی ایک اور بہترین کتاب جو اپنے تعمق و گہرائی میں کوئی ثانی نہیں رکھتی، وہ امام شاطبیؒ کی کتاب "الموافقات" ہے۔ "الموافقات فی اصول الشریعۃ" چار جلدوں میں ہے۔ جتنے علوم و فنون امام شاطبیؒ کے زمانے میں موجود تھے اور اس وقت تک انسانیت نے جو کچھ بھی حاصل کیا تھا، اس سب کو انہوں نے شریعت کے احکام کی ابدیت اور معقولیت کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا۔ اس سے اونچی کتاب آج تک قانون کی تاریخ اور روایت میں نہیں لکھی گئی۔ اگر آدمی منطق نہ جانتا ہو تو وہ اس کتاب سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی "حجۃ اللہ البالغۃ" برصغیر کی بہترین مستند تصنیف ہے، برصغیر میں اس سے بہتر کتاب اسلام کے فلسفے پر لکھی ہی نہیں گئی، وہ بھی ساری کی ساری یونانی علوم و فلسفہ کی اصطلاحات سے بھرپور ہے۔

اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ ان مثالوں سے اندازہ ہوگا کہ وہ چیز جو پہلے "خطرہ" سمجھی گئی، وہ بعد میں "خادم" بن گئی۔ اسلام خادم بننے کے لیے نہیں آیا، مخدوم بننے کے لیے آیا ہے۔ جو چیز "مخدوم" بن کر اسلام کے کیمپ میں داخل ہوتی ہے، بالآخر اسے "خادم" بننا ہی پڑتا ہے۔

تا تاریوں کی مثال لے لیں۔ تا تاری، اسلام میں فاتح بن کر داخل ہوئے لیکن بالآخر اسلام کے خادم بن گئے۔ وہ تا تاری جنھوں نے بغداد کو تباہ کیا تھا، جنہوں نے دریاؤں کے پانی کتابوں (کی سیاہی) سے سیاہ کر دیے تھے، انہوں نے ہی عالم اسلام کی سرحدوں کا سات سو سال تک دفاع کیا۔

آج انگریزی زبان اور جدید مغربی علوم وفنون کے بارے میں ہم سے کچھ تاخیر ہوگئی ہے۔ اس تاخیر کی وجہ سے کچھ انگریزی خواں مسلمانوں میں مخدوم بنا چاہتے ہیں یا بنے ہوئے ہیں تو یہ ایک عارضی اور وقتی چیز ہے۔ ان شاءاللہ انگریزی زبان اور جدید کمپیوٹر، یہ سائنس اور یہ ٹیکنالوجی سب کی سب اسلام کی خادم بنیں گی، مگر اس کے لیے عزم وارادے کی ضرورت ہے۔

اگر امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ کو اس کی ضرورت تھی کہ وہ اپنے دور کے معاشی طور طریقے سمجھیں اور اس کو دینی تقاضا سمجھ کر روزانہ بازار میں چند گھنٹے گزاریں اور یہ دیکھیں کہ کاروبار کیسے ہوتا ہے تو کیا عہد حاضر کے متخصصین اور فقہا اور امام محمدؒ کے متبعین اور تلامذہ کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ آج کل کے بازاروں کے اس کردار اور کاروباری امور سے واقف ہوں کہ ان بازاروں میں کیا ہو رہا ہے؟ اس کے لیے معاشیات کی تعلیم اور جدید بینکاری کے اصولوں کی تعلیم ضروری ہے۔ یہ سب فنون بدقسمتی سے انگریزی میں ہیں، اس لیے انگریزی سیکھنا ضروری ہے۔ اگر امام غزالیؒ اپنے دور میں منطق کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

"من لم یعرف المنطق فلاثقة له فی العلوم اصلا"

''جس آدمی نے منطق نہیں سیکھی، اس کا علم میں کوئی مقام اور وزن نہیں۔''

اس لیے کہ اس دور میں اہمیت منطق کی تھی۔ اسی طرح آج کے دور میں اگر کچھ دوسرے علوم وفنون، انگریزی زبان، معاشیات، ریاضی، کمپیوٹر کو اہمیت حاصل ہوگئی ہے تو علمائے کرام کو آگے بڑھ کر امام غزالیؒ کی طرح اس کا ادراک کرنا چاہیے۔

جہاں تک حکومت پاکستان کا تعلق ہے تو دینی مدارس کے بارے میں اس وقت تک ہم نے جو چیز طے کی ہے، وہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے اندرونی معاملات میں مداخلت کیے بغیر ان کی انتظامی و مالی خودمختاری کو یقینی بنایا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ خود علمائے کرام کے تعاون سے ایسے تعلیمی کورسز

شروع کرائے جائیں کہ جس میں تخصص کے معیارات کو بہتر بناتے ہوئے اس میں مزید گہرائی پیدا کی جائے اور کوشش کی جائے کہ خود علمائے کرام بعض بنیادی علوم وفنون تک رسائی ضرور حاصل کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ علمائے کرام بقدرِ ضرورت انگریزی جانتے ہوں اور کمپیوٹر سے کچھ نہ کچھ واقف ہوں۔ علمائے کرام بقدرِ ضرورت جدید معاشیات سے، بینکاری کے نظام سے، بین الاقوامی لین دین اور تجارت سے واقف ہوں۔ بلاسود بینکاری کا نظام قائم کرنے کے لیے یہ سب چیزیں جاننا ضروری ہے۔ اس کے بغیر کم از کم پاکستان کے حالات میں ایک قدم بھی پیش رفت نہیں ہوسکتی۔

ہمارے علمائے کرام بعض اوقات افغانستان میں طالبان کی حکومت کی مثال دیتے ہیں کہ ''وہ انگریزی اور جدید علوم میں تخصص کے بغیر کامیاب حکومت چلا رہے ہیں۔'' طالبان کے جذبے کا اعتراف اور ان کے قائدین کا احترام کرنے میں، میں دوسروں سے پیچھے نہیں ہوں، لیکن ہر ملک کے حالات میں اور دوسرے ملک کے حالات میں فرق ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس طرح دنیا سے کٹ کر زیادہ دیر تک رہنا ممکن نہیں ہے۔ جس کمی کو آج اعزاز قرار دیا جارہا ہے، آنے والے کل کو اس کمی کو دور کرنے کا شدت سے احساس ہوگا۔ کم از کم پاکستان کے موجودہ حالات میں انگریزی زبان سے بقدرِ ضرورت واقفیت کے بغیر اور معاشیات، سیاسیات، اقتصادیات، ریاضی، جنرل سائنس کی تھوڑی سی واقفیت کی عدم موجودگی میں یہاں کے نظام کو اسلامی خطوط پر استوار کرنا بڑا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ غور فرمائیں تو جلد یا بدیر آپ اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

میں یہاں ان چند رجال کار اور خادمان دین کی فرداً فرداً مثالیں نہیں دوں گا جن کے کام سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ دینی تخصص اور دینی علوم میں مہارت کی جامعیت کتنی ضروری اور اہم چیز ہے۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں ایسے اہل علم جو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیوی تعلیم بھی رکھتے ہیں، ان کی بات کا غیر معمولی اثر ہوتا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ ملکی نظام ہی نہیں بلکہ اس نظام ریاست کو چلانے والوں کی ذہنیت پر ان انتہائی محترم شخصیتوں کے، جو خالص دینی علوم میں تخصص رکھتے ہیں اور جو دورِ جدید کے محاورے میں یا دورِ جدید کے اسلوب میں اپنی بات کو بیان نہیں فرما سکتے، ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ اس صورت حال پر یہ کہنا کہ ''ہمیں کوئی ضرورت نہیں سمجھانے کی، جس کو سمجھنا ہو خود ہمارے

پاس آئے اور ہمارا محاورہ اور اسلوب سیکھ کر آئے" میری ناچیز رائے میں ایک نہایت خطرناک اور انتہائی غلط رویہ ہے۔ اسلام کسی فرد کسی یا مخصوص طبقے کی اجارہ داری میں مقید نہیں ہے۔ یہ تمام نسلوں، زمانوں اور قوموں کے لیے ہے، اس لیے اس کے پھیلاؤ کی راہ میں جو بھی جس انداز سے بھی رکاوٹ ہوگا یا رکاوٹ بننے کی کوشش کرے گا، اسے اپنا انجام، یوم آخرت کو پیش نظر رکھ کر سوچ لینا چاہیے۔

میں خود دینی مدارس کی پیداوار ہوں اور دینی مدارس سے ربط وضبط کا چالیس سالہ تجربہ رکھتا ہوں۔ الحمدللہ میرے خاندان میں کم از کم ایک درجن بزرگ ایسے رہے ہوں گے جنہوں نے دینی مدارس قائم فرمائے یا دینی مدارس میں اعلیٰ ترین سطح پر انہوں نے تعلیم دی۔ اس لیے خوش قسمتی سے ان مدارس سے میں جتنا واقف ہوں، وہ آپ حضرات گرامی کی واقفیت سے کچھ کم واقفیت نہیں ہے۔ یہی تعلق، واسطہ اور پیش آمدہ چیلنج کی شدت مجھے غیر روایتی اسلوب سخن اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

میرا تاثر یہ ہے کہ دینی مدارس کے موجودہ نظام اور موجودہ نصاب میں اوقات ہی کا ضیاع نہیں ہو رہا ہے، بلکہ وسائل کا بھی ضیاع ہو رہا ہے۔ ہم آٹھ دس سال ایک طالب علم کو دینی مدارس میں پڑھاتے ہیں۔ ہم اس کو سلم اور سلم کی شروح تک منطق پڑھا رہے ہیں۔ ملا جلال، ملا مبین اور جتنی شروح منطق پر لکھی گئیں، وہ اکثر طلبہ پڑھتے ہیں، خاص طور پر صوبہ سرحد میں۔ اسی طرح منطق اور فلسفے سے متعلق بہت سے ایسے مضامین ہم اس کو پڑھا رہے ہیں جو شاید کسی زمانے میں ہمارے ریاستی، اجتماعی اور سماجی نظام میں اہمیت رکھتے ہوں لیکن آج اگر کسی دینی درس گاہ سے ایک سال میں سو طالب علم فارغ ہو رہے ہوں تو ان سو میں نوے طلبہ وہ ہیں جو کسی مسجد کی امامت اختیار کرتے ہیں یا موذن بنتے ہیں۔

خود ایک بزرگ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ: "مدارس کا مقصد صرف مسیتے پیدا کرنا ہے۔" میں ادب سے پوچھتا ہوں کہ کیا کسی مسیتے کو مسجد کی خدمت، امامت یا موذنی میں کبھی "سلم" کے مباحث کام آتے ہیں؟ ان کو پوری زندگی میں سلم اور سلم کے مسائل، معاملات پر غور کرنے کی نہ ضرورت پڑتی ہے اور نہ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک آدمی بھی سوال کرتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس جو سوالات روزانہ ایک امام مسجد سے کیے جاتے ہیں، ان سوالات کا جواب اس کے پاس نہیں ہوتا۔ اس سے پوچھا جاتا ہے کہ جب سود ختم ہو جائے گا تو پھر نظام کیسے چلے گا، کیونکہ پاکستان کی سپریم کورٹ نے بھی فیصلہ

دے دیا ہے؟ ڈیفنس سیونگ کا کیا ہوگا؟ این آئی ٹی یونٹ میں جو فلاں تبدیلی لائی گئی ہے، اس کے نتیجے میں یہ جائز ہیں کہ ناجائز؟ جسمانی اعضا کی تبدیلی اور پیوندکاری حرام ہے یا حلال؟

روزمرہ کے ان مسائل کے بارے میں دینی مدرسے کے طالب علم کی کوئی تیاری نہیں ہوتی اور جو مسائل کبھی پیش نہیں آنے والے، ان پر ہم اس کے آٹھ سال ضائع کروادیتے ہیں۔ بزرگان محترم! میں ''ضائع'' کا لفظ بڑی ذمہ داری سے استعمال کر رہا ہوں۔ جو اساتذہ ملا جلال اور ملا مبین کے از کار رفتہ اور فضول مباحث کی تدریس میں مصروف ہیں یا تحریر سنبٹ اور سوال کابلی اور سوال باسولی کے اعتراضات اور ان کے جوابات طلبہ کو رٹواتے ہیں، وہ سوچیں کہ کس مسجد اور کس خطبے میں ان امور کی ضرورت پیش آتی ہے؟ یہاں کے اساتذہ اس کام کی جو تنخواہیں وصول کر رہے ہیں اور وہ تنخواہیں عامۃ الناس کے چندے سے آرہی ہیں اور جو اللہ کی طرف سے ایک امانت ہے کہ یہ دین کی خدمت کے لیے ہے، آپ خود دیکھ لیجیے کہ کیا دین کی خدمت یہ ہے کہ طالب علم کے پانچ سال منطق کے ان از کار رفتہ اور غیر متعلقہ مسائل کو یاد کرنے کے لیے صرف کروائے جائیں؟ میری حقیر رائے میں ایسی تعلیم اسلام کا مقصد نہیں ہے۔ لیکن اسے یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں ان علوم کی افادیت کا قائل نہیں ہوں۔ میں ان علوم کی افادیت کا پورے طور پر قائل ہوں، لیکن ان حضرات کے لیے جن کو محقق بننا ہے، جن کو مصنف بننا ہے، جن کو اعلیٰ سطح کا مدرس بننا ہے۔

میری ناچیز رائے میں دینی مدارس کے نظام میں اس طرح تبدیلی کی ضرورت ہے کہ ابتدائی تین یا چار سال ضروری دینی علوم، عربی زبان، صرف، نحو اور بقدر ضرورت منطق پڑھائی جائے۔ منطق کی ایک یا دو کتابیں جن سے منطق کا اسلوب طالب علم کے سامنے آجائے اور وہ قدیم کتابیں سمجھنے کے قابل ہو جائے۔ اسلامی نظام پر بحیثیت مجموعی نظر، دورِ جدید کے بعض مذاہب اور نظریات وغیرہ اس کو پڑھائیں۔ چار سال کے بعد ہم اس کو گریجویٹ سطح پر لے آئیں۔ اس کے بعد پھر جو طلبہ محقق بننا چاہتے ہوں، اسلامی علوم وفنون میں ایک تعمق حاصل کرنا چاہتے ہوں، ان کو منطق اور فلسفہ اور اصول فقہ کی اعلیٰ ترین کتابیں اور جو مزید ان کو پڑھانا چاہیں، ان کو پڑھائیں۔ ایسے طالب علم پر وسائل خرچ کرنا پڑیں گے، اس پر صلاحیت بھی صرف کرنا ہوگی اور وقت بھی صرف کرنا ہوگا۔

اس وقت ہوتا یہ ہے کہ ایک طالب علم جسے کسی چیز کی بالکل کچھ سمجھ نہیں آتی، وہ اور ذہین ترین طالب علم دونوں ایک سطح پر اٹکے رہتے ہیں۔ ذہین طالب علم اس کے ساتھ بندھا رہتا ہے، وہ آگے نہیں بڑھ پاتا۔ اور جو کند ذہن طالب علم ہوتا ہے، وہ کسی طرح سے آگے نہیں بڑھتا۔ یوں دونوں کی صلاحیت اور وقت ضائع ہوتا ہے۔ اگر یہ طے کر لیا جائے کہ جو طالب علم معمولی صلاحیت رکھتا ہے، اس کو اچھی تجوید اور قرآن پاک سکھا دیں، حفظ کروا دیں، کچھ بنیادی نوعیت کے مسائل یاد کروا دیں اور اس کو صرف موذنی اور تجوید و تدریس قرآن کے لیے تیار کر لیں۔ جو طلبہ ذرا ذہین ہوں، ان کو مسجد کی امامت اور خطابت کے لیے تیار کریں۔ ایک امام مسجد کو جن فقہی مسائل سے سابقہ پیش آئے گا، ایک مسجد کے خطیب کو تقریر کرنے کے لیے جو مسائل جاننے چاہییں، وہ چار پانچ سال میں پڑھا دیں۔ اس کے بعد اس سے کہیں کہ اب جا کر امامت کرو۔ اتنی دینی تعلیم کے بعد یہ لوگ اس قابل ہو جائیں گے کہ جا کر مسجدیں سنبھالیں۔ مطلب یہ کہ ان لوگوں کو مسلمانوں کی دینی زندگی کے لیے واقعی تیار کیا گیا ہو۔ اس کے بعد جو لوگ دینی مدارس میں مدرس بننا چاہیں، مختلف علوم وفنون میں محقق بننا چاہیں، ان سے یہ طے کر لیں کہ وہ کن علوم وفنون میں، کن میدانوں میں استاذ بننا چاہتے ہیں۔

بہت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ دینی مدارس میں تخصص کا تصور خال خال ہے۔ ایک استاد جو میرے ساتھ ہی ایک مدرسے میں پڑھ کر فارغ ہوئے تھے، مدرسہ کی تعلیم میں ان کی پوزیشن اول آئی تھی اور میری دوسری۔ مدرسہ کے مہتمم صاحب نے انہیں فارغ ہوتے ہی از راہ کرم مدرس مقرر کر لیا تھا۔ وہ دن میں سولہ سبق پڑھایا کرتے تھے۔ ۱۹۶۵ء میں ان کو ۳۵ روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ تنخواہ تو ان کا اور مہتمم صاحب کا ذاتی معاملہ تھا، لیکن کوئی استاد کتنا بھی اچھا فاضل کیوں نہ ہو، وہ جب دن میں سولہ سبق پڑھائے گا تو کسی ایک کتاب یا کسی ایک کورس کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکے گا۔ اس میں تخصص پیدا نہیں ہو سکتا۔

آج ہمیں دینی تعلیم کی ان تینوں سطحوں اور ضرورتوں کو سامنے رکھ کر نئے نصابات کی تدوین کی ضرورت ہے۔ آج دینی علوم کے اعلیٰ محققین کی تیاری کے لیے ہمیں تخصص (specialization) کی ضرورت ہے۔ اگر ہم یہ طے کریں کہ جن کو مدرس بننا ہے، ان کا تخصص اگر علوم نقلیہ میں ہے تو وہ

علوم نقلیہ: تفسیر، حدیث، فقہ، ادب وغیرہ میں تخصص کرلیں۔ علم حدیث، علم تفسیر وغیرہ کے ساتھ ساتھ بقیہ علوم بھی ان کو پڑھائیں اور ان میں بھی ضروری مہارت پیدا کریں۔ اس کے لیے موجودہ سند عالیہ اور شہادۃ عالمیہ کے لیے تین چار میدان متعین کیے جاسکتے ہیں۔ جو طلبہ مناظرہ یا تبلیغ اسلام میں دوسرے مذاہب پر تحقیق کا میدان منتخب کرنا چاہتے ہیں، ان کو تقابل ادیان اور متعلقہ چیزیں پڑھا دیں۔ جو طلبہ دورِ جدید میں اسلام کے معاملات میں تخصص حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کو اقتصادیات، معاشیات زیادہ بہتر انداز میں پڑھادیں۔ مسلمان فقہا نے علم الاموال کے میدان میں، کتاب الاموال اور کتاب الخراج میں اور اس طرح کی کتابوں میں جو لکھا ہے، اس سے طالب علم کو واقفیت ہو جائے اور معاملات کی فقہ گہرائی کے ساتھ اس کو پڑھادی جائے۔ اس طرح سے اگر ہم چند متخصصین پیدا کرلیں تو کم وسائل سے زیادہ بہتر انداز میں افراد کار تیار کرسکیں گے۔

آپ حضرات کو مجھ سے بہتر علم ہے کہ یورپ، امریکہ، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ، کینیڈا اور نیوزی لینڈ وغیرہ میں ایسے ہزاروں اہل علم کی ضرورت ہے جو وہاں کے مسلمانوں کی دینی راہنمائی کرسکیں، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جو لوگ صحیح ٹھوس علم جانتے ہیں، وہ انگریزی زبان نہیں جانتے اور دورِ جدید کے محاورے سے واقف نہیں ہیں۔ وہ وہاں کے لوگوں کی زبان میں بات نہیں کر سکتے۔ جو لوگ وہاں کے لوگوں کی زبان اور محاورے میں بات کر سکتے ہیں، وہ یا تو دین کو بالکل نہیں جانتے یا ان کا علم دین بھروسے کے قابل نہیں ہے۔ وہ سرسری انداز سے اردو کی چند کتابیں پڑھ کر، ادھر ادھر سے سنی سنائی باتوں کو جا کر بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ مقامی رواج کیا ہے؟ دین کی صحیح تعلیم کیا ہے؟ نصوص کیا ہیں؟ اجتہادات کیا ہیں؟

علم دین کے ایسے کچے اور خود ساختہ فاضلین نے جو ملغوبہ اپنے ہاں دیکھا یا سنا ہوتا ہے، اس میں دینی اور اسلامی اقدار کے ساتھ ساتھ مشرقی روایات، علاقائی رواجات، مقامی رسوم اور ملکی طور طریقے سب شامل ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دین کے مزاج سے عدم واقفیت کے باعث ان سب چیزوں کو "دین اسلام" سمجھتے اور دین اسلام ہی کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ وہاں جا کر اگر اس سے مختلف کوئی چیز ان کے سامنے آجائے تو وہ جھگڑا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا، میں

نے بھی لندن میں دیکھا ہے کہ یہ پاکستانیوں کی مسجد ہے، یہ بنگالیوں کی مسجد ہے، یہ ترکوں کی مسجد ہے، وہاں پر حنفی، مالکی، شافعی ہر طرح کے اور ہر طرف سے آئے ہوئے مسلمان ہیں۔ وہاں پر ایک فقہی cosmopolitanism (ہر دیسیت) پیدا ہو رہا ہے۔ وہاں امام صاحب پاکستان میں مثلاً گوجر خان یا چکوال سے آئے ہیں۔ ان کو یہ نہیں پتہ کہ شریعت کے نصوص کیا ہیں۔ وہاں پر وہ خاص چکوال کے اپنے مقامی رسم ورواج یا محلے کے رسم ورواج کو دین کے نام پر زبردستی لوگوں پر ٹھونس رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں تفریق پیدا ہو رہی ہے۔ اس لیے مسلمانوں نے فی الحال بہتر یہی سمجھا ہے کہ مسجدیں الگ الگ کر دی جائیں۔ کیا اسلام کا یہی منشا ہے کہ جہاں مسلمان جائیں، وہاں بکھر کر رہ جائیں؟ کیا صحابہ کرامؓ، تابعینؒ جہاں گئے تھے، انہوں نے یہی طے کیا تھا کہ یہ بنو ہاشم کی مسجد ہے، یہ خزرج کی ہے اور یہ اوس کی ہے؟ وہاں تو اس طرح کی کوئی چیز نہیں تھی۔

ہماری اس کمزوری کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم طالب علم کو اس اہم اور بھاری ذمہ داری کے لیے تیار ہی نہیں کر رہے کہ وہ ایسے غیر مسلم اور ناملائم ماحول میں حکمت کے ساتھ دین کی تعلیم کو پیش کر سکے۔ ہمارا طالب علم صرف جامی کی شرحیں، سوال کابلی، سوال باسولی رٹتا رہتا ہے۔ یہ سب کچھ رٹوا کر دس سال بعد آپ اس کو امریکہ بھیج دیتے ہیں کہ جاؤ، امریکہ میں یا کینیڈا کی مسجد میں امامت کرو۔ یہ نہ طالب علم سوچتا ہے اور نہ استاد کہ وہاں پر سوال کابلی یا سوال باسولی کی پچاس برس تک بھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

سوچنے کا مقام ہے کہ جن اساتذہ نے اس طالب علم کو یہ سب کچھ پڑھایا، جن افراد نے عام لوگوں کے حلال پیسے سے جمع ہونے والے پاکیزہ چندے کو اس پر خرچ کیا، کیا یہ دیانت داری کی بات ہے کہ اس پیسہ کو ملا حسن اور ملا جلال کی دقیانوسی بحثوں کے پڑھنے پڑھانے پر خرچ کیا جائے؟ کیا ہم دیانت داری اور اللہ کے دین کے لیے خالص نصیحت کے جذبہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان وسائل کا یہ صحیح استعمال تھا؟ بڑے ادب سے میں اپنی عاجزانہ رائے دوں گا کہ میرے محسنو! میرے بزرگو! اور میرے دینی رہنماؤ! یہ ان وسائل کا صحیح استعمال نہیں تھا۔ خدا کے لیے آپ انہیں وہ چیزیں پڑھائیں جن کی آگے چل کر دین کے ان قائدین کو ضرورت پیش آئے گی اور جس کی امت مسلمہ نہ جانے کب سے منتظر ہے۔

انہی خطوط کی بنیاد پر ہم نے ایک نصاب تیار کیا ہے۔ ہم نے درس نظامی میں کوئی تبدیلی نہیں کی، بلکہ یہ کوشش کی ہے کہ اس کی موجودہ درجہ بندی کو تھوڑا سا مزید بہتر بنا کر تین سے چار تخصصات کا اس میں اضافہ کریں۔ پیش نظر یہ ہے کہ جو موجودہ وفاقوں کا ایک مشترکہ بورڈ حکومت پاکستان قانون کے ذریعے قائم کر دے، اس میں ان وفاقوں کے علما اور نمائندے شامل ہوں۔ ان میں تین چار اساتذہ یونیورسٹیوں کے لے لیے جائیں۔ اس قانون میں اس بورڈ کے تحت ایک اکیڈیمک کونسل کی تجویز بھی ہے۔ اس اکیڈیمک کونسل میں بھی ماہرین تعلیم اور علوم اسلامیہ کے نمائندے ہوں گے۔ اس اکیڈیمک کونسل کے اختیار میں ہوگا کہ وہ نصاب میں جو تبدیلی تجویز کرنا چاہے، تبدیلی کرے، جس طرح یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ جو اختیارات یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ہیں، وہ اختیارات اس بورڈ یا کمیشن کے ہوں گے۔ مدارس حسب سابق داخلی، انتظامی، مالی معاملات میں مکمل خود مختار ہوں گے۔

جو مدارس چاہیں گے، وہ اس کمیشن سے الحاق رکھیں گے اور جو نہیں چاہیں گے، وہ نہیں رکھیں گے۔ یہ مجوزہ بورڈ یا کمیشن جسے ماہرین تعلیم اور علمائے کرام مل جل کر چلائیں گے، وہ میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے کے امتحانات لے گا اور امتحانات کے بعد وہ سندیں جاری کرے گا۔ وہ سندیں اسی طرح سے تسلیم شدہ ہوں گی جیسے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی تسلیم شدہ ہوتی ہیں۔ تقریباً اس طرح کا خاکہ پیش نظر ہے۔ اس کو حتمی شکل دینے کے بعد نیشنل سیکیورٹی کونسل میں پیش کریں گے۔ اب اگر سارے دینی مدارس طے کریں کہ ہم اس سے الحاق نہیں کریں گے تو وہ کمیشن تو ختم نہیں ہوگا لیکن اس کا دائرۂ اثر بہت محدود ہو جائے گا۔ لیکن صورت واقعہ یہ ہے کہ سیکڑوں اصحاب علم اور علمائے مدارس نے اور مدارس کے ذمہ داروں نے ذاتی طور پر مجھے ٹیلی فون، ملاقاتوں اور خطوط کے ذریعے اس بات کی نہ صرف یقین دہانی کرائی ہے بلکہ وقتاً فوقتاً مطالبہ کیا ہے اور یہ دباؤ ڈالا ہے کہ "اس کام کو جلد سے جلد کریں اور ہمیں اس سے وابستہ کریں"۔ اس لیے مدارس میں اگر ہزاروں نہیں تو سینکڑوں ایسے ضرور ہوں گے جو اس بورڈ سے الحاق و وابستگی اختیار کرنا پسند کریں گے۔

اس کے ساتھ میں نے حکومت پاکستان سے یہ بھی کہا ہے اور انہوں نے اس سے اتفاق کیا ہے

کہ وہ پاکستان کے مختلف شہروں میں ایسے اعلیٰ معیار کے ماڈل دارالعلوم بنائیں گے کہ جہاں موجودہ درس نظامی کے بعد تخصص کی اعلیٰ تعلیم ہو، فقہ، حدیث، تفسیر اور جو مختلف اسلامی علوم وفنون ہیں، ان میں تخصص ہو۔ تخصص کا یہ دو سے تین سالہ نصاب ہوگا۔ اس کی حیثیت ایم فل یا ایم اے کے برابر ہوگی۔ اس میں متعلقہ موضوع کے بارے میں جدید علوم بھی پڑھائے جائیں گے۔ وہ پڑھانے کے بعد ہم سمجھتے ہیں کہ زیادہ بہتر اساتذہ تیار ہوں گے۔ اساتذہ جو وہاں سے پڑھ کر نکلیں گے، وہ یونیورسٹیوں کے لیے بھی تیار ہوں گے اور مدارس کے لیے بھی فراہم ہوں گے۔ بیرون ممالک، اندرون ملک جو اس طرح کے معاملات ہیں جہاں شریعت کی راہنمائی درکار ہے، وہ ماہرین اس کام کے لیے دستیاب ہوں گے۔ ظاہر ہے حکومت اپنے اہتمام میں اگر ایسے خود مختار ادارے قائم کرے تو اس پر موجودہ دینی مدارس کے منتظمین کو غالباً کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور نہ اعتراض ہونا چاہیے۔

ان کی حیثیت وہی ہوگی جو ماضی میں جامعہ عباسیہ بہاولپور کی یا اب بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کی ہے۔ ابھی مجھ سے پہلے ایک بزرگ نے فرمایا: ''یہ کامیاب نہیں ہوں گے۔ ان کا حشر وہی ہوگا جو جامعہ عباسیہ کا ہوا۔'' ایک اور بزرگ نے فرمایا: ''جی نوٹ کر لیجیے، اس کا حشر وہی گا جو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کا ہوا۔'' میں نے دل میں کہا: '' کاش اس کا وہی ''حشر'' ہو جو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا ہوا۔'' میرے خیال میں تو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کا تجربہ انتہائی کامیاب ہے۔ میں اس تجربے کو ناکام قرار دینے کی کوئی بنیاد نہیں پاتا، بلکہ اس کو بڑا کامیاب سمجھتا ہوں۔ اگر دینی مدارس کے فارغ التحصیل لوگ علمی اور فکری سطح پر اس درجے پر آجائیں جو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے تمام تو نہیں البتہ بہت سے فارغ التحصیل حضرات میں پائی جاتی ہے تو یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہوگی۔

انہی الفاظ کے ساتھ میں آپ سب حضرات کا شکر گزار ہوں کہ مجھے گفتگو کا موقع عنایت فرمایا۔ پروفیسر خورشید احمد صاحب جیسے دل دردمند رکھنے والے، دین اسلام کے عظیم مجاہد کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے عزت افزائی فرمائی۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

# قدیم وجدید تعلیم میں ہم آہنگی

[۱۹۹۰ء میں جمعیت طلبہ عربیہ کے ایک اجتماع سے خطاب]

جب ہم قدیم وجدید نظام تعلیم کی ہم آہنگی کی بات کرتے ہیں تو بنیادی طور پر ہمارے پیش نظر ان دو نظام ہائے تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور ان دونوں سے فارغ التحصیل ہونے والے اہل علم اور اہل فکر کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنا ہوتا ہے جو آج دینی مدارس اور جدید تعلیم گاہوں کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

قدیم اسلامی نظام تعلیم برصغیر سے باہر دنیائے اسلام میں بارہ سو سال کے طویل عرصہ تک کن خطوط پر کام کرتا رہا ہے؟ کن مقاصد کے تحت کام کرتا رہا ہے؟ اور کس طرح کے افراد تیار کرنا اس نظام تعلیم کے پیش نظر تھا؟ یہ سب سوالات انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ دراصل ان سوالات کے صحیح اور حقیقت پسندانہ جوابات پر ہی ہماری تعلیمی فکر درست سمت میں سفر کر سکتی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ موضوع ایک طویل گفتگو کا متقاضی ہے۔ چونکہ ہمیں گفتگو پاکستان یا موجودہ حالات کے تناظر میں کرنی ہے کہ پاکستان کے موجودہ حالات میں ہمیں قدیم نظام تعلیم یا زیادہ بہتر الفاظ میں قدیم روایت تعلیم اور جدید تعلیم میں ہم آہنگی کیسے پیدا کرنی چاہیے، اور جدید اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے اہل علم اور علمائے کرام کے مابین ایک فعال، مثبت اور بامعنی تفاہم کیسے پیدا کیا جائے، اس لیے ہمیں برصغیر میں تعلیم کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنی چاہیے۔

ان تمام سوالات کے جواب کے لیے ہمیں پہلے اپنی دینی روایت کو مختصر طور پر دیکھنا چاہیے کہ آج ہمارے پاس جو پرانی تعلیمی روایت موجود ہے، دینی مدارس کی شکل میں، اہل علم کی شکل میں، دینی قائدین کی شکل میں، علمائے کرام کی شکل میں، وہ بنیادی طور پر کیا ہے؟ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر اس روایت نے ہماری تاریخ میں نہایت نمایاں اور فعال کردار ادا کیا ہے؟ وہ کیا حالات تھے جن میں اس روایت نے گزشتہ دو سو سال کے عرصہ میں غیر ملکی استعمار سے نجات دلانے میں برصغیر کے

مسلمانوں کی قیادت کی تھی؟ وہ کیا قوت تھی جس سے کام لے کر اس روایت نے دور قدیم سے دور جدید میں منتقلی (transition) کے اس عمل کو آسان بنایا اور منتقلی کے اس نہایت مشکل دور میں امت مسلمہ کو اس خطرے سے بڑی حد تک محفوظ رکھا؟ یہ بات میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ منتقلی کے دور کے جو دوسرے خطرات ہیں، جن سے دنیاے اسلام کے متعدد ممالک کو سابقہ پیش آیا، جس کی مثالیں مصر میں، شام میں، الجزائر میں، تیونس میں پیش آئیں، اس طرح کے آنے والے ان تمام نتائج اور خطرات سے برصغیر کے مسلمانوں کو اس قدیم روایت نے احسن طور پر محفوظ رکھا۔

اگر آپ تھوڑی دیر کے لیے مصر، الجزائر، شام، عراق، تیونس، اور عرب دنیا کے دوسرے کئی ممالک میں تعلیم کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو ایک بات واضح طور پر آپ کے سامنے آئے گی کہ اس ٹرانزیشن کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال نے وہاں اسلامی نظام تعلیم بلکہ اسلامی علوم و فنون اور مسلمانوں کی قدیم تعلیمی روایت کو اس طرح کمزور بلکہ گم کر دیا کہ اگر آج آپ مائیکروسکوپ کو لے کر اس کے بقایا جات واثرات معلوم کرنا چاہیں تو ان کو تلاش کرنا بڑا مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً الجزائر میں فرانسیسی استعمار سے پہلے وہاں جو بھی نظام تعلیم موجود تھا، جو روایات بھی موجود تھیں، فرانسیسی استعمار کے آنے کے بعد وہ روایات اتنی تیزی سے ختم ہو گئیں کہ فرانسیسی استعمار کے جانے کے بعد جب الجزائر آزاد ہوا تو وہاں ایسے اہل علم انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے جو عربی زبان میں اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتے ہوں اور عربی زبان میں اظہار خیال کر سکتے ہوں۔ دو سو سال کے اس طویل عرصہ میں فرانسیسی استعمار نے موثر نظام تعلیم کے ذریعے سے نہ صرف عربی زبان بلکہ مسلمانوں کی پوری تعلیمی روایت اور اسلامی علوم وفنون اور مسلمانوں کی تمدن وثقافت کے اثرات سے ان ممالک کے تعلیمی نظام کو بالکل صاف کر دیا اور جب الجزائر آزاد ہوا تو آزاد الجزائر کی وارث ایک ایسی الجیرین قوم قرار پائی جو فرانسیسی زبان بولتی تھی اور فرانسیسی زبان میں سوچتی تھی، اس لیے کہ عربی زبان مٹائی جا چکی تھی اور صحیح عربی لکھنے اور بولنے والے قریب قریب ناپید ہو چکے تھے۔ اب وہاں کے پڑھے لکھے لوگ فرانسیسی زبان ہی کے تربیت یافتہ اور فرانسیسی نظام ہی کے تحت تعلیم یافتہ تھے۔ اب ان کا طرز فکر فرانسیسی، ان کا اسلوب بیان فرانسیسی اور نظام سراسر فرانسیسی بن چکا تھا۔ اس ایک

روایت کے علاوہ وہاں کوئی اور روایت اب موجود نہیں رہی تھی۔ یہی صورت حال تیونس وغیرہ کی بھی رہی۔

اس کے برعکس آپ برصغیر کی مثال لیں کہ برصغیر کے اہل علم، علمائے کرام اور دینی مدارس نے قدیم تعلیمی روایت کے بہت سے پہلوؤں کو تحفظ فراہم کیا اور ان کو باقی رکھا۔ اس باب میں ان کی لازوال اور عظیم الشان خدمات ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔ ان حضرات نے تمام تر مصائب اور مشکلات کے باوجود اس روایت کو قائم رکھا۔ اسلامی علوم وفنون کی جس حد تک ممکن تھا، حفاظت کی۔ مسلمانوں کی تعلیمی روایت کے تسلسل کو باقی رکھا۔ اس کے بعد جب منتقلی (ٹرانزیشن) کا آخری مرحلہ شروع ہوا، جب استعمار یہاں سے گیا اور مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں اقتدار آیا تو اس منتقلی کے وہ خطرناک اور منفی نتائج یہاں پیدا نہیں ہوئے جو کئی دوسرے مسلم ممالک میں پیدا ہوئے۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ذرا شروع سے جائزہ لے کر یہ دیکھیں کہ یہ روایت جس نے دینی مدارس کو جنم دیا اور وہ دینی مدارس جو آج کل ہمارے سامنے موجود ہیں، وہ کس روایت کے نتیجے میں یہاں تک پہنچے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ برصغیر میں ۹۲ ہجری میں اسلام آیا اور برصغیر کے شمال مغربی یعنی موجودہ پاکستان کے بڑے حصے پر، بلکہ کہنا چاہیے کہ موجودہ پاکستان کے دو تہائی علاقے پر براہ راست اس دور میں اسلامی حکومت قائم ہوئی جب معدود چند صحابہ کرامؓ بقید حیات تھے جن میں چند نفوس قدسیہ نے برصغیر کو بھی اپنے وجود سے منور فرمایا اور بلوچستان اور جنوبی خراسان وغیرہ کے اس حصہ میں آکر آباد ہوئے جو آج پاکستان کا حصہ ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر کا سب سے پہلا تعلیمی رشتہ جب اسلامی روایت سے استوار ہوا تو براہ راست صحابہ کرام و ران کی تربیت یافتہ نسل کے زمانے میں قائم ہوا۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک برصغیر میں مسلمان آتے رہے اور وقتاً فوقتاً مختلف علاقے اسلامی سلطنت کا حصہ بنتے رہے، لیکن ایک بات نہایت عجیب ہے کہ وہ علاقہ جو صحابہ کرامؓ کے زمانے میں فتح ہوا تھا (اور صحابہ کرام کا بابرکت دور محدثین کے مطابق سن ۱۱۰ھ تک ہے) وہ آج بھی پاکستان میں شامل ہے۔

۹۲ھ میں پاکستان کا علاقہ فتح ہوا۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ علاقہ صحابہ کرامؓ کے زمانے کا مفتوحہ

علاقہ ہے اور آج تک پاکستان کا جزو ہے اور مسلمانوں کے اقتدار میں ہے، لیکن جو علاقے صحابہ کرامؓ کے دور کے بعد اسلامی سلطنت کے اجزا بنے، وہ ایک ایک کر کے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل چکے ہیں۔ برصغیر میں بھی ہمیں یہ نقشہ نظر آتا ہے اور برصغیر کے باہر بھی اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ یہی وہ دور ہے جس زمانے میں ایک ایسے نظام تعلیم کی بنیاد رکھی گئی کہ جس نے بارہ سو برس تک برصغیر میں مسلم کمیونٹی کو تحفظ اور تسلسل عطا کیا۔ یہ مسلم کمیونٹی جو عددی اعتبار سے اقلیت میں تھی، جو عسکری اعتبار سے دوسری غیر اسلامی قوتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کمزور تھی، جو تہذیب وتمدن کے اعتبار سے یہاں کی قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، لیکن صرف اور صرف تعلیم اور تربیت کے اس نظام نے جو ۹۲ھ کے آغاز میں مسلمانوں نے قائم کیا تھا، مسلمانوں کو بارہ سو برس تک باقی رکھا۔

تاریخ اسلام کے اس طویل بارہ سو سالہ دور میں مسلم آبادیاں یہاں نہ صرف پھیلتی رہیں بلکہ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں نے وہ کامیابیاں حاصل کیں جو تاریخ میں کسی جگہ پر نہیں ملتیں۔ برصغیر میں بیشتر علاقوں میں دس بارہ فیصد کی تعداد رکھنے والی ایک اقلیتی قوم نے ایک ہزار برس تک ایسے ملک پر حکومت کی جہاں کی نوے فیصد کے قریب آبادی کا مذہب، ان کی زبان، ان کا عقیدہ، ان کی تہذیب وتمدن، ان کا لباس حتیٰ کہ روزمرہ زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات بھی مسلمانوں سے مختلف تھیں۔ یہ صرف اور صرف نظام تعلیم کی بنیاد پر ہو سکا۔

برصغیر میں سب سے پہلا تعلیمی ادارہ جو مسلمانوں نے قائم کیا، اس کی اولین بنیاد اور پہلی درسی کتاب قرآن مجید تھی۔ چنانچہ صدر اسلام کے مورخین نے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم کے مشورے سے مقامی مسلمانوں کے مطالبے پر ایک مسلمان بزرگ مولانا اسلامی نے قرآن مجید کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ قدیم ترین ترجمہ قرآن کریم نہیں ہے تو کم از کم چند قدیم ترین تراجم قرآن میں سے ایک ضرور ہے جس کی سعادت موجودہ پاکستان کے ایک باشندے کو حاصل ہوئی۔ یہ وہ تعلیمی روایت تھی جس کا براہ راست رشتہ عرب اور عربی النسل اہل علم سے قائم ہوا جس کی وجہ سے یہاں کی فکر میں، برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیمی فکر میں، اصالت عربیہ اتنی مضبوط بنیادوں پر قائم ہوگئی کہ جس کو بعد کی تاریخ متاثر نہیں کر سکی۔

دوسو سال کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا تعلیمی اور فکری رشتہ عرب اور عراق اور عربی بولنے والے اہل علم سے کٹ کر افغانستان، ایران اور سنٹرل ایشیا کے ممالک سے قائم ہو جاتا ہے۔ اسلامی فکر، اسلامی فلسفہ اور تعلیمی نظریات براہ راست عرب سے عربی بولنے والے اہل علم کے بجائے ایک دوسرے واسطے سے ایک بڑی طویل زمانی ومکانی مسافت طے کر کے یہاں پہنچے۔ اس کے کئی دوسرے نتائج بھی ہوئے۔ اس کے نتیجے میں بعض ایسے افکار بھی یہاں پیدا ہوئے جو خالص اسلامی افکار نہیں تھے۔ اس کے نتیجے میں اسلامی افکار پر تھوڑی سی گرد بھی پڑی، تھوڑی سی منفی پرچھائیں بھی پڑیں، لیکن اصالت عربیہ اور اصالت اسلامیہ جو پہلی دو تین صدیوں میں یہاں قائم ہو گئی تھی، وہ اتنی مضبوط اور اتنی گہرائی کے ساتھ جاگزیں تھی کہ یہ بالواسطہ کوشش اس پر زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکی۔

اس کے بعد ایک طویل مسافت کے بعد میں اورنگ زیب کے دور تک آتا ہوں۔ یہ وہ دور ہے کہ جب برصغیر میں مسلمانوں کا زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اور اورنگ زیب کی شخصیت نے اپنے کردار کی قوت سے، اپنے عزم، ذہانت اور قربانیوں سے اس زوال کو طویل عرصے تک روکے رکھا۔ زوال مسلمانوں کا مقدر ہو چکا تھا، لیکن یہ اورنگ زیب ہی تھا جس نے کسی حد تک اس زوال کو روکنے کی کوشش کی اور اس کی سرعت کو ست رفتاری میں تبدیل کیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد جب مسلمانوں میں ہمہ گیر انتشار کا دور شروع ہوا۔۔۔۔۔ تعلیمی انتشار بھی، تمدنی انتشار بھی۔۔۔ تو اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے ایک ایسی عظیم الشان شخصیت کو توفیق عطا فرمائی جس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے غالباً یہ ڈالا کہ مسلمانوں کو تعلیمی اعتبار سے بلند کرنے کے لیے اور مسلمانوں کی تعلیمی اور فکری یکجہتی برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی پوری تعلیمی روایت کو از سر نو مجتمع اور منظم کر کے محفوظ کر لیا جائے۔

یہ زمانہ کسی بھرپور یا ہمہ گیر تعلیمی اصلاح کا نہیں تھا۔ یہ زمانہ کسی تبدیلی واصلاحی تعلیمی سرگرمی کے فوری آغاز کا نہیں تھا۔ یہ طویل المیعاد منصوبہ اپنے زمانے میں شاہ ولی اللہ نے شروع کیا۔ اس کے اثرات ایک طویل عرصے کے بعد سامنے آنے والے تھے۔ اس منصوبے کی کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسا قلیل المیعاد منصوبہ بھی شروع کیا جائے جس کا مقصد یہ ہو کہ

مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دور کے علوم وفنون کو ازسرِ نو مدون کر کے ایک نیا نصاب تعلیم وضع کیا جائے اور اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ جو علوم اب تیار ہوں، وہ سارے کے سارے اس تعلیمی ورثے کے حامل بن جائیں جو برصغیر میں مختلف ذرائع سے آیا ہے، جس میں عرب سے آنے والا ورثہ بھی شامل ہے، جس میں علوم حدیث اور علوم نبوت کا ورثہ بھی شامل ہے، جس میں ایران سے آنے والی عقلیات کا ورثہ بھی شامل ہے اور سنٹرل ایشیا اور افغانستان سے آنے والی روایت بھی۔ ان ساری چیزوں کو مولانا نظام الدینؒ نے ایک ایسے جامع نصاب کی شکل میں تشکیل دیا کہ جو دوسوسوا دوسو برس سے اس پورے خطہ میں مقبول ہے۔ دوسرے متعدد عوامل کے ساتھ ساتھ اس نظام نے دوسو برس تک مسلمانوں کو اس خطرے سے بڑی کامیابی سے دور رکھا جس کی مثالیں میں ابھی الجزائر اور تیونس کے ضمن میں پیش کر چکا ہوں۔

مولانا نظام الدین سہالویؒ نے ایک نظام تعلیم وضع کیا جو ان کے نام کی نسبت سے درس نظامی کہلاتا ہے۔ بعض حضرات کو یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے جو بڑی تاریخی غلط فہمی بھی ہے اور بڑی مضحکہ خیز بھی کہ درس نظامی کا تعلق بغداد کے مدرسہ نظامیہ میں رائج نظام تعلیم سے تھا۔ یہ ایک واضح غلطی اور بدیہی طور پر غلط خیال ہے۔ نہ درس نظامی میں شامل کتابوں میں سے اکثر کتابیں اس وقت لکھی گئی تھیں جب مدرسہ نظامیہ موجود تھا اور نہ مدرسہ نظامیہ کے وقت درس وتدریس کا یہ انداز تھا۔ یہ نصاب ملا نظام الدین سہالویؒ کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ چونکہ انہوں نے اس کو سب سے پہلے شروع کیا تھا، اس لیے یہ بعد میں درس نظامی کہلایا۔ ان کے زمانے میں اس کو درس نظامی نہیں کہا جاتا تھا۔ ملا نظام الدین سہالویؒ نے جو نصاب مرتب کیا، وہ کسی حد تک اور بہت کچھ تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی ہمارے مدارس میں مروج ہے۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ماضی قریب میں برصغیر کے جتنے دینی قائدین اور اہل علم پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے ۹۵ فیصد کا تعلق اسی نظام تعلیم سے رہا ہے۔ اس کی کچھ خصوصیات ہیں جو اسے دوسرے نظاموں سے منفرد بناتی ہیں جو حالات کی پیداوار ہیں اور جن سے غالباً ان حالات میں اور اس ماحول میں بچا نہیں جاسکتا تھا اور نہ صرف نظر کیا جاسکتا تھا۔

اس میں سب سے نمایاں چیز اس کی جامعیت ہے۔ یہاں ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری

ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ درس نظامی دینی تعلیم میں مہارت اور اختصاص حاصل کرنے کا کوئی نظام تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ درس نظامی محض دینی تعلیم کا نظام نہیں تھا اور نہ اس کا مقصد علوم دینیہ کے محققین پیدا کرنا تھا، نہ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ معاشرے میں دینی رہنمائی کے لیے قائدین پیدا کیے جائیں۔ یہ تو اس زمانے کے حساب سے ایک ماڈرن اور اپ ٹو ڈیٹ نظام کا خاکہ تھا جو اس زمانے کے ایک صاحب علم نے وضع کیا تھا۔ چونکہ اورنگ زیب کے جانے کے بعد بھی برصغیر میں سوسوا سو برس تک مسلمانوں کی حکومت قائم رہی، نظام تعلیم بھی بڑی حد تک اسلامی خطوط پر قائم تھا اور قانون، تمدن، معاشرت، معاشیات، سیاسیات، سارے کے سارے معاملات اسلامی خطوط ہی پر استوار تھے، اس لیے بنیادی طور پر یہ چیز لازمی تھی کہ اس نظام میں اسلامی علوم کو اساسی اہمیت حاصل ہو۔ اس لیے ملا نظام الدین نے اس زمانے میں جتنے مروج علوم تھے جن کا اندازہ ۵٦ کے قریب لگایا جاتا ہے، ان سب کو یکجا کر کے ایک ایسے آٹھ سالہ نظام تعلیم کا خاکہ پیش کیا جس کو آج کل گریجویشن کی ڈگری کے برابر قرار دے سکتے ہیں، اور انہوں نے یہ کوشش کی کہ اس نظام سے ایک مرتبہ تعلیم حاصل کرنے اور اس نصاب میں تعلیم پانے کے بعد اگر کوئی شخص کسی خاص میدان میں ترقی کرنا چاہے تو اس کے سامنے راستہ کھلا ہو۔ مزید تخصص کے لیے بھی راستہ ہو اور علمی اعتبار سے بھی وہ اس کے لیے تیار ہو۔ منطق، فلسفہ، ریاضی، طب، فن تعمیر، جیومیٹری، علم ہندسہ (یہ سارے کے سارے علوم) عربی ادب، فارسی ادب، یہ سب اسلامی علوم کی تحصیل کے لیے، اس کے ساتھ ساتھ عربی زبان، فقہ، اصول فقہ، علم کلام، علوم تصوف جیسے خالص دینی علوم، یہ ساری کی ساری چیزیں اس میں شامل تھیں۔ اگر آپ اس اصل نصاب کو دیکھیں جو ملا نظام الدین نے تیار کیا تھا تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں تقریباً ۵٦ علوم کی چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں شامل تھیں۔ مقصد یہ تھا کہ طالب علم کو رائج الوقت علوم وفنون سے کچھ نہ کچھ شناسائی ضرور ہو جائے۔ یہ وسعت اور جامعیت غالباً دنیا کے کسی اور مذہب یا روایت میں نہیں ہے کہ آٹھ سال کی مختصر مدت میں یہ سب تکمیل ہو جائے۔

اگر دس بارہ سال کی عمر کا طالب علم اس میں داخل ہو تو وہ بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو سکتا

ہے۔ اگر چہ اس کی مثالیں بھی ہیں کہ چودہ، پندرہ یا سولہ سال کی عمر میں طلبہ فارغ التحصیل ہوئے ہیں۔ خود شاہ ولی اللہ چودہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے، ملا نظام الدین سترہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے، مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ چودہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے اور صاحب تصنیف بھی ہوئے۔ ان کے بارے میں یہ لطیفہ مشہور ہے کہ ان کی ایک فقہی تحریر یا تصنیف دیکھ کر افغانستان سے ایک بزرگ ان سے ملنے اور کسی مسئلہ میں تبادلہ خیال کے لیے حاضر ہوئے اور لکھنو پہنچ کر پوچھا کہ مولانا عبدالحی کہاں ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ وہ اپنے ہم سن دوستوں کے ہمراہ چیل کے انڈے ڈھونڈنے گئے ہیں۔ اسے بڑی حیرت ہوئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ چند لڑکے ہیں جو چیل کے انڈے پکڑنے کے لیے درختوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ پوچھا کہ مولانا عبدالحی کون سے ہیں؟ ایک لڑکے نے درخت پر بیٹھے ایک دوسرے لڑکے کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ وہ مولانا عبدالحی ہے۔ اس کو یقین نہیں آیا، لیکن اس نے مسئلہ پوچھا۔ مولانا نے اپنا شغل بھی جاری رکھا اور اسے تفصیل کے ساتھ مسئلہ کے بارے میں بھی بتایا، نیز نشان دہی کی کہ فلاں فلاں کتاب میں دیکھیں، فلاں کی دلیل یہ ہے، فلاں کی دلیل یہ ہے۔ پھر ان دلائل کا محاکمہ کیا اور اس پوری گفتگو کے دوران میں اپنا شغل بھی جاری رکھا۔

اس نظام میں اس طرح کی مثالیں آپ کو بہت ملیں گی۔ ۵۶ علوم اور تقریباً ۱۲۰ بنیادی کتابیں اور متون اس نصاب میں شامل ہیں۔ ان کی بنیاد پر ملا نظام الدینؒ نے اس نظام کو وضع کیا۔ کتابوں کے انتخاب میں ایک بات انہوں نے خاص طور پر پیش نظر رکھی۔ وہ یہ کہ ہر فن کی انتہائی مشکل اور انتہائی دقیق، حتیٰ کہ چیستان قسم کی کتاب انہوں نے اس نصاب میں رکھی۔ آج یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ فقہ کی فلاں کتاب بہت مشکل ہے اور طلبہ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس مشکل پسندی سے ملا نظام الدین کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو اتنی مشق کرائی جائے کہ جب وہ نصاب پڑھ کر فارغ ہوں تو مشکل سے مشکل اور ادق سے ادق کتاب سے استفادہ کرنا ان کے لیے مشکل نہ ہو۔ چنانچہ وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ ہمارے سامنے اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں لیکن میں اس کی تفصیلات میں نہیں جاتا۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلمانوں کے اقتدار کا سارا سلسلہ ختم ہو گیا اور جو تھوڑا بہت بھرم موجود تھا،

وہ بھی جاتا رہا تو اب یہ مشکل پیش آئی کہ نئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیا کیا جائے؟ اس سلسلہ میں پیش قدمی کی سعادت مولانا قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفقا کو حاصل ہوئی جو دارالعلوم دیوبند کے بانی ہیں۔ باقی دینی مدارس اسی دارالعلوم دیوبند کا ایک عکس اور اسی کی معنوی اولاد ہیں۔

مولانا محمد قاسمؒ خود درس نظامی کے سند یافتہ اور تربیت یافتہ تھے۔ ان کے استاد مولانا مملوک علی نے درس نظامی ہی کی تعلیم پائی تھی۔ وہ دہلی کے مشہور دہلی کالج میں، جہاں مرزا غالب فارسی کے پروفیسر کے لیے انٹرویو دینے گئے تھے، عربی کے استاد تھے۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ فکری طور پر آدمی جس روایت کا تربیت یافتہ ہوتا ہے، اسی روایت کو اختیار کرنے اور آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اسی روایت کو دارالعلوم میں اختیار کیا، لیکن اب حالات بدل چکے تھے، زمانہ بدل چکا تھا۔ محسوس ہوا کہ خالص درس نظامی کو جوں کا توں اپنانا ٹھیک نہیں، اس لیے اس میں تبدیلیاں لانے کا عمل شروع ہوا اور سب سے پہلے تبدیلی خود مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے کی اور یوں یہ تبدیل شدہ درس نظامی دارالعلوم دیوبند میں اختیار کیا گیا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ درس نظامی کا مقصد ایک ایسا گریجویٹ پیدا کرنا تھا جو کہ زمانے کے مروج علوم میں ضروری مہارت کے لیے طالب علم کو تیار کرے، اس لیے انہوں نے بہت سے علوم کی مشکل کتابیں اس میں رکھ دی تھیں۔ اس ضمن میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے یہ طے کیا کہ یونانی منطق اور فلسفہ نہیں پڑھایا جائے گا، بلکہ تفسیر اور حدیث پر زیادہ زور دیا جائے گا۔ یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے۔ وہ یہ کہ چونکہ درس نظامی بنیادی طور پر گریجویشن کی تعلیم تھی، تخصص کی تعلیم نہیں تھی، اس لیے اس میں تفسیر اور حدیث کو بطور تخصص کے نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ اس میں صرف ایک یا دو تفسیر کی کتابیں اس نقطہ نظر سے شامل کی گئی تھیں کہ طالب علم تفسیری لٹریچر کے مطالعے کے قابل بن جائے۔ خود قرآن مجید کا اختصاصی مطالعہ، تفسیر کا اختصاصی مطالعہ اور علوم قرآن سے ماہرانہ واقفیت اس درس کے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔

تبدیلی کے ضمن میں اس نصاب میں منطق اور فلسفہ کا تناسب کم کر کے تفسیر اور حدیث کے حصے میں اضافہ کیا گیا، گویا کہ قرآن مجید اور حدیث کے تخصص اور درس نظامی، ان دونوں کو ملا کر ایک نیا

نظام اختیار کیا گیا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ کوئی دینی اختصاص کا نظام نہیں تھا بلکہ اس زمانے کا ایک عام دنیوی بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ایک ماڈرن نظام تھا جو ان حالات میں دیوبند کے بانیان نے اختیار کیا۔

اس کے بعد حالات میں جب تیزی سے تبدیلی پیدا ہوئی تو دارالعلوم دیوبند کے قیام کے ۲۵، ۳۰ سال بعد بعض اہل علم کو یہ محسوس ہوا کہ جن ضروریات کے لیے دارالعلوم کا قیام عمل میں لایا گیا تھا، وہ پوری نہیں ہو رہی ہیں، اس لیے کہ وہاں سے جو ماہرین شریعت یا متخصصین فارغ التحصیل ہو کر نکل رہے ہیں، وہ ایک ایسی قدیم روایت کے نمائندہ ہیں جو دور جدید کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے پا رہی۔ دور جدید میں جس انداز سے اسلام پر اعتراضات ہو رہے ہیں، سائنس، فلسفہ مغرب، جدید نظریات وتصورات، معاشیات، سیاسیات کے میدانوں سے اسلام پر حملے ہو رہے ہیں، ان چیزوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نہ تو طلبہ کو عقلی وفکری طور پر ان کے جوابات دینے کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور نہ ان کے لیے ایسا کرنا ممکن ہے۔ ان کی تربیت ان اعتراضات کا جواب دینے کے لیے تو درست اور کافی تھی جو قدیم یونانی فلسفے کے انداز پر کیے جاتے تھے یا جو قدیم منطقیوں کی طرف سے کیے گئے، لیکن اکثر وبیشتر میدانوں میں ان کی تربیت دور جدید کی کسی عقلی وفکری ضرورت کے اعتبار سے نہیں ہوئی تھی۔

اس مقصد کے لیے ایک نئے ادارہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہ نیا ادارہ ندوۃ العلماء کے نام سے قائم کیا گیا جس میں ادب اور تاریخ پر زیادہ زور دیا گیا۔ انگریزی زبان اور چند جدید علوم بھی بقدر ضرورت شامل کیے گئے۔ لیکن چونکہ (یہاں میں ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ بات کہہ رہا ہوں، کسی ادارے یا شخصیت پر تنقید کرنا مقصود نہیں ہے) ندوۃ العلماء کا قیام دارالعلوم دیوبند کے تجربے کے ردعمل کے طور پر ہوا تھا، اس لیے ندوۃ العلماء کے نصاب میں درس نظامی کی جو شدت پسندی، دقت پسندی اور مشکل پسندی تھی، وہ بالکلیہ ختم کر دی گئی اور ان تمام مضامین کو ممکنہ حد تک آسان بنا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں سے فارغ ہونے والے حضرات جید صحافی، جید ادیب، اچھے شاعر اور اچھے مصنف تو ہوئے لیکن کوئی ایسا ٹھوس عالم اور مفکر چند ایک کو چھوڑ کر (مثلاً مولانا شبلیؒ

جن کی تعلیم ندوہ میں نہیں ہوئی تھی یا علامہ سید سلیمان ندویؒ جن کی اصل تعلیم تو ندوہ سے باہر ہوئی تھی، تکمیل وہاں ضرور ہوئی تھی) خود ندوہ نے ایسا کوئی ٹھوس عالم پیدا نہیں کیا جو قدیم اسلامی علوم میں عمیق اور ماہرانہ نظر رکھتا ہو، قرآن وحدیث یا فقہ میں تخصص رکھتا ہو اور دور جدید کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہو۔ ندوہ کے ردعمل میں کئی اور ادارے اور پھر بعد میں علی گڑھ کے ردعمل میں جامعہ ملیہ کا قیام عمل میں آیا جو سیاسیات اور کانگریس کی نذر ہو گیا۔

اس کے بعد جب پاکستان بنا تو یہاں ۱۹۴۷ء میں کوئی ایسی دینی تعلیمی درس گاہ موجود نہیں تھی کہ جس کی قدیم روایات بھی ہوں، جس میں اسلامی علوم میں تخصص کا خاطر خواہ انتظام بھی موجود ہو، جس کا رشتہ مسلمانوں کی قدیم تعلیمی روایات سے بھی ملتا ہو اور دور جدید کے تقاضوں پر پوری اترتی ہو۔ ہمارے پاس چند جدید ادارے اور جامعات تھیں، پنجاب یونیورسٹی اور دوسرے چند ادارے کام کر رہے تھے، لیکن وہاں عربی ادب اور عربی زبان کے قدیم مخطوطات پر تحقیق کا انتظام تو موجود تھا، لیکن خود اسلامی علوم تفسیر، حدیث اور فقہ پر ماہرانہ بصیرت پیدا کرنے کا کوئی انتظام موجود نہ تھا۔

پنجاب یونیورسٹی میں بالآخر اسلامیات کا ایک شعبہ قائم ہوا، لیکن فوری طور پر جن حضرات نے یہ ذمہ داری سنبھالی، وہ اس قدیم روایت کے نمائندے نہیں تھے جس کے نمائندگان کو وہاں لانے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے ندوہ اور جامعہ ملیہ کے ضمن میں جس ضرورت کے مفقود ہونے کا ذکر کیا ہے، وہ یونیورسٹی میں بھی نظر نہ آئی۔ پھر بعد میں پاکستان کی دوسری یونیورسٹیوں میں اسلامیات کی تعلیم وتدریس کا وہ نظام جوں کا توں اپنا لیا گیا جو پنجاب یونیورسٹی میں اختیار کیا گیا تھا۔ اس لیے ضرورت کے ساتھ اس کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آج جو کیفیت ہے، وہ اسلامیات کے طلبہ اور اساتذہ سے مخفی نہیں ہے۔

ب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اسلامیات کی تعلیم کا کوئی ایسا نظام مرتب کریں کہ جس میں دو ضروریات کی تکمیل کا سامان پایا جاتا ہو۔ ایک تو مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تعلیمی روایت کا تحفظ اور تسلسل جس میں برصغیر کے مسلمانوں نے بہت کچھ اضافہ کیا ہے، جس میں ایک طرف تعمق بھی ہے اور دوسری طرف وسعت بھی۔ جس میں یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ اسلامی ثقافتی اقدار کے تہذیبی

وفکری وجود کو پوری طرح جلا بخشے اور اس کے ساتھ ساتھ اگر کوئی نئی چیز ملے تو اس کو اپنے مزاج کے مطابق اپنے نظام میں سمولے۔ آج وسعت ظرفی کی اس روایت کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے اختصاص اور تعمق ضروری اور لازمی شرط ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ دوسری چیز جو ضروری ہے، وہ دور جدید کے تقاضوں کا صحیح اور متوازن احساس وادارک اور اس کا مناسب جواب ہے۔ دور جدید کے جو تقاضے ہیں، دور جدید میں اسلام کو ایک کارفرما قوت بنانے کی جو مہم ہے، اس میں جہاں جہاں فکری صلاحیت اجاگر کرنے کی ضرورت ہے، اس نئے مجوزہ اور منتظر نظام کے فارغ التحصیل حضرات میں ہونی چاہیے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ہاں ایسے ماہرین معاشیات پیدا ہوں جو دور جدید کے معاشی نظام کو اسلامی اصولوں کے مطابق استوار کرسکیں۔ ہمیں آج یہ تسلیم کرلینا چاہیے کہ ایسے ماہرین ہمارے ہاں موجود نہیں ہیں۔ ہمیں ایسے قاضیوں اور ماہرین قانون کی ضرورت ہے جو اسلامی فقہ میں گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ جدید قانونی نزاکتوں اور آئینی پیچیدگیوں کو بھی خوب سمجھتے ہوں۔ آج ہمارے ہاں ہزاروں ایسے ماہرین پاکستان میں موجود ہیں جو موجودہ نظام کو چلا رہے ہیں، ان کے مقابلے میں شاید چند ماہرین قانون بھی ایسے نہیں ہیں جو ایک طرف فکر اسلامی اور فقہ اسلامی میں کماحقہ تعمق رکھتے ہوں اور دوسری طرف دور جدید کے تقاضوں کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں۔

ان سارے شعبوں میں، ان سارے کاموں کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ایک نئے نظام کو وضع کریں اور وہ نیا نظام اساتذہ کرام بھی وضع کرسکتے ہیں، علما بھی وضع کرسکتے ہیں۔ میری دعا ہے، مجھے امید ہے کہ جس طرح تاریخ کے ایک دور میں اللہ تعالیٰ نے ملا نظام الدین سہالوی کو کھڑا کیا، پھر ایک دوسرے تاریخی مرحلے پر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو کھڑا کیا، پھر تیسرے مرحلے میں ندوہ کے بانی مولانا محمد علی مونگیریؒ کو کھڑا کیا، علامہ شبلیؒ کو کھڑا کیا، اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ ہم میں سے کسی ایک کو نہیں، سینکڑوں ہزاروں کو اس کام کے لیے کھڑا کردے اور ہم ان نئی ذمہ داریوں کا جواب دینے کا اپنے آپ کو اہل ثابت کرسکیں۔

# مسلمانوں کی تعلیمی روایت اور عصر حاضر

[ادارۂ خیر المعارف ملتان کے افتتاح کے موقع پر خطاب]

برادران گرامی، علماے کرام!

سب سے پہلے میں دل کی گہرائیوں سے ادارہ خیر المعارف کے کارکنان، منتظمین، طلبا و اساتذہ کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں جنہوں نے خیر و برکت کے وہ مظاہرے ہمارے سامنے پیش کیے جن کو دیکھنے کی مدت سے لوگوں کے دلوں میں تمنائیں تھیں، جن کو دیکھنے کی آرزو میں کتنی ہی نسلیں ہمارے ہاں سے گزر گئیں، لیکن یہ خواب جو سالہا سال سے اکابر اسلام دیکھتے چلے آرہے تھے، آج اس کی تعبیر کا سامان نظر آتا ہے۔

برادران محترم! برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیمی روایت انتہائی تابناک اور انتہائی خوش آئند رہی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا بارہ سو سالہ دور حکومت علمی، تعلیمی اور فکری اعتبار سے ایک نمایاں اور قابل ذکر دور ہے۔ یہاں کے اہل علم نے تعلیم کے میدان میں جو روایات قائم کیں، ان سے کسب فیض کے لیے وسط ایشیا اور موجودہ رشین فیڈریشن کے انتہائی آخری کناروں سے، حتیٰ کہ مشرقی یورپ کے علاقے بوسنیا سے، مصر سے اور عرب دنیا کے مختلف گوشوں سے اہل علم اور طلبا کسب فیض کے لیے آیا کرتے تھے۔

کل ہی بوسنیا کے رئیس العلما اور شیخ الاسلام ڈاکٹر مصطفیٰ قریشی نے بتایا کہ ان کے جد امجد برصغیر کے مختلف علاقوں سے کسب فیض کر کے گئے تھے اور یہاں کی علمی روایت کا چرچہ وہ بچپن میں اپنے والدین، دادا اور اپنے بزرگوں سے سنتے چلے آئے ہیں۔

ٹھٹھہ جو ایک بڑا دور افتادہ شہر تھا، ٹھٹھہ کبھی مرکز سیاست نہیں تھا، کبھی مرکز حکومت نہیں تھا، کبھی تجارت کا مرکز نہیں تھا، ثقافت کا کوئی نمایاں مرکز نہیں تھا، لیکن ٹھٹھہ جیسے شہر میں چار سو مدارس کی موجودگی کا مورخین نے ذکر کیا ہے۔ دہلی کے اس زمانے میں جب دہلی اپنی حیثیت کھو چکی تھی، جب

میر تقی میر اپنا مشہور قطعہ دہلی کے بارے میں کہہ چکے تھے کہ

ہم رہنے والے ہیں اس اجڑے دیار کے

جب وہ اجڑا دیار بن چکا تھا، اس وقت مغربی تذکرہ نگاروں اور سیاحوں نے لکھا ہے کہ اس وقت بھی دہلی کے شہر میں ایک ہزار مدارس موجود تھے۔

محمد تغلق جو برصغیر کے اسلامی دور کے وسطی زمانے میں ایک بڑا نامور حکمران رہا ہے، اس کے زمانے میں مشہور سیاح ابن بطوطہ نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ محمد تغلق کے دربار میں اس کو کئی مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس نے کہا کہ محمد تغلق دسترخوان پر اس وقت تک نہیں بیٹھتا جب تک کم از کم چار سو علما وفقہا اس کے دسترخوان پر موجود نہ ہوں۔ گویا جب بادشاہ کے دربار میں چار سو علما وفقہا موجود ہوں گے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ معاشرہ میں علم وتعلیم کا چرچا کتنا رہا ہوگا۔

ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ جب انگریز ہندوستان میں آئے تو اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کی سطح کا معیار سو فیصد تھا۔ یہ ۱۸۴۹ء کی بات ہے، یعنی مسلمانوں میں تعلیم کی سطح سو فیصد تھی اور بحیثیت مجموعی پنجاب میں، جو دور افتادہ صوبہ تھا، مرکز حکومت بھی نہیں تھا اور مرکز ثقافت بھی نمایاں طور پر نہیں تھا۔ یہ تو لکھنو، شیراز اور دوسرے علاقے تھے۔ یہاں مسلمانوں اور غیر مسلم دونوں کو ملا کر ۸۴ فیصد تعلیم کی شرح تھی۔ گویا کہ بحیثیت مجموعی پنجاب میں ۸۴ فیصد اور مسلمانوں میں سو فیصد تعلیم تھی۔ لیکن جب انگریز یہاں سے گئے جو اس دعوے سے آئے تھے کہ ہم دنیا کو تہذیب سکھانے نکلے ہیں، White man's burden کی اصطلاح آپ نے انگریزی اور فرانسیسی کتب میں سنی ہوگی کہ وائٹ مین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کالوں اور رنگ داروں کو تعلیم و تہذیب سے آشنا کرے۔ جب وہ تعلیم وتہذیب سے آشنا کر کے چلا گیا تو ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں تعلیم کی سطح چار فیصد تھی۔ گویا کہ وہ ایک تعلیم یافتہ قوم کو تعلیم سے محروم کرنے کے لیے آئے تھے۔ کم از کم نتائج اور ثمرات بدنے یہی دکھایا۔ واقعات نے یہی بتایا کہ وہ educated تعلیم یافتہ قوم کو de-educated غیر تعلیم یافتہ کرنے کے لیے آئے تھے۔

برصغیر کے مسلمانوں کی تعلیم میں ایک نمایاں چیز یہ ہے کہ جو نظام تعلیم یا نصاب تعلیم وہاں کے

اہل علم نے وضع کیا، دین ودنیا دونوں کی جامعیت کا آئینہ دار تھا۔ اس نظام تعلیم نے مجدد الف ثانیؒ جیسے بزرگ بھی پیدا کیے جن کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے ایک جگہ لکھا ہے: The greatest religious genius India has produced کہ مسلم ہندوستان میں سب سے بڑا مذہبی عبقری جو پیدا ہوا ہے تو وہ حضرت مجددؒ کی ذات گرامی ہے۔ شیخ احمد سرہندی اور نواب سعد اللہ خان دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد تھے۔ نواب سعد اللہ خان وہ سیاست دان ہیں جو شاہ جہاں کے دور میں پورے ہندوستان کے وزیر اعظم تھے۔ یعنی موجودہ افغانستان، موجودہ پاکستان، موجودہ ہندوستان، موجودہ مشرقی پاکستان، موجودہ سری لنکا اور موجودہ نیپال کم از کم یہ چھ ملک اتنی بڑی سلطنت میں شامل تھے جس کا نواب سعد اللہ خان کم از کم اڑتالیس سال وزیر اعظم رہا ہے۔ گویا بڑی بڑی سلطنتیں چلانے والے مدبرین اور اعلیٰ سے اعلیٰ دینی قیادتیں فراہم کرنے والے بزرگان (جو مجدد الف ثانیؒ کے درجے کے لوگ ہوں) وہ اسی ایک نظام تعلیم نے پیدا کیے۔

تاج محل جس مہندس (انجینئر) نے بنایا، وہ امریکہ یا برطانیہ کا تربیت یافتہ نہیں تھا بلکہ وہ اسی نظام تعلیم کا ہی پڑھا ہوا تھا۔ انہی چٹائیوں پر بیٹھ کر یہی صرف ونحو کی کتابیں پڑھ کر اور یہی ریاضی اور ہندسہ کی کتابیں اس نے پڑھی تھی۔ شرح چغمینی ہی پڑھ کر وہ مہندس بنا تھا جس سے اس نے تاج محل جیسی عمارت بنائی جو آج دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک نمایاں عجوبہ ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ طویل ترین تعلیمی روایت جو ایک دن یا دو ایک عشروں پر مشتمل نہیں تھی، بلکہ جس کے پیچھے بارہ سو سال کی تاریخ تھی، جس کے پیچھے ایسے ایسے نامور ترین اہل علم مصنفین وشارحین موجود تھے جن کی کتب آج بھی دنیائے عرب کی یونیورسٹیوں میں زیر تدریس ہیں۔ آپ نے محب اللہ بہاری کا نام سنا ہوگا جو اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں صدر الصدور رہے، یعنی محتسب اعلیٰ کے عہدے پر فائز رہے، ان کی دو کتابیں ہیں جو درس نظامی میں مشہور ہیں۔ ایک منطق میں ہے: ''سلم العلوم'' اور ایک اصول فقہ میں ہے: ''مسلم الثبوت''۔ مسلم الثبوت کے بارے میں دیکھ کر مجھے انتہائی خوشی ہوئی۔ مجھے آج سے کئی سال پہلے استنبول جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کے ایک جدید ترین ادارے میں جانے کا موقع ملا۔ عشا کی نماز کے بعد میں نے دیکھا کہ طلبا

درس گاہوں میں تیاری کر رہے تھے۔ان کے ہوسٹلوں کے کمروں میں دیکھا تو تیاری کر رہے تھے۔ ایک نوجوان کے ہاتھ سے میں نے ایک کتاب لے کر دیکھی تو وہ ''فواتح الرحموت'' تھی جو مسلم الثبوت کی شرح ہے اور شرح بھی برصغیر کے ایک عالم مولانا عبدالعلیؒ کی لکھی ہوئی ہے۔گویا شرح اور متن دونوں برصغیر کے ایک عالم کے لکھے ہوئے اور بیسویں صدی عیسوی کے آخری عشرہ میں (۱۹۹۵ء کا ذکر ہے) استنبول کی ایک درسگاہ میں لوگ اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

آپ دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک چلے جائیں، مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک آپ کو تفسیروں میں، علم حدیث کی شروح میں، فن رجال اور جرح تعدیل جو علم حدیث کے مشکل ترین فن مانے جاتے ہیں، جرح وتعدیل پر سب سے بہتر کتاب جو پورے چودہ سو سال میں کسی مصنف نے لکھی، وہ ہمارے برصغیر کے ایک عالم نے لکھی ہے: ''الرفع والتکمیل فی الجرح والتعدیل''۔ابھی ایک دوست نے شیخ ابوالفتاح ابوغدہ کا تذکرہ کیا۔انہوں نے اس کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔یہ ان کی رائے ہے، میں اپنی رائے کو قابل اعتماد نہیں سمجھتا۔شیخ ابوالفتاح ابوغدہ کی رائے ہے کہ ''جرح وتعدیل'' پر اس سے بہتر کتاب پورے حدیث کے ادب میں موجود نہیں ہے۔

یہ مثالیں جن میں اضافہ کیا جا سکتا ہے اور ایسی سینکڑوں، ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں اور یہ مثالیں دینے کا وقت نہیں ہے، لیکن جو بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ دینی علوم میں تعمق، گہرائی ومہارت کے یہ نمونے ہیں جو ہمارے سامنے ہیں۔دوسری طرف دنیاوی تقاضوں کی تکمیل کا سامان اس حد تک ہے کہ بڑے سے بڑے مہندس (علم ہندسہ کے ماہر) جو سات عجائبات میں سے ایک عجوبہ تیار کر کے دکھا دیں۔ایسے مدبر جو چھ ممالک پر مشتمل سلطنت کو کامیابی سے ۴۸ سال تک اس طرح چلا کر دکھا دے کہ ہندوستان کو پورے یورپ میں اس زمانے میں ''سونے کی چڑیا'' کہا جاتا تھا اور شاہ جہاں کے زمانے میں ہندوستان کی دولت، ہندوستان کی معاشی ترقی اور برصغیر کے مسلمانوں کی خوشحالی نے انگریز تاجروں کو، ڈچ اور ولندیزی تاجروں کو آمادہ کیا کہ وہ یہاں آئیں اور یہاں آ کر تجارت کریں۔اس تجارت کا آغاز شاہ جہاں کے دور میں ہوا۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ روایت کیوں کمزور پڑی اور وہ روایت کیسے ختم ہوئی؟

آپ نے سنا ہوگا سر ولیم میور، جو یو پی کا لفٹننٹ گورنر تھا، اس نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اسلام دشمنی میں اور ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بدگوئی کرنے میں جو چند نمایاں ترین اور بدنام ترین مستشرقین ہیں، ان میں سے ایک ہے، جس کے جواب میں سرسید احمد خان نے اپنی مشہور کتاب لکھی تھی۔ اس نے لکھا کہ مجھے ہندوستان کے بعض تعلیمی اداروں میں اور مدارس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں طلبہ جو منطق وفلسفہ و ہندسہ کے طالب علم تھے، ان سے میں نے تبادلہ خیال کیا تو میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی سطح (طلبا کی جو فکری سطح ہے) وہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے طلبا سے کسی طور پر بھی کم نہیں۔ وہ تقریباً ۱۸۲۴ء سے ۱۸۶۰ء کے قریب یو پی اور پنجاب میں لفٹننٹ گورنر رہا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب اس نے ان مدارس کا دورہ کیا تھا۔ اس کے بعد آپ دیکھیں کہ یک بیک یہ ساری روایت ادھر سے لے کر ادھر تک مٹادی گئی اور ایسا لگا کہ برصغیر میں ان چھ ملکوں پر مشتمل ''براعظم'' میں کوئی ایک روشنی کی کرن بھی باقی نہیں رہی کہ جہاں سے دینی تعلیم کے چشمے پھوٹ سکیں، دینی تعلیم کی روشنی پیدا ہو سکے۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۶۷۔۱۸۶۵ء تک جب دارالعلوم دیوبند قائم ہوا، اور اس طرح کے دوسرے ادارے قائم ہوئے، یہ پورا عشرہ انتہائی تاریکی کا عشرہ معلوم ہوتا ہے۔ کیوں؟ یہ کیسے ہوا؟

اس کے لیے انگریز نے چار بڑے اقدامات کیے اور ان چار بڑے اقدامات کے نتیجے میں یہ ساری روایت دس سال کے عرصے میں اس طرح زمین بوس ہوگئی کہ پھر ایک طالب علم اور معلم نے، جن کا نام ''محمود'' تھا (اتفاق سے میری خوش قسمتی ہے کہ میرا نام بھی محمود ہے)، ایک انار کے درخت کے نیچے ایک نئی روایت کا آغاز کیا۔

۱۔ سب سے پہلے انگریز نے فارسی اور عربی زبان کو ختم کیا اور سرکاری زبان انگریزی قرار دے دی جس کے نتیجے میں وہ تمام لوگ جو ۱۸۵۷ء تک تعلیم یافتہ سمجھے جاتے تھے، وہ سب کے سب سرکاری اور انتظامی مناصب کے لحاظ سے اور ان کے تقاضوں کے مطابق غیر تعلیم یافتہ ہو گئے۔ چشم زدن میں اس نے ایک روایت کو بند کر کے دوسری روایت کو کھول دیا، حالانکہ یہ اس معاہدے کی شدید خلاف ورزی تھی جو ۱۷۶۲ء میں اس واقعے سے تقریباً ۹۰ سال پہلے شاہ عالم ثانی اور انگریز کی

ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان باقاعدہ طور پر طے پایا تھا۔ آپ کو پتہ ہوگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب ہندوستان کے تین چار صوبوں پر قبضہ کرلیا اور انگریز کی طاقت برصغیر میں ایک مسلمہ قوت بن گئی تو اس زمانے کے مسلم فرمانروا شاہ عالم ثانیؒ کے سامنے اب دو صورتیں تھیں۔ یا تو وہ مرہٹوں اور جاٹوں کی متحدہ طاقت کو ابھرنے دے اور برصغیر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس طرح کا ''اکھنڈ بھارت'' بنا دے کہ مسلمانوں کا وجود ہی ختم ہو جائے یا پھر انگریزوں سے کوئی معاملہ کر کے ان کی قوت کو تسلیم کر لے اور انگریزوں سے مطمئن ہونے کے بعد ہندوں اور جاٹوں سے نمٹنے کی کوشش کرے۔

آج مصنفین، مورخین لوگ بہت سی باتیں کہتے ہیں کہ یہ ہوتا، وہ ہوتا، یہ کرنا چاہیے تھا، لیکن اصل فیصلہ تو اس آدمی نے کیا جو اس فیلڈ پر تھا کہ انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کر کے ان کی قوت کو تسلیم کرنا چاہیے اور یقیناً قوت کو جاٹوں، مرہٹوں اور سکھوں کے متحدہ محاذ سے نمٹنے کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ اس معاہدے میں جو الہ آباد میں ہوا تھا، انگریزوں نے یہ شرط تسلیم کی تھی کہ ''برصغیر میں حکمرانی مسلمان فرمانروا کی ہوگی۔'' ہم نے اپنے بچپن میں اپنی دادی سے سنا تھا کہ جب سرکاری اعلان ہوا کرتا تھا تو اس طرح ہوتا کہ ''خدائی اللہ کی، ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا''۔ گویا یہ اس معاہدے کا ایک نمونہ تھا جو شاہ عالم ثانی نے انگریزوں سے کیا تھا کہ:

''سیاسی اقتدار دستوری اور آئینی طور پر مسلمان کا رہے گا، شریعت کی بالادستی ہوگی، عدالتیں ''قانون شریعت'' کے مطابق فیصلہ کریں گی اور فقہ حنفی کے ماہر قاضی مقرر کیے جائیں گے جو فقہ حنفی کے مطابق عدالتوں میں مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کریں گے''۔

یہ تحریری معاہدہ باقاعدہ ۶۲۔۱۷۶۱ء میں ہوا اور شاہ عالم ثانی کے ساتھ انگریزوں نے طے کیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے ادارے موجود تھے، مسلمانوں کی تعلیمی روایات پہلے کی طرح جاری ہیں۔ اس لیے کہ معاشرے میں جب تک کسی چیز کی امید اور طلب نہ ہو تو اس وقت تک وہ چیز پیدا ہی نہیں ہوتی۔ ہاں جب معاشرے میں ایک چیز کا چلن ہو جائے تو پھر معاشرے میں خود بخود وہ چیز سامنے آجاتی ہے۔ یہ طلب اور رسد کا ایک عام اصول ہے۔ لیکن انگریزوں نے اس معاہدے کو نظر انداز کیا اور ۱۸۵۷ء میں انھوں نے انگریزی قانون مکمل طور پر نافذ کر دیا، سرکاری زبان فارسی و عربی

کو ختم کر کے انگریزی قائم کر دی، مسلمانوں کے اوقاف ختم کر دیے اور انگریزی قوانین ایک ایک کر کے نافذ کرنا شروع کر دیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان تعلیمی اداروں سے پیدا ہونے والے جو ماہرین و فاضلین تھے، ان کی معاشرہ میں کوئی جگہ نہ تھی۔ جو تعلیمی اداروں کو امداد دینے والے اوقاف تھے، وہ ختم ہو گئے اور چونکہ مسلمانوں کی جاگیریں اور جائیدادیں انگریز نے ضبط کر لی تھیں، اس لیے مسلمان مزید اداروں کو مدد دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ یہ صورت حال ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک جاری رہی۔

یہ اللہ رب العزت کی مہربانی تھی کہ برصغیر کی مسلم کمیونٹی میں ایک جان تھی، ایک احساس تھا اور ایک شعور تھا جو ہمیشہ تازہ اور بیدار رہا۔ انہوں نے انگریز کی تمام قوت و کاوش کے باوجود دینی مدارس کی روایت کو زندہ رکھا، لیکن دینی مدارس کے اس نصاب میں ذرا تبدیلیاں بھی ہوئیں۔ اس روایت میں جو ۱۸۵۷ء سے پہلے تک چلی آ رہی تھی، بہت سے ایسے علوم بھی شامل تھے جن کو آپ اس زمانے کے لحاظ سے دنیاوی علوم کہہ سکتے ہیں۔ اس میں طب بھی پڑھائی جاتی تھی، اس میں علم ہندسہ بھی پڑھایا جاتا تھا، اس میں ریاضی بھی پڑھائی جاتی تھی، اس میں سائنس بھی پڑھائی جاتی تھی۔ الغرض وہ تمام علوم جو اس زمانے میں ناگزیر تھے، وہ سارے ہی پڑھائے جاتے تھے۔ وہ کتب آج بھی موجود ہیں اور آج بھی ایسے علما و ماہرین موجود ہیں جو ان کتابوں کو پڑھتے اور پڑھاتے رہے ہیں۔ اب چونکہ ان علوم کی ضرورت نہیں تھی تو اس لیے اس زمانے کے علما نے دینی تخصصات پر، دینی مہارتوں پر اور صرف دینی علوم و فنون پر ہی زیادہ زور دیا اور تقریباً ۹۰ سال کی مسلسل کاوشوں کے ذریعے مسلمان قوم کو زندہ رکھا، اسلامی تعلیم کو زندہ رکھا، مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی اسی طرح باقی رہی جس طرح ۱۸۵۷ء سے پہلے باقی تھی۔

اب پاکستان بننے کے بعد ضرورت تھی کہ ایک نئے دور کا آغاز ہو۔ نئے دور کا آغاز پاکستان میں ۲۷ رمضان المبارک ہی کو ہو جانا چاہیے تھا جس رات پاکستان قائم ہوا تھا۔ یہ چیز پاکستان کے قائدین کے ذہن میں تھی کہ پاکستان میں ایک نیا نظام تعلیم ہونا چاہیے۔ آپ حضرات میں سے بعض کے علم میں ہوگا کہ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کے منظور ہونے کے فوراً بعد قائداعظم محمد علی جناحؒ کے

اشارے پر مسلم لیگ نے ماہرین کی ایک کمیٹی قائم کی تھی جس میں اس دور کے جید ترین اہل علم کو رکھا تھا اور خیر المدارس اور حضرت مولانا خیر محمد جالندھریؒ کے حوالے سے میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ اس میں جن اہل علم کو دعوت دی گئی، وہ تقریباً سب کے سب وہ تھے جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی روایت اور سلسلے سے وابستہ تھے۔ علامہ سید سلیمان ندوی اس کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (ان کا اس روایت سے تعلق نہیں تھا، لیکن وہ بھی اس کے رکن تھے)، ڈاکٹر ذاکر حسین خان جو مولانا محمد الیاس صاحب بانی تبلیغی جماعت کے معتقد اور مرید تھے جو بعد میں ہندوستان کے صدر ہوئے، وہ بھی اس کمیٹی کے رکن تھے۔ ایک دو اور حضرات بھی کمیٹی میں تھے۔ اس کمیٹی کے ذمے کام یہ تھا کہ نئی معرض وجود میں آنے والی ریاست کے لیے تعلیم و ثقافت کا ایسا نظام وضع کرے جس کے بموجب نئی ریاست کو اسلامی تقاضوں پر اور اس کے نظام تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق نئے انداز سے مرتب کیا جا سکے۔

اس کمیٹی کے ذمے تین کام تھے:

۱۔ نظام تعلیم،

۲۔ نظام معیشت،

۳۔ نظام سیاست۔

نظام سیاست کا خاکہ جو اس نے تیار کیا تھا، وہ مطبوعہ موجود ہے۔ نظام معیشت کا ابتدائی خاکہ تیار کیا جو ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ضائع ہو گیا۔ تعلیم و ثقافت کے نظام میں یا تو کمیٹی کو کام کرنے کا موقع ہی نہیں ملا یا اس کی رپورٹ سامنے نہیں آئی، لیکن اس سے یہ ضرور اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلم لیگ کے صف اول کے قائدین کے دل میں اس کا احساس موجود تھا اور اس دور کے جن اہل علم کو اس کام کے لیے مناسب سمجھا گیا، ان اہل علم کو ہی دعوت دی گئی۔

پاکستان بننے کے بعد (اگست میں پاکستان بنا) تین مہینے کے اندر اندر اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قائد اعظم محمد علی جناح کے کہنے پر پاکستان میں پہلی تعلیمی کانفرنس بلائی گئی جس میں مشرقی و مغربی پاکستان سے ماہرین تعلیم کو دعوت دی گئی تھی۔ قائداعظم نے اس کانفرنس کے نام ایک پیغام بھیجا۔ اس میں

انہوں نے لکھا کہ موجودہ نظام تعلیم ہماری ضروریات کی تکمیل نہیں کر سکتا اور ہمیں ''رائٹ ٹائپ آف ایجوکیشن'' (مثبت نظام تعلیم) کے لیے اقدامات کرنے چاہییں۔ اس کے بعد جب ان کا انتقال ہوا، اللہ نے ان کو بڑے وسائل دیے تھے، بڑی دولت دی تھی، پوری زندگی میں جو کمایا تھا، وہ تحریک پاکستان میں وقف کیا۔ ان کی وہ دولت جو انہوں نے ذاتی کمائی سے چھوڑی تھی، اس کے بارے میں کیا وصیت کی؟ یہ بڑی اہم بات ہے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میری یاد میں کوئی بڑا محل بنا دینا، انگریزی سیکھنے کے لیے دے دینا، بلکہ انہوں نے کہا کہ اسلامیہ کالج پشاور، اسلامیہ کالج لاہور، علی گڑھ یونیورسٹی اور سندھ مدرسۃ الاسلام کو میری جائیداد دے دی جائے۔ گویا وہ ادارے جو اس وقت جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تربیت کا بھی اہتمام کر رہے تھے، جو اسلامی تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے جدید علوم کے ساتھ ملا کر پیش کر رہے تھے (اس وقت جو بھی سطح تھی) ان چار اداروں کے لیے اپنی جیب کی کمائی کے بارے میں وصیت کی۔ یہ میں نے اس لیے عرض کیا کہ بعض اوقات یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ پاکستان میں تعلیم کے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں گیا یا پاکستان کے موسسین نے نئی ریاست کی تعلیمی ضروریات کا کبھی احساس نہیں کیا۔ احساس ہوا، لیکن ان کے جانے کے بعد۔

بعد میں جو لوگ آئے، علامہ اقبالؒ کا مصرعہ ہے، کسی خاص آدمی کی طرف اشارہ مقصود نہیں ہے:

زاغوں کے تصرف میں رہے عقابوں کے نشیمن

یہاں پر ''ہیں'' کی بجائے ''رہے'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس طرح میں بھی اس کی زد میں آوں گا، لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں ''زاغوں کے تصرف میں رہے عقابوں کے نشیمن''۔ سوال یہ ہے کہ آج اگر اس بات کا احساس پیدا ہو گیا ہے اور یہ ایک انتہائی خوش آئند بات ہے کہ مولانا محمد حنیف جالندھری اور ان کی طرح کے بعض دوسرے علمائے کرام کے دل میں اللہ نے یہ بات ڈالی کہ مستقبل میں پاکستان کی تعمیر کے لیے پہلا قدم ہے اور تعلیم ہی سے وہ نسل پیدا ہو سکتی ہے جو پاکستان کو اس کے مفہوم میں ''اسلامی ریاست'' بنائے جس مفہوم میں اسلامی ریاست کو ہم اور آپ دیکھنا چاہتے ہیں۔

اسلام خادم بننے کے لیے نہیں آیا، مخدوم بننے کے لیے آیا ہے۔ جو چیز ''مخدوم'' بن کر اسلام کے کیمپ میں داخل ہوتی ہے، بالآخر اسے ''خادم'' بننا ہی پڑتا ہے۔ تاتاریوں کی مثال لے لیں کہ تاتاری، اسلام میں فاتح بن کر داخل ہوئے، لیکن بالآخر اسلام کے خادم بن گئے۔ ان تاتاریوں نے جنھوں نے بغداد کو تباہ کیا تھا، جنھوں نے دریاؤں کے پانی کتابوں کی سیاہی سے سیاہ کر دیے تھے، انہوں نے ہی اسلام کا سات سو سال تک دفاع کیا۔

آج اگر انگریزی کی وجہ سے کچھ انگریزی خواں مسلمانوں میں مخدوم بننا چاہتے ہیں یا بنے ہوئے ہیں تو یہ ایک عارضی اور وقتی چیز ہے۔ ان شاء اللہ انگریزی زبان اور جدید کمپیوٹر، یہ سائنس اور یہ ٹیکنالوجی سب کی سب اسلام کی خادم بنیں گی اور اسلام کے لیے ''خادم سازی کا کام'' مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب نے شروع کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے کام میں برکت دیں، اللہ تعالیٰ اس کام کو قبول فرمائیں، اللہ تعالیٰ ان کی مثالیں زیادہ سے زیادہ عام کریں، اللہ تعالیٰ اس ادارے کی برکات کو پورے پاکستان اور پھر پوری دنیائے اسلام میں پھیلائے۔ یہ وقت کی انتہائی اہم ناگزیر ضرورت ہے۔ میں نے جو تھوڑی بہت شریعت کی تعلیم پائی ہے اور کم از کم پچھلے ۴۲ سال سے میرا یہ مشغلہ ہے، اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ اس دور میں فرض کفایہ ہے جو مولانا محمد حنیف جالندھری صاحب پورا کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ دوسرے حضرات بھی جید اہل علم کی سربراہی میں سامنے آئیں گے اور اسلامی روایت اور ذوق مزاج اور مذاق کا لحاظ رکھتے ہوئے، اسلامی تخصصات و اسلامی تعمق کو برقرار رکھتے ہوئے بقدر ضرورت جو علوم آج کے لیے ناگزیر ہیں، ان علوم کی تعلیم سے وابستہ اور آراستہ اہل علم کی تیاری میں ان شاء اللہ حصہ لیں گے۔

ان الفاظ اور ان نیک خواہشات کے اظہار کے ساتھ میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

# اکیسویں صدی میں
# پاکستان کے تعلیمی تقاضے

[۳ر دسمبر ۱۹۹۹ء کو آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور
کے زیر اہتمام پانچواں محمد رفیع الدین میموریل لیکچر]

نحمده و نصلى على رسوله الكريم و على اله و اصحابه اجمعين

میں اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے ایک ایسے موثر اور وقیع پلیٹ فارم سے گفتگو کرنے کی دعوت دی گئی ہے جو نہ صرف برصغیر پاک و ہند بلکہ پوری دنیائے اسلام میں بیسویں صدی کے ایک نامور مفکر اور دانشور کے نام نامی سے منسوب ہے۔ میری مراد ڈاکٹر رفیع الدین سے ہے جن کی فکری گہرائی، اسلامیت، توازن اور اعتدال کی نظیریں بیسویں صدی میں اسلامی فکر کی تاریخ میں مشکل سے ملیں گی۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین جیسی عظیم فکری اور مایہ ناز علمی شخصیت سے منسوب یہ سلسلہ خطبات نہ صرف ان کی فکری عظمت اور علمی مقام و مرتبت کا اعتراف ہے بلکہ ان کے اس تعلیمی مشن کا تسلسل بھی ہے جس نے ان کو اپنے اقران و معاصرین میں نمایاں مقام عطا کیا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کے اس صدقہ جاریہ کو قائم و دائم رکھے اور ان کے قائم کردہ ادارہ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشنل کانگریس کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

گفتگو کو آگے بڑھانے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں تعلیم کے تصور اور عہد نبوی میں نظام تعلیم کے موضوع پر ضروری تمہیدی گزارشات پیش کی جائیں۔ ان تمہیدی گزارشات سے اسلامی نظام تعلیم کی نظریاتی بنیادوں کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ مزید برآں یہ تمہیدی مباحث زیر گفتگو موضوع کی تعیین حدود کے لیے بھی ناگزیر ہیں۔

قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اللہ کی کتاب مسلمانوں تک پہنچانے اور ان کا تزکیہ نفس کرنے کے ساتھ ساتھ رسول کا کام یہ بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کو کتاب اللہ اور حکمت و دانائی کی تعلیم دے۔ [1] یہ فرائض سہ گانہ قرآن پاک میں بار بار دہرائے گئے ہیں۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کتاب و حکمت کی تعلیم دینا نبی کا بنیادی اور

اہم ترین فریضہ ہے۔ پھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تمام کائنات کے لیے ہے، اس لیے لامحالہ آپ کی تعلیم بھی تمام کائنات کے لیے ہوگی۔ یہ بات کہ آپ کی تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت پوری دنیا کے لیے تھی اور پوری دنیا کے لیے ہونی چاہیے، تعلیمی دنیا کے لیے ایک بڑا انقلاب آفریں پیام تھا جو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ذریعے سے تکمیل کو پہنچ سکتا تھا۔

اسلام سے قبل جہاں دنیا میں بہت سی اجارہ داریاں قائم تھیں، وہاں تعلیم اور بالخصوص مذہبی تعلیم پر بڑی افسوس ناک اجارہ داری قائم تھی۔ عرب میں جب اسلام آیا تو خود قبیلہ قریش میں، جو تمام عرب پر مذہبی اقتدار رکھتا تھا، بقول بلاذری سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ عرب سے باہر متمدن ممالک میں بھی عام آدمی کو لکھنے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ سینٹ پال نے مسیحیت کی ترویج کی تو اس نظام کے گرجاؤں میں ایک عام آدمی کا بار پانا آسان نہ تھا۔ ہندوؤں کے طبقاتی نظام میں اگر کسی غریب شودر کے کان میں بلا ارادہ بھی وید کا کوئی اشلوک پڑ جاتا تو اس بے گناہ کی یہ سزا ہوتی کہ اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ بھر دیا جاتا۔

رحمۃ للعالمین نے جہاں اور ساری اجارہ داریوں کو ختم کیا، وہاں دنیا کے تمام انسانوں کو، خواہ وہ کالے ہوں یا گورے، عورت ہو یا مرد، بچے ہوں یا بڑے، سب ہی کو کتاب وحکمت کی تعلیم دینے کی ہدایت دی۔ قرآن مجید نے نہ صرف یہ کہ علم حاصل کرنے کی دعوت دی، بلکہ ہر شخص کا فرض قرار دیا کہ وہ علم حاصل کرکے انفس وآفاق پر غور کرے۔ (۲) نظام فلکیات، نظام شب وروز، بادوباراں، بحر ودریا، صحرا وکوہستان، غرض کون سی چیز ہے جس کا مطالعہ کرنے اور اس کی پوشیدہ حکمتوں کا پتہ چلانے کی ترغیب نہیں دی گئی؟ قرآن پاک نے صاف طور پر اعلان کیا کہ خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔ (۳) قرآن مجید نے تو واضح طور پر کہا کہ کیا علم رکھنے والے اور علم نہ رکھنے والے برابر ہو سکتے ہیں؟ (۴) قرآن مجید دراصل ان لوگوں کے لیے ہے جو عقل رکھتے ہیں، جو سوچتے ہیں، جو سمجھ رکھتے ہیں۔ اس میں علم وعقل، سمجھ، فہم اور اس کے مترادفات بار بار استعمال ہوئے ہیں۔ شاید اسی حصول علم کی خاطر مسلمانوں کو دور دراز مقامات تک سفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اہل علم پر سخت وعید فرمائی ہے جو اپنے علم کو اپنی

ذات تک محدود کیے بیٹھے رہتے ہیں اور خلق خدا کو اس سے مستفید نہیں کرتے۔ ایک جگہ ایسے عالم کو جو ضرورت مندوں کو اپنے علم سے مستفید نہ کرے گا، گونگا شیطان قرار دیا گیا ہے۔ واضح طور پر ارشاد فرمایا گیا کہ قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک سب سے بدتر وہ عالم ہوگا جس کے علم سے لوگ فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ ایک جگہ ارشاد ہے کہ اس علم کی مثال جس سے کسی کو فائدہ نہ ہو، اس خزانے کی سی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے۔ اس کی کیفیت خود اللہ تعالیٰ نے یوں بیان کی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ ۔ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (التوبہ ۹: ۳۴، ۳۵)

''جو لوگ سونا اور چاندی سینت سینت کر رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو۔ ایک دن آئے گا جب جہنم کی آگ میں یہ سونا اور چاندی دہکایا جائے گا اور پھر اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا، (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے سینت کر رکھا تھا۔ اب چکھو اس دولت کا مزہ۔''

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار نصیحت فرمائی کہ اللہ سے ایسا علم مانگو جو نفع بخش ہو۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو دعائیں مانگا کرتے تھے، ان میں یہ دعا بھی ہوتی تھی کہ اے اللہ! میں آپ سے علم نافع طلب کرتا ہوں اور اے اللہ! میں ایسے علم سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں جو بے فائدہ ہو، نفع نہ دے۔ (۵)

اسلام میں جہاں طلب علم کو فرض قرار دیا گیا ہے، وہاں اس فرضیت کی تفصیلات بھی واضح کر دی گئی ہیں۔ حصول علم کا ایک درجہ فرض عین یعنی ہر شخص پر ذاتی طور پر فرض ہے، جب کہ دوسرا درجہ فرض کفایہ کا ہے جو پوری ملت اسلامیہ پر اجتماعی طور پر فرض کیا گیا ہے اور اگر کچھ لوگ بھی اس کو پورا کر دیں تو پوری قوم بری الذمہ ہو جاتی ہے۔ شریعت کا بنیادی اور ضروری علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے

لیے فرض عین ہے اور اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کو اسلامی احکام کا ضروری اور بنیادی علم حاصل کرنے میں مدد دے۔ اگر کوئی شخص یہ بنیادی تعلیم حاصل نہ کرے تو سزا کا مستوجب ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے خاص طور پر اس کام کے لیے ایک گشتی افسر مقرر کیا تھا۔ امام شافعیؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے لیے فرض عین ہے کہ وہ اپنے پیشے کے بارے میں تمام ضروری علم رکھتا ہو۔ مثلاً ایک تاجر کے لیے لازمی ہے کہ اسلامی اصول تجارت اور اس کے دوسرے طریقوں سے اچھی طرح آگاہ ہو اور ایک ڈاکٹر کا فرض ہے کہ فن طب کے بارے میں تمام ضروری علم حاصل کرے۔ اس کے علاوہ جتنے دوسرے علوم وفنون ہیں، ان میں سے کسی کا حتیٰ کہ خود اسلامی شریعت کا تفصیلی علم بھی ہر ایک کے لیے فرض عین نہیں بلکہ فرض کفایہ ہے۔ اگر معاشرے میں کچھ لوگ یہ علم رکھنے والے موجود ہیں تو ٹھیک، ورنہ پورا معاشرہ قابل مواخذہ ہوگا۔

مسلم مفکرین نے ان تمام علوم سے بحث کی ہے جو فرض کفایہ کا درجہ رکھتے ہیں۔ امام غزالیؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ نے ان میں سائنس، انجینئرنگ اور صنعت وحرفت کو بھی شامل کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ فنون جہاں سے بھی حاصل ہو سکیں، حاصل کرنے چاہییں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین کے مبارک دور میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں کہ پوری رواداری اور بے تعصبی کے ساتھ جو مفید چیز جہاں سے ملی، اخذ کر لی گئی، لیکن اس کی افادیت کا تعین بہرحال قانون شریعت ہی کی روشنی میں کرنا چاہیے۔ اس مضمون کی بے شمار احادیث، کتب حدیث میں موجود ہیں۔

علمی مشاغل اور مذاکروں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عام عبادت سے بڑھ کر درجہ دیا۔ یہ تو مشہور حدیث ہے کہ شیطان کے لیے ایک عالم، ایک ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔ (۶) یہ بھی بہت مشہور ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف لائے تو دیکھا کہ صحابہ کرامؓ کے دو گروہ الگ الگ دو محفلیں منعقد کیے بیٹھے ہیں۔ ایک محفل میں تلاوت قرآن، تسبیح اللہ اور ذکر ومناجات ہو رہی تھی اور دوسری محفل میں علمی مذاکرہ ہو رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو دیکھا اور خوش ہو کر فرمایا: دونوں اچھا کام کر رہے ہیں لیکن افضل اور برتر درجہ ان لوگوں کا ہے جو علمی مذاکرہ کر رہے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے ہوئے کہ:

انما بعثت معلماً

''میں بھی تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''

علمی مذاکرہ کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ (۷) ایک اور موقع پر بھی یہی صورت حال تھی تو آپ پھر علمی محفل کے ساتھ شامل ہو گئے اور فرمایا:

بھذا امرت

''مجھے بھی اسی کا حکم دیا گیا ہے۔'' (۸)

اسی طرح ایک بار حضرت عمرؓ اور حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ تمام رات علمی مذاکرہ اور گفتگو کرتے رہے۔ جب صبح کا وقت قریب ہوا تو حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے یاد دلایا کہ امیر المومنین نماز کا وقت ہونے والا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ بھی نماز ہی ہے جس میں ہم اس وقت مصروف ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ حصول علم میں سب سے بلند اور اعلیٰ درجہ علم شریعت کا ہے، لیکن دوسرے مفید علوم وفنون کی تحصیل بھی رضاے خداوندی سے خالی نہیں۔ خود قرآن مجید میں بار بار کائنات اور مظاہر فطرت میں غور وفکر کرنے کی ترغیب دلائی گئی۔ متعدد احادیث میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ وہ لوگ اللہ کے بہترین بندے ہیں جو چاند، سورج، ستاروں اور رؤیت ہلال وغیرہ کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس سے اللہ کی قدرت انہیں یاد آتی ہے یا اس سے ذکر اللہ کے لیے اوقات کے تعین میں مدد ملتی ہے۔ اس طرح کے ارشادات دوسرے علوم وفنون کے بارے میں بھی ہیں۔

تعلیم کی یہ اہمیت جاننے کے بعد اب ہمیں مختصر طور پر دیکھنا چاہیے کہ پیغمبر تعلیم نے تعلیم کو عام کرنے کے لیے عملاً کیا کیا اقدامات کیے اور کیا کیا تدابیر اختیار کیں۔ ہجرت سے قبل کا زمانہ اگرچہ نہایت پریشانی کا زمانہ تھا اور مسلمانوں کو ایک لمحہ کے لیے بھی نہ امن نصیب تھا اور نہ اطمینان اور نہ مکہ میں کوئی اجتماعی نظم قائم ہو سکا تھا، لیکن اس کے باوجود خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خفیہ طور پر مشہور صحابی حضرت ارقم بن ابی الارقمؓ کے گھر کو اسلام کی پہلی درس گاہ کے طور پر استعمال کیا۔ یہیں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو اسلام اور قرآن مجید کی تعلیم دیتے، یہیں لوگ نمازیں ادا

کرتے اور یہیں قرآن مجید کی مختلف سورتوں اور رکوعوں پر مشتمل کتابچے تیار کیے جاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تعلیم یافتہ صحابہ بطور گشتی معلم مکہ مکرمہ میں لوگوں کے گھروں میں جا کر ان کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ اسلام لائے تو اس وقت ان کی بہن کے گھر میں مشہور صحابی حضرت خباب بن الارتؓ حضرت عمرؓ کی بہن اور بہنوئی کو قرآن مجید پڑھا رہے تھے اور ان کے پاس ایک کتابچے میں سورہ طٰہٰ لکھی ہوئی موجود تھی جس کو پڑھ کر حضرت عمر بھی اسلام لے آئے۔

جب مدینہ منورہ میں اسلام کا آغاز ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت مصعب بن عمیر کو مسلمانانِ مدینہ کی تعلیم کے لیے مدینہ بھیجا۔ مصعب بن عمیر پہلے مسلمان تھے جو مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ گئے۔ ہجرت سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کے اسلام قبول کرنے والے لوگوں میں جن بارہ نقیبوں کا تقرر کیا، ان میں بھی ان کے تعلیم یافتہ ہونے کی صفت نمایاں تھی۔ ان میں متعدد اصحاب وہ تھے جو زمانہ جاہلیت میں کامل یعنی علامہ اور ہر فن مولا کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ ہجرت کے بعد جب مدینے میں اسلامی ریاست کی داغ بیل ڈالی گئی تو تمام داخلی اور خارجی خطرات اور ہنگاموں کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کی طرف اولین توجہ مبذول فرمائی۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اسلام کی پہلی باقاعدہ درس گاہ صفہ کا قیام بھی عمل میں آیا۔ یہ مسجد نبوی میں ایک احاطہ تھا جو مقیم طلبہ کے لیے اقامت گاہ اور درس گاہ کا کام دیتا تھا۔ اس درس گاہ کے نگران اعلیٰ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آپ کے علاوہ دوسرے اساتذہ میں حضرت عبادہ بن صامتؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت سعید بن العاصؓ کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ ان بزرگوں میں کچھ کے ذمے قرآن کی تعلیم، کچھ کے ذمے فقہ کی تعلیم اور کچھ کے ذمے لکھنا پڑھنا سکھانا تھا۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ لکھنے کے ساتھ ساتھ قرآن مجید کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ بچوں کو لکھنا سکھانے کے لیے الگ مکتب بھی قائم کیے گئے۔

صفہ میں نہ صرف مقیم طلبہ تعلیم پاتے تھے بلکہ مدینے کے رہنے والے لوگ بھی بلا لحاظ عمر وہاں علم

سیکھتے تھے۔ مقیم طلبہ کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ ان اصحاب کے اخراجات عموماً سرکاری مصارف سے پورے ہوتے تھے، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب مدینہ کی ننھی سی ریاست مسلسل ہنگامی دور سے گزر رہی تھی۔ بعض اوقات سرکاری وسائل سے یہ اخراجات پورے نہ ہو پاتے تو اللہ کے غیور بندے کسی پر ظاہر نہ کرتے اور جو کچھ گزرتی، صبر شکر سے جھیل لیتے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے جو فضلاے مدینہ کے سرخیل ہیں، اپنی اس تنگ دستی کی بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں جو صفہ میں قیام کے دوران ان پر گزریں۔ عموماً مختلف صحابہ کے ہاں رات کے کھانے پر دعوتیں ہوا کرتی تھیں۔ لوگ حسب استطاعت ایک ایک، دو دو اصحاب صفہ کو کھانے پر بلا لیتے تھے۔ اس معاملے میں رئیس خزرج حضرت سعد بن عبادہؓ عموماً سب سے بازی لے جاتے تھے۔ وہ ایک وقت میں ۷۰، ۸۰ سے کم لوگوں کو نہ بلاتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب صفہ کی تعداد ۹۰ اور ۱۰۰ کے قریب قریب رہتی تھی۔ ان ہمہ وقتی طلبہ کے علاوہ بیرون مدینہ سے مختلف لوگ آتے تھے اور مختصر عرصہ قیام کر کے دین کا ضروری علم حاصل کرتے تھے۔

صفہ میں دی جانے والی تعلیم کی بنیاد، اساس اور روح قرآن مجید تھا۔ صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید ہی کے مدرسہ میں پڑھا، قرآن مجید ہی سے تربیت پائی اور قرآن مجید ہی ان کے سارے علم کی اصل تھا۔ خود قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کو تمام علوم کا جامع بتایا گیا ہے:

مَّا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ (۹)

''ہم نے اس میں کسی چیز کی کمی نہ رہنے دی۔''

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَاناً لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۰)

''ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کا تفصیلی بیان موجود ہے۔''

یعنی انسانیت کے وہ گر اس میں بتا دیے گئے ہیں جن کو سامنے رکھ کر انسان ہر چیز کو پرکھ سکتا ہے۔

امام شافعیؒ کا کہنا ہے کہ سارا اسلامی لٹریچر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور سنت کی بالواسطہ یا بلاواسطہ تشریح ہے اور خود سیرت و سنت قرآن مجید کی تشریح ہے۔ امام شافعیؒ کی اس رائے کی صداقت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے اور اس کے مختلف مضامین کا احاطہ کرنے کے لیے

امت مسلمہ نے جو جو فنون ایجاد کیے، ان کی تعداد قاضی ابوبکر بن العربیؒ نے ساڑھے چار سو سے زائد بتلائی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو مقدس ہستیاں خود صاحب قرآن اور مجسم قرآن سے قرآن پڑھتی ہوں گی، خود ان کو کیسے علوم حاصل ہوئے ہوں گے۔

جو اصحاب براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے تھے، وہ دس دس آیات پڑھتے تھے اور جب تک معانی و مطالب خوب ذہن نشین نہ ہو جاتے تھے، آگے نہ بڑھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے صرف سورۂ بقرہ کے خصوصی مطالعے پر چودہ سال صرف کیے۔ اس زمانے میں عرب میں خاص طور پر درسی کتابوں کا رواج نہ تھا۔ قرآن مجید اور سنت رسول کے مجموعے ہی بنیادی درسی کتابیں تھیں۔ ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر رسائل لکھے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن حزم انصاریؓ کو فقہ کی تعلیم کے لیے نجران بھیجا تو ان کے لیے ایک کتاب لکھوائی جس میں فرائض، سنن اور زکوٰۃ کے تفصیلی احکام درج تھے۔ اس طرح کا ایک مجموعہ حضرت علیؓ کے پاس بھی تھا۔ عہد نبوی میں اس طرح کے مجموعوں اور ان کے درس و تدریس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں جن کی کچھ تفصیل مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی کتاب ''تدوین حدیث''، ترکی کے ڈاکٹر فواد سیزگین کی جرمن تصنیف ''اسلامی علمی ورثہ کی تاریخ'' اور ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی فاضلانہ انگریزی تحریروں میں مل سکتی ہیں۔ بعض دوسرے علوم و فنون میں بھی کتابیں لکھے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ آخر زمانے میں زکوٰۃ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایتیں دی تھیں، ان کو باضابطہ لکھ کر مرتب کر لیا گیا تھا اور یہ حضرت عمرؓ کے خاندان میں محفوظ تھا اور وہیں سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کی نقل لی تھی۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا تھا، اس کو یمن کے ایک صحابی ابوشاہ کو لکھوا کر دیا گیا تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ سنتے تھے، بیٹھ کر لکھتے جاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف فرامین کو بھی صحابہ کرامؓ نے قلم بند کر لیا تھا تاکہ آگے چل کر ان سے شرعی مسائل مستنبط ہو سکیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں طلبہ کو باقاعدہ سند جاری کرنے کا رواج شروع نہیں ہوا تھا، لیکن مختلف صحابہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ مختلف علوم میں ان کی مہارت کو زبانی سند دربار رسالت سے

جاری ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ ان اصحاب سے ان کے اختصاصی علوم میں رجوع کریں۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرآن فہمی کی گواہی دی، حضرت عمرؓ کے مجموعی علم کی تعریف کی، علم فرائض علیٰ ہذا علم حساب میں حضرت زید بن ثابتؓ کی مہارت اور عدالتی امور میں حضرت علیؓ کی صلاحیتوں کو سراہا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کے بارے میں ارشاد ہوا کہ وہ حلال و حرام کا سب سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔

خالص دینی علوم کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے کے رائج الوقت مفید علوم کے سیکھنے کی نہ صرف ترغیب دلائی بلکہ خود اس کا اہتمام فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ نشانہ بازی، پیراکی، حساب، علم میراث، طب، علم الہیت، فلکیات، علم انساب اور علم تجوید کی تعلیم ضروری جائے۔ نشانہ بازی کے مقابلے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نگرانی میں کرایا کرتے تھے۔ ہدایت تھی کہ اپنے بچوں کو تیرنا اور نشانہ بازی ضرور سکھاؤ۔

ان امور کے لیے جس چیز کی ضرورت پڑتی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سیکھنے کے لیے کسی مناسب آدمی کو مقرر کر دیتے تھے۔ حضرت زید بن ثابتؓ، جنہوں نے صفہ میں ہی علم حاصل کیا اور جنگ بدر کے مشرک قیدیوں سے لکھنا سیکھا تھا، نہایت ذہین اور خوش خط تھے۔ علم فرائض اور حساب میں آپ کی مہارت کو خود سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے سراہا تھا۔ حضرت زیدؓ دربار رسالت کے گویا کاتب خاص تھے۔ معاہدات کا لکھنا اور دوسری رازدارانہ خط و کتابت آپ کے سپرد تھی۔ اپنے شوق سے مدینہ منورہ آنے جانے والے مسافروں سے فارسی اور حبشی زبانیں سیکھیں۔ ایک مرحلے پر جب یہ محسوس ہوا کہ عبرانی زبان جاننے والا کوئی قابل اعتماد شخص ہونا چاہیے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عبرانی بھی سیکھنے کا حکم دیا۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے چند ہفتوں کی قلیل مدت میں عبرانی زبان میں بھی مہارت حاصل کر لی۔

مدینہ منورہ میں صفہ واحد درس گاہ نہ تھی، بلکہ یہاں اور بھی بہت سی مسجدیں خود عہد نبوی میں موجود تھیں اور قرب و جوار کے لیے درس گاہ کا کام انجام دیتی تھیں۔ مدینہ منورہ سے چند میل دور قبا کی مشہور مسجد میں بھی ایک درس گاہ قائم تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقتاً فوقتاً اس کا معائنہ فرماتے

رہتے تھے اور اگر کوئی نامناسب بات دیکھتے تو فوراً منع کر دیتے تھے۔ دور دراز کے مقامات پر بھی جوں جوں اسلام پھیلتا جاتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم معلمین مقرر فرماتے جاتے تھے۔ مختلف قبائل کے وفود آ کر اسلام قبول کرتے تو واپسی میں ان کے ہمراہ کسی نہ کسی تربیت یافتہ اور تجربہ کار صحابی کو بھیج دیا جاتا تھا۔ ایک بار نجد کے علاقے میں تعلیم دینے کے لیے ۷۰ اہل علم صحابہ کی ایک جماعت بھیجی گئی جن کو مشرکین نے بیر معونہ کے مقام پر دھوکے سے شہید کر دیا۔ ان اہل علم صحابہ کی شہادت کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر صدمہ ہوا کہ آپ مسلسل ایک ماہ تک قنوت نازلہ پڑھتے رہے اور دشمنوں کو بددعا دیتے رہے۔

بعض اوقات کسی کو گورنر یا حاکم مقرر کرتے تو تعلیم کی ذمہ داریاں بھی ذاتی طور پر اس کے سپرد کی جاتی تھیں۔ عمرو بن حزم کو جب یمن کا گورنر مقرر کیا تو ان کو خاص طور پر تاکید کی کہ لوگوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ وغیرہ کی تعلیم کا بندوبست اور نگرانی کریں۔ طبری کے بیان کے مطابق یمن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ناظر تعلیمات بھی مقرر کیا تھا جس کا کام یہ تھا کہ مختلف اضلاع کا دورہ کر کے وہاں کی تعلیمات کی نگرانی کرتا رہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے علاقوں میں بھی ایسے ناظر تعلیمات مقرر کیے گئے ہوں۔

غزوہ بدر کے جو قیدی فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل نہ کر سکتے تھے، ان کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا کہ وہ دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں تو وہ چھوڑ دیے جائیں گے۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے اسی طرح لکھنا سیکھا تھا۔ باہر سے جو مہاجر آتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو انصار کے حوالے کر دیتے کہ وہ مہمان داری کے ساتھ ان کو قرآن پاک کی تعلیم بھی دیں۔ وفد عبدالقیس اور وفد بنی تمیم اور ایسے ہی کئی اور دوسرے وفود کے ارکان مدینہ منورہ میں رہ کر قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد کے امرا و عمال کو کتاب و سنت کی تعلیم دینے کا حکم دیتے اور اس کو ان کے لیے فرض قرار دیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن سعید بن العاصؓ کو خاص طور سے حکم دیا کہ مدینہ منورہ کے لوگوں کو لکھنا سکھائیں۔ علامہ سمہودی نے ''وفاء الوفاء'' میں تقریباً چالیس ایسی مسجدوں کا ذکر کیا ہے جو عہد رسالت میں مدینہ منورہ میں موجود

تھیں اور ان میں باقاعدہ تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کی تعلیم کا بھی پورا پورا بندوبست کیا۔ ہفتے میں ایک روز آپ نے خواتین کی خصوصی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مقرر فرمایا تھا جس میں آپ خود ان کے اجتماع میں جا کر ان کو تعلیم دیتے تھے۔ خود ازواج مطہرات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خصوصی نگرانی میں وہ تعلیم و تربیت دی جو اسلامی پردے کے احکام کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست دوسری عام خواتین کو نہیں دے سکتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خواتین کی تعلیم کا یہ سلسلہ ازواج مطہرات نے جاری رکھا۔ ازواج مطہرات میں علمی اعتبار سے حضرت عائشہ کو عظیم مرتبہ حاصل تھا۔ ان کو قرآن و سنت، فقہ، ادب، شاعری اور علم طب میں بڑا درک حاصل تھا۔ ازواج مطہرات کو خود تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ حضور اس کا بھی اہتمام کرتے تھے کہ دوسری پڑھی لکھی خواتین سے بھی ان کی تعلیم مکمل کرا دیں۔ چنانچہ ازواج مطہرات میں حضرت حفصہؓ اور ام سلمہؓ اس باب میں ممتاز حیثیت رکھتی تھیں۔ حضرت حفصہ کو خاص آنحضرتؐ کے حکم سے ایک تعلیم یافتہ خاتون شفاء بن عبداللہ عدویہؓ نے لکھنا اور پڑھنا سکھایا۔

ازواج مطہراتؓ میں سے حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کی زندگی طویل رہی، اس لیے ان دونوں امہات المومنین سے برابر علمی استفادہ کیا گیا۔ صحابہ کو جب بھی کسی معاملے میں اشکال ہوتا تو وہ حضرت عائشہؓ سے دریافت کرتے۔ دوسری صحابیہ خواتین بھی ان سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں۔ ایک صحابی ایسے ہی ایک موقع کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم لوگ مشہور صحابیہ خاتون ام درداءؓ کے ہاں گئے اور وہاں علمی گفتگو کرنے لگے۔ کافی دیر گزر گئی تو ہم نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے آپ کا بہت سا وقت لے لیا۔ انہوں نے جواب دیا: نہیں، بلکہ علمی مذاکرے سے بڑھ کر کوئی چیز مجھے محبوب ہے ہی نہیں۔

علمی مذاکرے اور مباحثے صحابہ اور صحابیات میں نہایت پسندیدہ اور ضروری سمجھے جاتے تھے۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ہم لوگ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درس سے فارغ ہوتے تھے تو آپس میں مذاکرہ ضرور کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہم لوگ پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ ہوتے تھے اور ہر شخص

باری باری دہراتا تھا۔ اس سے یہ کیفیت پیدا ہو جاتی تھی کہ جو پڑھا ہے، گویا وہ دل پر لکھا گیا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کا لحاظ فرماتے تھے کہ تعلیم دینے میں تدریج اور سہولت سے کام لیں۔ ایک بار ہی اتنا نہ پڑھاتے کہ لوگ یاد نہ رکھ سکیں اور اکتا جائیں۔ جن لوگوں کو معلم بنا کر باہر بھیجتے، ان کو بڑی تاکید فرماتے تھے کہ نرمی سے کام لینا، لوگوں کو مشکل میں مبتلا مت کرنا، لوگوں کو برگشتہ اور متنفر نہ کرنا بلکہ حوصلہ افزائی کرنا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام تفریح اور مردانہ کھیلوں کی طرف بھی پوری پوری توجہ دیتے تھے۔ گھڑ سواری، دوڑ، تیرنا، نیزہ بازی کی مشق، کشتی اور اس طرح کے کھیل جو ان دنوں رائج تھے، مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی اور سرپرستی میں کھیلے جاتے تھے۔ اول آنے والوں کو خود دربار رسالت سے انعامات بھی ملتے تھے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک بار گھڑ دوڑ میں حصہ لیا۔ گھڑ دوڑ کا انتظام حضرت علیؓ کے سپرد تھا۔

عہد نبوی میں جس نظام تعلیم کی بنا ڈالی گئی تھی، وہ خلافت راشدہ اور بالخصوص حضرت عمرؓ کے دور میں اپنی پوری ترقی کو پہنچا۔ حضرت عمرؓ نے تمام مفتوحہ ممالک میں بستی بستی اور گاؤں گاؤں قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام کیا، باقاعدہ تنخواہ دار اساتذہ مقرر کیے، بچوں کے لیے الگ مکتب یعنی پرائمری اسکول قائم ہوئے جہاں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے، شہ سواری وغیرہ کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ یہ تعلیم جبری تھی اور ہر شخص کے لیے لازمی تھی، حتیٰ کہ قیدیوں کو بھی جبراً پڑھایا جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک صاحب ابو عامر سلیم نوعمری میں جنگی قیدی بن کر آئے تھے اور جبری تعلیم پا کر بڑے محدث بنے۔ حضرت عمرؓ نے قرآن مجید کی بعض ضروری اور اہم سورتوں پر مشتمل ایک منتخب نصاب بھی مرتب کیا جس کی بابت حکم دیا کہ اس کا تفصیلی مطالعہ ہر شخص کے لیے ضروری ہوگا کیونکہ ان میں احکام و فرائض مذکور ہیں۔ حضرت عمرؓ کے دور میں بڑے بڑے شہروں میں قرآن مجید کی اعلیٰ تعلیم کے مراکز قائم ہوئے۔ شام کے تین بڑے شہروں دمشق، حمص اور فلسطین میں حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عبادہ بن صامتؓ اور حضرت ابو درداءؓ جیسے کبار صحابہ قرآن مجید کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے۔ حضرت ابو درداءؓ کے درس میں ہجوم کا یہ حال تھا کہ ایک روز شاگردوں کی تعداد شمار کرائی گئی تو سولہ سو

(۱۶۰۰) ان کے حلقہ درس میں موجود تھے۔ وہ فجر کے وقت دس دس طالب علموں کی جماعت بنا کر اپنے کسی تجربہ کار فارغ التحصیل شاگرد کی نگرانی میں دے دیتے تھے اور خود ٹہلتے جاتے اور پڑھنے والوں کی طرف کان لگائے رہتے تھے۔ جب کوئی طالب علم پورا قرآن مجید یاد کر لیتا تو براہ راست حضرت ابودرداءؓ کی شاگردی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے لگتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں عربی زبان وادب کو بھی لازمی مضمون کی حیثیت دی گئی۔ اس کے علاوہ فقہ کی اعلیٰ تدریس کے لیے چند اہل علم صحابہ کو بڑی تعداد میں حضرت عمرؓ نے مختلف شہروں میں مامور کیا۔ فقہ کی تدریس کے لیے بعض صحابہ کو تنخواہیں بھی دی جاتی تھیں۔ ابومسلم خولانی کا بیان ہے کہ حمص کی جامع مسجد میں تیس بڑے بڑے صحابہ فقہ کا درس دیتے تھے۔ ان میں جب کوئی اختلاف یا شک پیدا ہوتا تو حضرت معاذ بن جبلؓ کی طرف رجوع کرتے تھے جو گویا اس شریعت فیکلٹی کے سربراہ تھے۔

ان انتظامات کے ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ بازار میں کوئی ایسا شخص کاروبار نہ کرے جو علم فقہ نہ جانتا ہو۔ حضرت عمرؓ ایسے لوگوں کو سزا دیتے تھے جو فقہ نہ جاننے کے باوجود بازار میں بیٹھیں۔ اس طرح آپ نے بازاروں کو تجارت گاہوں کے ساتھ ساتھ درس گاہیں بھی بنا دیا جہاں لوگ باتوں باتوں میں فقہ سیکھتے جاتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں علم جغرافیہ کی خصوصی تربیت کے بھی شواہد ملتے ہیں۔ وہ مختلف مفتوحہ ممالک کے جغرافیائی سروے کرنے کے لیے ماہرین کی جماعتیں بھیجتے رہتے تھے۔ اس طرح کی ایک سروے رپورٹ حضرت عمرو بن العاصؓ نے بھیجی تو وہ اس قدر جامع اور تفصیلی تھی کہ حضرت عمرؓ پکار اٹھے: اے عاص کے بیٹے، خدا تم کو جزائے خیر دے، تم نے تو ایسی رپورٹ بھیجی ہے جیسے کہ میں خود مصر کو دیکھ رہا ہوں۔ عرصہ ہوا مشہور فرانسیسی اخبار لہ فگارو نے اس رپورٹ کا ترجمہ شائع کیا تھا اور لکھا تھا کہ اس کو بلاغت، جامعیت اور واقفیت کے ایک اعلیٰ نمونے کے طور پر تعلیمی اداروں کے لازمی مطالعہ میں شامل کیا جائے۔ حضرت علیؓ کے دور میں عربی گریمر کے اصول بھی آپ کی ذاتی نگرانی میں مرتب ہوئے اور غیر عرب طلبہ کے لیے نصاب تعلیم میں ایک نئے مضمون کا اضافہ ہوا۔

اکیسویں صدی کے تعلیمی تقاضوں پر گفتگو اور غور وخوض کے لیے اس تمہید کے ساتھ ساتھ یہ بھی

ضروری ہے کہ ہمارے سامنے بیسویں صدی کے تعلیمی تجربے کا پورا نقشہ موجود ہو اور ہم اس تجربے کے تمام مثبت اور منفی پہلوؤں کا کامل شعور رکھتے ہوئے مستقبل کی تصویر گری کریں۔ ماضی سے صرف نظر کر کے نہ حال کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کی جا سکتی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:

سرزند از ماضئ تو حال تو
خیزد از حال تو استقبال تو
مشکن ار خواہی حیات لازوال
رشتہ ماضی واستقبال وحال

بیسویں صدی میں نہ صرف مسلمانان برصغیر بلکہ مسلمانان عالم کے تعلیمی تصورات ونظریات ایک بڑی تبدیلی بلکہ قلب ماہیت کے عمل سے گزرے ہیں۔ دینی تعلیم کی سابقہ ضروریات اور تقاضے اب اس دور میں غیر متعلق قرار پائے، قدیم فنی تعلیم کو نئی سائنس اور ٹیکنالوجی نے شکست دے دی، مسلمانوں کے روایتی اجتماعی اور انسانی علوم کو نئے حقائق کے پیش نظر از کار رفتہ سمجھ لیا گیا، نئی سائنسی تعلیم جس سے کسی قدر خیر اور مثبت پیش رفت کی امید تھی، مسلمانوں کے لیے شجر ممنوعہ قرار پا گئی۔ گویا بیسویں صدی قدیم نظام ہائے تعلیم کی مکمل شکست وریخت اور نت نئے تعلیمی تجربات کی صدی ہے، لیکن بیسویں صدی کے نصف اول میں کیے جانے والے تعلیمی تجربات میں جو چیز سب سے نمایاں اور قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے کسی بھی عنصر کا فقدان تھا۔ حتیٰ کہ خود علی گڑھ کالج میں، جو مسلمانوں میں مغربی تعلیم کے فروغ کی خود مسلمانوں کی طرف سے پہلی کامیاب اور سنجیدہ کوشش تھی، عرصہ دراز تک سائنس اور ٹیکنالوجی کو بازیابی حاصل نہ ہو سکی اور سرسید کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا کہ ہمارے دائیں ہاتھ میں فلسفہ ہو، بائیں ہاتھ میں سائنس ہو اور سر پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ کالج کے قیام سے لے کر نصف صدی سے زائد عرصہ تک وہاں مغربی فلسفہ، انگریزی ادبیات، قانون اور اجتماعی علوم کا ہی غلغلہ رہا۔ علی گڑھ نے مغربی افکار اور مغربی

تہذیب کے تو کئی اچھے شارح اور مبصر پیدا کیے، لیکن کوئی قابل ذکر سائنس دان نہ پیدا کیا۔ یہی حال خالص دینی علوم کا رہا۔ نہ صرف علی گڑھ بلکہ کسی بھی جدید درس گاہ نے دینی علوم و معارف کے ایسے متخصصین پیدا نہیں کیے جن کی علمی بصیرت اور دینی راہنمائی پر عامۃ الناس بھروسہ رکھتے ہوں۔ گزشتہ سو سال کے دوران برصغیر کی قریب قریب تمام دینی شخصیات کی بنیادی فکری تشکیل اور مذہبی ساخت قدیم طرز ہی کے اداروں میں قدیم طرز ہی کے علما کے ہاتھوں ہوئی۔ برصغیر میں عامۃ الناس کی دینی زندگی پر بھی جن اہل علم کے اثرات نمایاں رہے ہیں، ان سب کی دینی تربیت قدیم طرز ہی کے علما کی مرہون منت رہی۔ لیکن قدیم دینی تعلیم کی اس غیر معمولی اثر انگیزی کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ دینی تعلیم کے ادارے علمی اور فکری میدانوں میں تیزی سے اپنی معنویت کھوتے چلے جا رہے ہیں۔ بلاشبہ انہوں نے عامۃ الناس کی اسلام سے جذباتی وابستگی برقرار رکھنے میں بے مثال کردار کا مظاہرہ کیا ہے، لیکن اس تکلیف دہ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دور جدید کے فکری اور علمی سرمایے اور اس کے اثرات میں ایک طوفان بلاخیز کی سی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور قدیم دینی روایت نے اس کے آگے بند باندھنے میں کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں کی۔ جن دینی شخصیات کو اس باب میں کچھ کامیابی حاصل ہوئی، وہ خالص دینی روایت کے سو فیصد نمائندہ نہیں کہے جا سکتے۔

اجتماعی اور انسانی علوم کی سطح پر دیکھیے تو قدیم تعلیمی روایت کی سپر اندازی اور جدید مغربی تصورات کی اثر انگیزی کی رفتار اور بھی زیادہ حیرت انگیز نظر آتی ہے۔ آج اجتماعی اور انسانی علوم کی اصطلاح کا مطلب ہی مغرب کے اجتماعی اور انسانی علوم کا تصور ہے۔ آج یہ بات بیشتر تعلیم یافتہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو چکی ہے کہ اجتماعی اور انسانی علوم میں مسلمانوں کی شاندار روایات کیا ہیں۔ تاریخ کا اسلامی تصور، اجتماعی اخلاقیات کی بابت قرآنی اصول و ہدایات، قوموں کے عروج و زوال کے الٰہی احکام، منطق استقرائی، علم حضوری بمقابلہ علم حصولی اور اس طرح کے دوسرے بہت سے میدانوں میں اسلامی تعلیم اور مسلم اہل دانش کی کاوشوں سے آج کا تعلیم یافتہ طبقہ بڑی حد تک ناآشنا ہے۔ مغرب کی سائنس اور ٹیکنالوجی کو نظر انداز کر کے وہاں کے سیکولر اور مادہ پرستانہ اجتماعی اور انسانی علوم کو جوں کا توں بغیر کسی تنقیدی رویہ کے دل و جان سے اپنا لینے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج کے بیشتر

تعلیم یافتہ حضرات فکری لحاظ سے سیکولر اور طرز عمل کے اعتبار سے غیر شعوری پر مادہ پرست بن چکے ہیں۔ زبانی اعلانات اور جذباتی اظہار کی حد تک اسلام سے وابستگی بھی وقت کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ بنیادی طور پر یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل سے مغربی افکار و نظریات کی بنیاد دو چیزوں پر رہی ہے:

۱۔ سیکولر اور لادینیت، یعنی مذہب اور اجتماعی زندگی کی علیحدگی کا تصور۔

۲۔ نظریہ ارتقا جس کی ڈارونی تفصیلات نے اخلاق و مذہب کی رہی سہی بنیاد کو بھی ڈھا دیا۔

ان دونوں بنیادوں نے مغرب کے اجتماعی اور انسانی علوم کے مزاج اور انداز کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا بھر میں تعلیم کا سارا تصور، علوم کا سارا دھارا اور افکار و نظریات کا پورا مزاج سیکولر اور لامذہبی ہو کر رہ گیا ہے۔ نہ صرف مغربی ممالک میں بلکہ بیشتر مشرقی ممالک میں (چند ایک کے جزوی استثنا کے ساتھ) نظام تعلیم کا اصل وظیفہ یہ رہ گیا ہے کہ مغرب کی فکری بالادستی اور تہذیبی امامت اور سیاسی و اقتصادی بالادستی کے تسلسل اور بقا کے لیے کام کرتی رہیں، وہ تہذیبی امامت جو مغرب نے گزشتہ دو سو سالہ استعماری دور میں قائم کی ہے۔

یہ صرف مغرب کے ساتھ ہی خاص نہیں، دنیا کے ہر بڑے اور قابل ذکر نظام تعلیم نے ہمیشہ اس تہذیب اور تمدن و ثقافت کو پروان چڑھانے میں مقدمۃ الجیش کا کردار ادا کیا ہے جس میں اس نظام نے جنم لیا ہو۔ دنیا کی ہر زندہ قوم اپنے نظام تعلیم کو اس طرح مرتب کرتی ہے کہ اس کے نتیجے میں جو نسل پروان چڑھ سکے اور جو قوم تیار ہو سکے، وہ اس نظریے کی علمبردار، اس تہذیب پر کاربند اور اس تمدن کی نقیب ہو جس کے تحفظ کے لیے وہ نظام تعلیم ترتیب دیا جاتا ہے۔ دور جدید میں مغرب کے تعلیمی تصورات کے بارے میں بڑی مرعوبیت اور سادہ لوحی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ نظریہ اور اخلاق کے بارے میں غیر جانب دار ہیں، حالانکہ تھوڑے سے تامل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ مغرب کا سارا نظام تعلیم (اپنے اندرونی تنوع اور داخلی اختلاف کے باوجود) ایک معاملے میں یکسو ہے اور وہ مغربی تہذیب و تمدن کی موجودہ اساس (سیکولرازم اور آزاد معیشت) ہے جس کے بارے میں وہاں کوئی نرمی یا مداہنت نہیں پائی جاتی۔ یہ بات کہ مغربی علوم و فنون کی ساخت

مادہ پرستانہ اور لادینی ہے، یوں تو دور جدید کے تمام علوم وفنون پر صادق آتی ہے، لیکن اس مرض بلکہ سرطان کا سب سے زیادہ شکار اجتماعی اور انسانی علوم ہوئے ہیں۔ یہاں ان تمام علوم کا الگ الگ مفصل جائزہ تو دشوار ہے، تاہم بات واضح کرنے کے لیے دو ایک مثالیں دینا بے محل نہ ہوگا۔

سوشل سائنسز اور انسانیات کے دائرے میں آج کے مقبول علوم میں معاشیات اور بشریات یعنی انتھروپالوجی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آج کے مغربی علم معاشیات کا آغاز ان تصورات اور تجارتی رواجات سے ہوا جو یورپ میں صنعتی انقلاب کے دوران پیدا ہوئے۔ آزاد تجارت، سودی کاروبار، غیر محدود نفع اندوزی، پیداوار کی وسعت اور صرفی معاشرے کا فروغ، یہ وہ چند بنیادی عناصر ہیں جن سے جدید معاشی فکر نے جنم لیا ہے۔ یہ جدید معاشی فکر جس کا زور وشور سے یہ دعویٰ ہے کہ وہ اقدار کے معاملے میں غیر جانب دار اور لااقداری یعنی Value neutral or amoral ہے، اسلامی اقدار وتصورات سے جگہ جگہ متصادم ہے۔ اول تو اقدار کے معاملے میں غیر جانب دار ہونا ہی اسلام سے انحراف کا پہلا قدم ہے۔ دوسرے یہ دعویٰ بھی محل نظر ہے کہ جدید معاشی فکری لااقداری ہے۔ اس فکر کے بنیادی عناصر کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بے شمار اقدار شر اور عناصر مادیت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

اس مادہ پرستانہ معاشیات نے جو ذہن اور مزاج بنایا ہے، اس کا سب سے بڑا نقصان ایک بالغ نظر مفکر کی رائے میں یہ ہے کہ اس سے نہ صرف انسان پر سرمایہ کی فوقیت قائم کر دی گئی ہے، بلکہ پورے معاشی نظام اور تجارتی سرگرمی کو اس طرح مرتب کر دیا گیا ہے کہ اس میں انسان کی حقیقی ضروریات، انسان کا مقام ومرتبہ اور انسان کی اعلیٰ اخلاقی اور بہتر روحانی ضروریات تو دور کی بات ہے، انسان کی بحیثیت انسان خالص جسمانی اور فطری ضروریات کی تکمیل بھی ایک ثانوی درجے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس فکر میں سرمایے کو صرف سرمایہ کھینچتا اور بڑھاتا ہے۔ مغرب کی مادہ پرستانہ معاشیات کے فروغ اور انسان پر سرمایے کی فوقیت نے جو بے شمار منفی نتائج پیدا کیے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ سود کی لعنت۔

۲۔ارتکاز دولت۔

۳۔معاشرے کی طبقات میں تقسیم۔

۴۔معاشرے کے ناداروں اور حاجت مندوں، قرآن کی بلیغ اصطلاح میں مستضعفین کی تعداد میں روز افزوں اضافہ۔

۵۔دولت کے اجارہ داروں اور قرآن کی بلیغ اصطلاح میں مترفین کی تعداد، قوت اور اثر ورسوخ میں اضافہ۔

۶۔کمزور اور زیردست اقوام کو دستیاب ذرائع پیداوار کا نامکمل اور ناکافی استعمال۔

۷۔بالادست اور بااثر اقوام کو دستیاب دولت اور ذرائع پیداوار کا مزید دولت اور مزید ذرائع پیداوار کے حصول کے لیے استعمال۔

۸۔معاشرے کی خالص اخلاقی، روحانی، فکری، تمدنی اور تہذیبی ضروریات کے لیے وسائل کا کم سے کم استعمال اور ان مقاصد کے لیے پہلے سے موجود سرمایے کی حتی الامکان واپسی اور بازخواست۔

۹۔اس آخری نتیجے کا مزید نتیجہ یہ نکلا کہ اب تعلیم اور صحت، دونوں کو تجارت بنا دیا گیا ہے۔اب معاشرے کی یہ دونوں بنیادی ضروریات جو اسلامی تعلیم کی رو سے فرض عین اور فرض کفایہ کا درجہ رکھتی ہیں، صرف کاروبار اور تجارت کا موضوع بن گئی ہیں۔جس طرح ماضی میں لوگ تجارت میں سرمایہ کاری کیا کرتے تھے اور نفع کے امیدوار رہتے تھے، اسی طرح آج تعلیم اور صحت کے میدانوں میں سرمایہ کاری کی جاتی ہے اور نتیجے میں دیکھتے ہی دیکھتے یہ کاروبار کرنے والے کروڑوں بلکہ اربوں کے مالک بن جاتے ہیں۔اب یہ وبا مسلم معاشروں میں بھی پھیلتی جارہی ہے جہاں ایک زمانے میں تعلیم اور صحت کی فیس یا معاوضہ لینا ایک گھناؤنا انسانی جرم سمجھا جاتا تھا۔آج بھی پاکستان کے خالص دینی اداروں کی تعلیم بالکل مفت ہے۔آج بھی قدیم طرز کے اطبا کی بڑی تعداد مریض کو دیکھنے کی کوئی فیس وصول نہیں کرتی۔خود ہمارے اسی ملک میں سعید ملت حکیم محمد سعید مرحوم نے پچاس سال کے دوران قریب قریب نوے لاکھ مریضوں کا علاج کیا، لیکن کسی سے ایک پیسہ بھی فیس وصول نہیں کی۔

۱۰۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اب مذہب بھی سامان تجارت بننا شروع ہو گیا ہے۔

چہ ملائی چہ درویشی چہ سلطانی چہ دربانی
فروغ کار می جوید بسالوسی ورزاقی

ہم گزشتہ ایک سو چونسٹھ سال سے اپنی بیشتر کاوشیں، سرگرمیاں، توانائیاں اور وسائل ان علوم کو پڑھنے پڑھانے میں صرف کر رہے ہیں۔ ہماری ساری تعلیمی کوششیں اور وسائل واسباب ابھی تک عملاً اسی ہدف کے حصول کے لیے استعمال ہو رہے ہیں جو ۱۸۳۴ء میں میکالے نے طے کر دیا تھا، یعنی ایک ایسی نسل کی تیاری جو یہاں کے کروڑوں باشندوں اور انگریزوں (اب امریکیوں) کے درمیان ترجمانی کا فریضہ انجام دے سکے، ایسی نسل جو رنگ ونسل میں تو ہندوستانی (اب پاکستانی) ہو اور رائے اور ذوق اور مزاج ومذاق میں برطانوی (اب امریکی) ہو۔

اس روایت کے مطابق جو نسلیں تیار ہوئی ہیں، ان میں سے بعد میں آنے والی ہر نسل کا رویہ اپنے سے پہلی نسلوں کے مقابلے میں مشرقی تہذیب سے دوری اور مشرقی زبانوں سے بے خبری کی وجہ سے روز بروز معاندانہ اور تمسخرانہ ہوتا چلا گیا ہے۔ من جھل شیئاً عاداہ کی قدیم عربی ضرب المثل کے مصداقات اس طبقے میں بہ کثرت روز نظر آتے ہیں۔ اس طبقے کی ہرنئی پود پہلے سے زیادہ انگریز یا امریکی بننے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ اس طبقے کے نزدیک مشرقی علوم اور مشرقی زبانوں کو تو عرصہ ہوا اچھوت کا درجہ حاصل ہو چکا، اب مذہب کی باری معلوم ہوتی ہے۔ حال ہی کے ایک سروے کے مطابق مغربی ماحول میں تعلیم پانے والی "مسلمان" نوجوان نسل کی ایک خاصی تعداد اپنے کو لامذہب اور ملحد قرار دیتی ہے۔ چند ماہ قبل ایسا ایک سروے امریکہ میں کیا گیا جہاں اسی نوے لاکھ مسلمان بستے ہیں۔ اس سروے کی رو سے کم وبیش ایک تہائی "مسلم" نوجوانوں نے اپنے آپ کو لامذہب اور ملحد ٹھہرایا۔

تعلیم کی قلم رو سے مذہب واخلاق کی ملک بدری کے ابتدائی اثرات کا اندازہ علامہ اقبال نے آج سے کم وبیش ۷۰،۸۰ قبل کر لیا تھا۔ اس وقت تک یہ وبا صرف یورپ تک محدود تھی اور مسلم ممالک کافی حد تک اس سے آزاد تھے۔ علامہ اقبال نے تعلیم میں مذہب کو ایک موثر عنصر کی حیثیت سے

شامل کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا تھا:

''مذہب قوم میں ایک متوازن سیرت پیدا کرتا ہے جو حیات ملی کے مختلف پہلوؤں کے لیے بیش بہا سرمایے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بحیثیت مجموعی یورپ نے اپنے باشندوں کی تعلیم وتربیت میں سے مذہب کا عنصر حذف کر دیا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس بے لگام انسانیت کا حشر کیا ہوگا۔''

مسئلہ محض مذہب واخلاق کی زبوں حالی اور لادینیت کے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے عفریت کا ہی نہیں، خالص مادی ضروریات کی تکمیل کا بھی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مغربی افکار ونظریات میں رچی بسی اور مغربی علوم وفنون سے آراستہ اس نسل نے ملک وملت کو کسی مادی ترقی سے واقعتاً ہم کنار کر دیا ہے؟ کیا تعلیم کی اس ہمہ ہمی نے سچ مچ ہمیں اقوام عالم کی صف میں کھڑا کر دیا ہے جس کا سبق روز اول سے نئی نسل کو سکھایا جاتا ہے؟ افسوس کہ ان سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ مزید دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ خالص مادی مفادات کی میزان میں بھی یہ سودا ہلکا ہی ہے۔

تعلیم یافتہ بلکہ ڈگری یافتہ بیکاروں کی آج نسلیں کی نسلیں ہمارے مسائل میں روز بہ روز اضافے کا سبب بن رہی ہیں۔ بے روزگاری آج ہمارے معاشی مسائل ومشکلات کی فہرست میں نمایاں مسئلہ بلکہ شاید ام المسائل کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی بے کاری بلکہ بہت سی صورتوں میں معاشرے کے لیے بے مصرفی صرف برصغیر پاک وہند کا ہی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ تیسری دنیا کے ان تمام ممالک کو یہی صورت حال درپیش ہے جنھوں نے مختلف مغربی ممالک کے سوشل سائنسز کو جوں کا توں اختیار کر کے اپنے ہاں نظام تعلیم کی اساس بنا رکھا ہے۔ اب جبکہ برسہا برس کے بعد یہ احساس پیدا ہونا شروع ہوا ہے کہ اس تعلیم اور حقائق زندگی اور ضروریات زندگی کے مابین مطابقت کی بڑی کمی ہے تو اس کا جو حل سمجھا یا جارہا ہے، وہ اعلیٰ تعلیم کی راشننگ، سیلف فائنانسنگ اور ایسی ہی تدابیر کی شکل میں ہے۔ اس پورے عمل کی افادیت پر از سر نو غور کر کے اس میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی ضرورت کا ابھی احساس عام نہیں ہوا۔ آخر ہم اس پر غور کیوں نہیں کرتے کہ ہمارے ہاں تعلیم بالغاں کی ساری اسکیمیں کیوں ناکام ہوتی ہیں؟ دیہات کے بچوں کی بڑی تعداد سرکاری اسکولوں سے کیوں بھاگتی ہے؟ خواتین کی بڑی تعداد اس تعلیم کے حصول سے کیوں

تنفر ہے؟ اس ناکامی، اس فرار اور اس تنفر کی ایک بڑی وجہ اس تعلیم کا غیر عملی، غیر حقیقی اور غیر افادی ہونا بھی ہے۔ چولستان کا ایک صحرائی باشندہ، ہزارہ کا ایک کوہستانی یا سندھ کے دیہات کا ایک کسان اپنے بچوں کو انگریزی زبان میں کتا، بلی، بھیڑیے اور خنزیر کے ناموں سے واقف کرا کے آخر کیا حاصل کرے گا اور کون سی مادی ترقی حاصل کر لے گا؟ اس بے مصرف تعلیم کا فوری نتیجہ اس کے نزدیک یہ نکلتا ہے کہ بچہ کھیت پر کام کرنے سے بھی جاتا ہے اور کچھ اور کرنے کے قابل بھی نہیں بنتا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم عملی نتائج کے اعتبار سے استعماری نظام تعلیم نے برصغیر کے لوگوں کو بالعموم اور یہاں کے مسلمانوں کو بالخصوص تعلیم سے محروم (Diseducate) کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ ملک کے ایک مشہور فاضل نے اپنی ایک تقریر میں ایک تعلیمی رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ انیسویں صدی کے اوائل میں پنجاب جیسے نسبتاً دور افتادہ صوبہ میں خواندگی کی شرح مجموعی طور پر چوراسی فیصد اور مسلمانوں میں سو فیصد تھی، لیکن جدید تعلیم اور جدید تہذیب کی بارآوری کے سارے دعاوی کے باوجود جب سوا سو سال کے بعد ۱۹۴۷ء میں انگریز یہاں سے رخصت ہوا تو پنجاب کے مسلمانوں میں خواندگی کی شرح صرف چار فیصد رہ گئی تھی۔ گویا جس تعلیم و ترقی کا چرچا سو سال جاری رہا، اس کا ماحصل قوموں کو تعلیم سے محروم کر کے صرف وفاداروں اور چاپلوسوں کا طبقہ پیدا کرنا تھا۔

ان گزارشات کا یہ مطلب قطعاً نہ لیا جائے کہ یہاں تمام مغربی علوم وفنون کی افادیت سے انکار کیا جا رہا ہے۔ بلاشبہ بہت سے مغربی علوم وفنون ایسے ہیں کہ جن کی افادیت سے انکار کرنا واقعہ اور حقیقت کا انکار کرنے کے مترادف ہے۔ یہاں جو بات کہی جا رہی ہے، وہ یہ ہے کہ اول تو جن علوم وفنون میں واقعتاً افادیت تھی، ان سے اکثر و بیشتر یہاں کے لوگوں کو محروم رکھا گیا۔ دوسرے جو علوم وفنون رائج کیے گئے، ان کو جوں کا توں بلاتنقید مسلمانوں میں رائج کر دینے سے بہت سے منفی اور خطرناک نتائج پیدا ہوئے۔

یہاں علم طب (ایلوپیتھی) کے بظاہر خالص فنی اور مفید علم کی مثال دینا غیر موزوں نہ ہوگا۔ بلاشبہ مغربی ایلوپیتھی نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ سرجری اور جراحی کے میدانوں میں مغربی ماہرین کی حالیہ کامیابیاں تبریک وتحسین کی مستحق ہیں، لیکن یہ ساری کامیابیاں بیشتر بیسویں صدی کے ربع آخر

میں سامنے آئی ہیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں مغربی ایلوپیتھی کہاں کھڑی تھی؟ اس کے مقابلے میں چار ہزار سال پرانی آیورویدک اور ڈھائی ہزار سال پرانی طب یونانی اس وقت کس مقام پر فائز تھی؟ اس فرق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذرا اس نقصان کا اندازہ لگایئے جو ایلوپیتھی کو برصغیر میں سرکاری سرپرستی میں رائج کرنے اور یہاں کی مقامی طبی روایات کو نظر انداز کر دینے بلکہ کچل دینے کے نتیجے میں بھگتنا پڑا۔ طب کی تعلیم کے قدیم ادارے ایک ایک کر کے بند ہونا شروع ہو گئے، خدمت خلق کے خالص اسلامی تصور پر مبنی طبی روایات نے ایک ایک کر کے دم توڑنا شروع کر دیا، قدیم طبی تجربات اور معالجات پر تحقیق اور تجربہ کا عمل رک گیا اور اطبا نے نوابوں اور درباروں سے وابستگی ہی میں اپنی بقا دیکھی۔ درباروں سے وابستگی کی وجہ سے طب کی ترجیحات بھی بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئیں۔

اس کے برعکس اگر برصغیر کے لوگ ایلوپیتھی پر اس طرح نہ ٹوٹتے بلکہ اس کے مثبت پہلوؤں سے استفادہ کرتے اور نئے تحقیقی اسالیب سے کام لے کر قدیم طب کو ترقی دیتے تو آج کم از کم طب کے میدان میں تو وہ یقیناً مغرب سے آگے ہوتے۔ آخر جس ابن سینا، جس رازی اور جس ابن بیطار کی کتابوں سے استفادہ کر کے اہل مغرب نے ایلوپیتھی کو ترقی دی، اسی ابن سینا، اسی رازی اور اسی ابن بیطار کی قوم کیسے پیچھے رہ سکتی تھی اگر وہ اسی ناقدانہ اور مجتہدانہ بصیرت سے کام لیتی جو ان ائمہ طب کا طرۂ امتیاز تھی؟

بیسویں صدی کی یہ تعلیمی صورت حال تھی جس کے ردعمل کی تاریخ ہی دراصل برصغیر میں تعلیمی فکر کی تاریخ ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مغربی فکر کا تنقیدی جائزہ اور ایک نئی اسلامی فکر کی تدوین و تشکیل وہ میدان ہے جہاں برصغیر کے اہل علم کا کام دنیائے اسلام میں سب سے نمایاں ہے۔ گہرائی اور تنوع میں برصغیر کی تعلیمی فکر کا درجہ دنیائے اسلام میں سب سے بلند اور سب سے نمایاں ہے۔ یہاں علم اور تعلیم کے باب میں خالص فکری کام بھی بہت ہوا ہے اور عملی تجربات بھی بڑی تعداد میں کیے گئے۔

برصغیر کے نمایاں مفکرین جنہوں نے جدید مغربی نظام تعلیم پر ناقدانہ نظر ڈالی، ان میں اکبراِلٰہ

آبادی، علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ ان حضرات نے نہ صرف مغرب سے درآمد شدہ تعلیمی نظریات وتصورات کے تنقیدی مطالعہ کی نئی نئی جہتیں کھولیں بلکہ مستقبل کے مسائل کی پیش بینی کر کے آئندہ کی راہیں بھی سجھائیں۔ یہاں ان سب حضرات کے تعلیمی افکار کا جائزہ لینا تو مقصود نہیں ہے کہ یہ ایک مستقل بالذات تصنیف بلکہ تصانیف کا متقاضی موضوع ہے، البتہ ان حضرات نے مغربی تعلیمی نظام پر جو عمومی تبصرہ کیا ہے، اس کی چند مثالیں بیان کرنا بے محل نہ ہوگا۔

اکبرالہ آبادی کو جدید دنیائے اسلام کی تاریخ کا شاید وہ پہلا بالغ نظر مفکر قرار دیا جا سکتا ہے جس نے مغربی فکر اور مغربی تہذیب وتمدن کی چکاچوند سے ذرہ برابر مرعوب ہوئے بغیر مغربی افکار کا گہری تنقیدی بصیرت سے جائزہ لیا اور اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو الگ الگ کر کے دکھایا۔ اکبر الہ آبادی نے خاص طور پر مغربی فلسفہ، تصور تعلیم اور نظریہ علم کو اپنی خصوصی توجہ کا موضوع بنایا۔ ان موضوعات پر ان کے بلیغ اور عمیق اشعار میں ایسے تیکھے تبصرے کیے گئے ہیں جن سے مغربی فکر کے کمزور پہلو واضح ہو کر سامنے آ جاتے ہیں۔

اکبرالہ آبادی اور ان کے جلیل القدر نیازمند اور معاصر علامہ اقبال دونوں کے کلام میں عقل اور دل دو ذرائع علم کی علامتیں ہیں۔ عقل سے مراد وہ خالص مادہ پرستانہ اور عقلی علم ہے جس کو روحانیت اور انسان کی روحانی ضروریات وحاجات سے کوئی علاقہ نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں دل یا قلب سے مراد وہ گہرا روحانی شعور ہے جس کی اساس وحی الٰہی اور انسان کے اعلیٰ روحانی جذبات واحساسات پر ہو۔ اکبرالہ آبادی کے نزدیک خالص عقل اور علم انسان کو حیرت اور شک میں مبتلا کر سکتا ہے، اس کو کوئی دیرپا سکون اور قلبی اطمینان عطا نہیں کر سکتا۔ کہتے ہیں:

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا
دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل اور علم وتجربہ کے ساتھ ساتھ دل اور روحانیت کے تقاضوں کو کس طرح سمجھایا جائے۔ ظاہر ہے کہ نہ عقل سے استغنا برتا جا سکتا ہے اور نہ اکبر عقل کو نظر انداز

کرنے کے قائل ہیں۔ وہ صرف عقل وقلب کے تقاضوں میں توازن پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ عقل کے ساتھ قلب کا عنصر شامل کرنے کے لیے روحانی تربیت اور فرد کی دینی تشکیل ضروری ہے۔ یہ مقصد اہل دین اور اہل دل کی صحبت اور تربیت سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

نہ کتابوں سے نہ کالج نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اکبر الٰہ آبادی کو بڑی شدت سے اس امر کا احساس تھا اور وہ زندگی بھر اس کا اظہار بھی کرتے رہے کہ جدید مغربی تعلیم اپنے مزاج اور اٹھان کے اعتبار سے لادینی اور لامذہبی ہے۔ انہوں نے جابجا اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ اس تعلیم کے نتیجے میں جو نسل تیار ہوگی، وہ لامذہب اور اسلامی عقائد سے بے بہرہ ہوگی۔ وہ بار بار اپنے قارئین کو متنبہ کرتے ہیں کہ وہ جدید تعلیم کے مذہب شکن نتائج سے ہوشیار رہیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی زوائد پر
گرا کے چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

ان کو اس بات کا [illegible] تھا کہ علما اور دینی طبقوں کی صف اول کے لوگ اپنی روایات چھوڑ کر مغربی ثقافت اور تمدن کے علم بردار بنتے جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں:

فکر دنیا نے بھلایا سب وہ قرآن وحدیث
مولوی بھی محو قانون ونظائر ہو گیا

اکبر یہ سمجھتے تھے کہ مغربی نظام تعلیم محض چند نئے علوم وفنون کی تدریس کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک مستقل بالذات ثقافت کا نقیب، ایک نئی تہذیب کا منادا اور ایک نئے تمدن کا علم بردار ہے۔ ان کو اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ جیسے جیسے مغربی تعلیم کے نتائج سامنے آتے جائیں گے، مسلمانوں کی اجتماعی اور ملی زندگی کے اجزا ان کے اپنے ہاتھ سے نکلتے جائیں گے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

علوم ان کے زبان ان کی پریس ان کے لغات ان کے
ہماری زندگی کے سارے اجزا پر ہیں ہات ان کے

ستم بالائے ستم یہ کہ اس ساری نیازمندی، اس مکمل خودسپردگی اور اس کامل سپراندازی کے باوجود اہل مغرب نے اپنے وہ علوم وفنون جن پر ان کی ترقی کا دارومدار تھا، یعنی سائنس کے اعلیٰ مضامین اور ٹیکنالوجی کے اونچے فنون، اپنے تک ہی محدود رکھے اور اہل مشرق کو ان کی ہوا تک نہیں لگنے دی۔ اہل مشرق کے لیے صرف انگریزی زبان اور مغربی ادبیات، لسانیات، قانون، اجتماعی علوم اور فلسفہ وغیرہ ہی کے ابواب وا تھے۔ بقیہ علوم وفنون کے دروازے ان کے لیے پہلے بھی بند تھے اور آج بھی بند ہیں۔ اکبر نے اس پہلو کی طرف لطیف اور ظریفانہ اشارے کیے ہیں:

علم پورا ہمیں سکھائیں اگر
تب کریں شکر مہربانی کا

اس بے مصرف علم کی نشرواشاعت کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم صرف ذریعہ روزگار بن کر رہ گئی، اس لیے کہ ان علوم وفنون کی نشرواشاعت جنوبی ایشیا کے عوام اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے صرف اس حد تک کارآمد تھی کہ انگریزی دربار تک رسائی حاصل ہو جائے اور انگریزی حکومت میں نچلے درجے کی ملازمتیں حاصل ہو جائیں۔ اس مقصد سے ہٹ کر نہ ان چیزوں کی روزمرہ زندگی میں کوئی افادیت تھی اور نہ ہی ان معلومات کی بنیاد پر کوئی معاشی مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ سرکاری ملازمتیں اس وقت بھی محدود تھیں اور اب بھی محدود ہیں، جبکہ پڑھنے والوں کی تعداد روز افزوں ہے۔ اس صورت حال میں بے روزگاری اور بے مصرفی اس نظام تعلیم کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔ اکبر نے اس صورت حال پر یوں تبصرہ کیا:

علم یورپ کا ہوا میداں وسیع
رزق میں ہندی کے تنگی ہو گئی

اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال دونوں یہ سمجھتے تھے کہ تعلیم اور نشر علوم کے نام پر مغرب کی یہ ساری سرگرمیاں اور اولوالعزمیاں کسی اور ہی مقصد کے لیے ہیں۔ ان کا مقصد نہ اہل مشرق کی تعلیم ہے اور نہ ہی ان کی تہذیبی ترقی، بلکہ ان کا اصل ہدف مغربی استعمار کے لیے سازگار فضا اور مناسب ماحول فراہم کرنا ہے۔ ان کا اصل مقصود اہل مشرق کے مزاج کو بدلنا اور افتاد طبع کو اہل مغرب کی مصلحتوں

کے مطابق ڈھالنا ہے:

مشرقی تو سر دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اکبرالہ آبادی نے جن خیالات کا اظہار اپنی طنزیہ شاعری کے ذریعے کیا تھا، ان کا انتہائی بھر پور بلیغ، عالمانہ اور پرشکوہ اظہار علامہ محمد اقبال کی نظم ونثر میں ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال جدید دور کے تعلیمی مفکرین میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے افکار میں جو وسعت، جو گہرائی اور گیرائی پائی جاتی ہے، ان میں بیسویں صدی تو کیا گزشتہ کئی سو سال میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ یہاں اقبال کے تعلیمی افکار پر کوئی مفصل گفتگو کا نہ موقع ہے اور نہ گنجایش، اس لیے کہ اقبال کے تعلیمی افکار پر متعدد علمی کتابوں کے علاوہ بہت سے تحقیقی مقالات بھی لکھے جا چکے ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے یہاں اقبال کی تعلیمی فکر کے چند اساسی نکات کی طرف مختصر اشارے کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

عقل ودل کی کشمکش اور عقل ودل کے تقاضوں کے مابین توازن کا مسئلہ اقبال کے تصور علم اور ماخذ علم کی بحث میں بنیادی مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب تک علم کے مصدر اور ماخذ اور اس کی آخری سند کا مسئلہ طے نہ ہو، علم کی قسمیں اور تعلیم کے مقاصد پر کوئی بامعنی گفتگو ممکن نہیں ہے۔

اقبال کے نزدیک عقل وخرد کو علم وفکر کے باب میں ایک انتہائی اہم مقام حاصل ہے، لیکن عقل اگر قلب کے تقاضوں سے بے پروا ہو کر تن تنہا قیادت وسیادت کی ذمہ داریاں سنبھال لے تو اس کا نتیجہ افراتفری اور انسانیت کی روحانی تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے اقبال محض عقل پر تکیہ کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ فرماتے ہیں:

تکیہ بر عقل جہاں بین فلاطون نہ کنم
در کنارم دلکے شوخ ونظر بازے ہست
گرچہ شاہین خرد سر پروازے ہست
اندریں بادیہ پنہاں قدر اندازے ہست

اس کی وجہ یہ ہے کہ محض عقل کی بنیاد پر علم وحکمت کی جو عمارت تعمیر کی جائے گی، وہ انسان کی حقیقی

ضروریات کی تکمیل سے قاصر رہے گی۔ عقل سے علم حصولی اور علم استدلالی تو حاصل ہو سکتا ہے، لیکن علم حضوری تک پہنچانے کے لیے عقل کی رہبری ناکافی ثابت ہوتی ہے۔ جب تک عقل اور یقین مل کر راہنمائی کا فریضہ انجام نہ دیں گے، انسانیت گم گشتہ راہ ہی رہے گی اور اس کے نتیجے میں جس علم و حکمت کا ظہور ہوگا، وہ انسانیت کے لیے کسی خیر کا ذریعہ نہ بن سکے گی۔ فرماتے ہیں:

خرد بے گانہ ذوق یقین است
قمار علم و حکمت بد نشین است

دو صد بوحامد و رازی نیرزد
بنا دانے کہ چشمش راہ بین است

علم و حکمت کو متوازن، متکامل اور متناسق بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں عقل و خرد کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ قلب و نظر کے تقاضوں کو بھی یکساں طور پر سمویا گیا ہو۔ اقبال اس علم کو کم بصری قرار دیتے ہیں جس میں تجلیات کلیم اور مشاہدات حکیم ہم کنار نہ ہوں۔ اگر عقل و خرد اور قلب و نظر ایک دوسرے سے ہم کنار اور ہم آہنگ ہو جائیں تو توازن اور اعتدال خود بہ خود پیدا ہو جاتا ہے اور دونوں پہلوؤں کے افراط و تفریط کا آپ سے آپ تدارک ہوتا رہتا ہے۔ عقل کی طغیانی کا سد باب قلب و نظر سے، قلبی واردات کے عدم توازن کی اصلاح ہوش و خرد کی ترازو سے ہوتی رہتی ہے۔ اقبال نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے:

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم

اگر عقل و دل اور قلب و خرد یک جانہ ہو سکیں اور ان دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو اقبال کا فیصلہ بلا تامل اور بلا تکلف قلب و نظر کے حق میں ہوگا۔ وہ اس عقل فلک پیما پر شب خون مارنے کے لیے تیار ہیں جو قلب و نظر کی قید سے آزاد ہو:

بر عقل فلک پیما ترکانہ شب خون بہ
یک ذرۂ درد دل از علم فلاطون بہ

آن فقر کہ بے تیغے صد کشور دل گیرد
از شوکت دارابہ از فرد فریدوں بہ

اقبال نے جہاں مغربی تصور علم اور نظام تعلیم پر تنقید کی ہے، وہاں اس کے استعماری مقاصد اور نتائج بد کی نشان دہی کر کے ان سے اجتناب کرنے کی بھی جابہ جا تلقین کی ہے۔ اقبال اپنے طویل ذاتی مشاہدے، عمیق مطالعے اور عملی تجربے سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ مغرب میں علم کے مقاصد اصلاً استعماری ہیں۔ وہاں ظاہر میں خواہ کچھ بھی ہو، حقیقت بڑی بھیانک ہے۔ پیام مشرق میں خود اہل مغرب سے خطاب کر کے ان کو بتلایا ہے:

برون او ہمہ بزم، درون او ہمہ رزم
زبان اوز مسیح ودلش چنگیز است

اہل مغرب کی بیشتر کاوشوں کا ہدف کمزور اقوام کے وسائل پر قبضہ یا تصرف کر کے ان کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا ہے۔ کہتے ہیں:

امتے بر امتے دیگر چرد
دانہ ایں می کارد وآں حاصل برد

اقبال کا خیال تھا کہ مغرب کی یہ لادینی ساخت اور لامذہبی تعلیم نہ صرف خود اہل مغرب کو بلکہ پوری انسانیت کو خطرناک نتائج سے دوچار کر دے گی۔ انہوں نے اس صدی کے آغاز ہی میں یہ پیشگوئی کر دی تھی کہ مغرب کی تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔ اس پیش گوئی کے تقریباً تیس سال بعد انہوں نے ''پس چہ باید کرد'' میں لکھا:

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد
زیر گردوں رسم لادینی نہاد
مشکل حضرت انسان از وست
آدمیت راغم پنہاں ازوست
درنگاہش آدمی آب وگل است
کاروان زندگی بے منزل است

اسی سلسلہ بیان میں آگے چل کر کہتے ہیں کہ لادینی تصورات نے اہل مغرب کے طرز زندگی، ان کے تصور علم، حتیٰ کہ ان کے مذہبی تصورات پر بھی منفی اثرات ڈالے ہیں۔ فرماتے ہیں:

آہ از افرنگ واز آئین او
آہ از اندیشہ لادین او
علم حق را ساحری آموختند
ساحری نے کافری آموختند

مادیت، لادینیت اور استعماری مقاصد کے سہ آتشہ نے کیا کیا خرابیاں پیدا کی ہیں، ان کا ذکر جا بجا اقبال کی تحریروں میں ملتا ہے۔ زبورِ عجم میں فرماتے ہیں:

اے مسلمانان فغاں از فتنہ ہائے علم وفن
اہرمن اندر جہاں ارزاں ویزداں دیریاب

اس تصور علم کا ایک واضح اور فوری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کی ساری توجہ ازلی حقائق اور سرمدی معارف سے ہٹ کر فوری نوعیت کے مادی مظاہر پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں یقین و ایمان کی وہ کیفیت جو ازلی حقائق پر نظر رکھنے سے پیدا ہوتی اور قائم رہتی ہے، کمزور ہوتی جاتی ہے۔ بالآخر ان تمام امور کے بارے میں شک اور بے یقینی پیدا ہو جاتی ہے جن پر دین کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ ''بندگی نامہ'' میں جہاں غلامانہ ذہنیت رکھنے والی اقوام کے علوم وفنون اور آرٹ وغیرہ کا ذکر کیا ہے، وہاں فرماتے ہیں:

علم حاضر پیش آفل در سجود
شک بیفزود ویقین از دل ربود
بے یقیں را لذت تحقیق نیست
بے یقیں را قوت تخلیق نیست
بے یقیں را رعشہ ہا اندر دل است
نقش نو آوردن اور را مشکل است

از خودی دور است و رنجور است و بس
رہبر او ذوق جمہور است و بس

علامہ اقبال نے مغرب کے نظریہ علم اور تصورات تعلیم پر بہت تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی منظوم و منثور تحریریں اس باب میں انتہائی وقیع خیالات کی ترجمان ہیں۔ خاص طور پر پیام مشرق، زبور عجم اور ضرب کلیم میں تو انہوں نے تعلیم و تربیت اور فنون و ادبیات کے موضوع پر جو جواہر پارے عطا فرمائے ہیں، وہ جدید اسلامی فکر کا شاہ کار ہیں۔ ان کے خیالات کا خلاصہ تین عنوانات کے تحت یوں پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۔ مغرب کا نظریہ علم اور اس کی اساسات

۲۔ مقاصد علم غرب

۳۔ نتائج علم غرب

علامہ اقبال کی تحریروں میں مغرب کے نظریہ علم کی جن بنیادوں کی نشاندہی کی گئی ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ سیکولرازم، یعنی مذہب و ریاست اور دین و دنیا میں تفریق کا نو مسیحی تصور جو دراصل پاپائے روم کے استبداد کے خلاف مسیحی حکمرانوں اور اقوام کی بغاوت کو فکری جواز فراہم کرنے کے لیے پیدا کیا گیا۔

۲۔ بطور ماخذ علم وحی و الہام سے انکار جو سیکولرازم کا ایک لازمی اور منطقی نتیجہ ہے۔

۳۔ عقل و مشاہدہ کو واحد ذریعہ علم قرار دینا جو مذکورہ بالا پہلی دونوں بنیادوں کو تسلیم کر لینے کے بعد آپ سے آپ ماننا پڑتا ہے۔

۴۔ ان تینوں بنیادوں کے نتیجے میں وجدان اور داخلی شعور، واردات قلبی اور احساس روحانی محض اوہام و خرافات کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔

۵۔ پھر علم حصولی اور علم استدلالی ہی اصل علم بن جاتا ہے اور علم حضوری پہلے طاق نسیاں کی زینت اور پھر ایک بے حقیقت بلکہ وہمی چیز قرار پاتا ہے۔

۶۔ ان سب بنیادوں کے بعد آخری بنیاد علم کا اخلاق و اقدار سے غیر متعلق ہو جانا ہے۔ اس کے

بعد علم ایک خالص میکانیکی چیز رہ جاتا ہے جو اگر بداخلاقی اور فحاشی نہیں تو کم از کم لااخلاقی اور لااقداری اسلوب زندگی تو ضروری سکھاتا ہے۔

اسی طرح مقاصد علم غرب پر علامہ کے ہاں انتہائی وقیع مباحث ملتے ہیں۔ ان کی رائے میں جدید (بیسویں صدی کے آغاز کے) یورپ میں مقاصد علم کچھ یوں ہیں:

۱۔ مذہب و اخلاق کی دنیائے علم وفن سے ملک بدری:

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

۲۔ زندگی کے مادی مظاہر پر زور اور باطنی تقائق سے صرف نظر:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع وضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

۳۔ فکر معاش اور مادی ضروریات کی تکمیل پر اصل توجہ کا مرتکز ہو جانا:

در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروان زندگی بے منزل است

ان اساسات اور مقاصد نے جو نتائج پیدا کیے، ان کا ماتم اقبال نے جا بجا کیا ہے۔ ایک اعتبار سے پورا کلام اقبال نتائج علم غرب پر ایک تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ نتائج علم غرب اقبال کی نظر میں مختصراً یہ ہیں:

- قلب و نظر کا فساد
- تکدر چشمہ ہائے علم و عرفان

- فتنہ ہائے علم وفن
- خرد بے گانہ دل
- سینہ بے نور
- مرگ اموت
- بے منزلیٔ کارواں

مذکورہ بالا امور کے لیے محض بطور نمونہ اور فوری حوالہ چند اشعار حاضر ہیں:

فساد قلب ونظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

مکدر کرد مغرب چشمہ ہائے علم وعرفاں را
جہاں را تیرہ تر سازد چہ مشائی چہ اشرقی

اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم وفن
اہرمن اندر جہاں ارزاں ویزداں دیریاب

خرد بے گانہ ذوق یقین است
قمار علم وحکمت بدنشین است

خرد بے گانہ دل، سینہ بے نور
کہ از تاگ نیاگاں مے نخوردی

درنگاہش آدمی آب وگل است
کاروان زندگی بے منزل است

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ اموت
ہے حضرت انسان کے لیے اس کا ثمر موت

علم اور تعلیم و تعلم پر ان نظری مباحث کے پہلو بہ پہلو برصغیر میں بہت سے متنوع اور نت نئے تعلیمی تجربے بھی ہوئے۔ تعلیمی تجربات کے تنوع میں شاید دنیائے اسلام کا کوئی دوسرا ملک برصغیر کا مقابلہ نہ کر سکے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں قائم ہونے والے دو اہم تعلیمی اداروں دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کے اساسی اور Seminal تجربات کے نتیجے میں بیسویں صدی میں اور بھی بہت سے دوسرے تجربات ہوئے جن میں سے چند نمایاں ترین یہ ہیں:

۱۔ ندوۃ العلماء کا تجربہ جس کو اکبرالہ آبادی نے ملت اسلامیہ کی زبان ہوش مند سے تعبیر کیا، طبقہ علما کی طرف سے اس امر کا برملا اعتراف تھا کہ جدید سے مکمل صرف نظر کر کے محض قدیم کے تحفظ اور تسلسل سے دور جدید کی ضروریات پوری نہیں کی جا سکتیں۔ ندوۃ العلماء کا قیام برصغیر میں دینی تعلیم کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔ گویا ندوۃ العلماء ایک نیا دیوبند تھا جس پر علی گڑھ کی گہری چھاپ تھی۔ گزشتہ ایک سو سال کے دوران ندوی فضلا نے اسلام پر جو لٹریچر تیار کیا ہے، وہ اسلام میں مذہبی فکر اور اسلامی علوم و فنون کی تدوین نو کے ایک اہم مرحلے کا ترجمان ہے۔ جدید علم کلام، علم تفسیر میں نئے رجحانات، سیرت اور تاریخ اسلام کی نئی تدوین، ادب و مذہب کے باہمی روابط، حدیث کی از سر نو ترتیب اور تصوف و فلسفہ اسلام کی تدوین نو علمائے ندوۃ کی علمی ترک تازیوں کے خصوصی میدان ہیں۔

۲۔ اگر ندوہ نیا دیوبند تھا جو علی گڑھ کے زیر اثر وجود میں آیا تو جامعہ ملیہ نیا علی گڑھ تھا جس نے دیوبند کے زیر اثر جنم لیا۔ تحریک خلافت کے پر جوش دور میں جب مسلمانان ہند میں گاندھی کے زیر اثر تحریک عدم تعاون زور و شور سے جاری تھی اور مسلمانوں کو بڑی عیاری سے اس سب کچھ سے محروم کرنے کی کوششیں جاری تھیں جو انہوں نے ۱۸۵۷ء کی شدید ناکامی اور مایوسی کے بعد سیاسی اور انتظامی طور پر حاصل کیا تھا، یکا یک بعض مسلمان راہنماؤں نے علی گڑھ پر حملہ بول دیا اور کوشش کی کہ علی گڑھ کا ادارہ بند ہو جائے۔ ان حالات میں ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک نئے ادارے کی بنیاد رکھی گئی جو ۱۹۲۵ میں دہلی منتقل ہو گیا۔ اس نئے ادارے کی تاسیس میں مولانا محمد علی جوہر، حکیم محمد اجمل خان اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری جیسے اکابرین شامل تھے۔ اگر چہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام ایک شدید نوعیت کے ہنگامی اور ہیجانی دور میں ہوا اور بڑی حد تک علی گڑھ کی

پالیسیوں کے ردعمل میں ہوا، لیکن خود علی گڑھ میں ایک ایسے ادارے کی ضرورت کا احساس کیا جا رہا تھا جو انگریزی حکومت کے اثرات سے آزاد ہو، جہاں دینی تربیت پر خاص زور دیا جاتا ہو اور ذریعہ تعلیم اردو ہو، البتہ انگریزی اور دوسرے جدید مضامین لازمی مضامین کے طور پر شامل رہیں۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جامعہ ملیہ علی گڑھ ہی کا ذرا مشرقی قسم کا ایڈیشن تھی، اس فرق کے ساتھ کہ یہاں جلد ہی سیاست در آئی اور کانگریس اور کمیونزم کے اثرات روز بہ روز بڑھتے چلے گئے۔

جدید تعلیم کے ان دو اہم اداروں کے پہلو بہ پہلو مسلمانانِ برصغیر نے ہندوستان کے طول و عرض میں اسلامیہ ہائی سکول اور اسلامیہ کالجوں کے نام سے بہت سے ادارے قائم کیے جن میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے قائم کردہ اداروں نے بڑی شہرت پائی۔ نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کے نقطہ نظر سے تو ان اداروں اور علی گڑھ یا سرکاری جامعات (مثلاً الہ آباد یونیورسٹی یا پنجاب یونیورسٹی) میں کوئی خاص فرق نہ تھا، البتہ دینی تربیت اور ملی حمیت میں ان اداروں کی کارکردگی علی گڑھ سے بہتر محسوس ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل سے ہی ملک میں جا بہ جا اسلامیہ سکولوں اور اسلامیہ کالجوں کا قیام مسلمانوں کی اس دبی ہوئی خواہش کا مظہر تھا کہ وہ دینی تربیت اور ملی حمیت کی قیمت پر جدید تعلیم حاصل نہیں کرنا چاہتے۔

بیسویں صدی کے اہم تعلیمی تجربات میں بہاولپور کی جامعہ عباسیہ، حیدرآباد کی جامعہ عثمانیہ اور بھوپال کی جامعہ احمدیہ بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب اداروں میں جو چیز قدرِ مشترک تھی، وہ یہ احساس تھا کہ نہ جدید تعلیم کو جوں کا توں بغیر کسی نقد و تحقیق کے اختیار کیا جا سکتا ہے اور نہ قدیم نصابِ تعلیم کو بغیر کسی نظرِ ثانی اور تجدید کے برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ ان اداروں بالخصوص جامعہ عثمانیہ میں جو علمی کام ہوا، وہ انتہائی قابلِ قدر اور برصغیر کی علمی تاریخ کا ایک نہایت روشن باب ہے۔

جامعہ عباسیہ جو بہاولپور میں ۱۹۲۶ء میں قائم ہوئی، ایک اہم اور مفید کاوش تھی۔ یہ دینی تعلیم کا ایک ایسا ادارہ تھی جس نے برصغیر کے نامور ترین اہلِ علم اور اہلِ دین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس میں دینی تعلیم کی ایک ایسی روایت کو جنم دیا گیا جو اگر آج جاری رہتی تو پورے پاکستان کے لیے دینی تعلیم کا ایک نمونہ پیش کرتی۔ لیکن افسوس جدت پسندی کے شوق میں اس کا تیا پانچہ کر دیا گیا۔ اس کے

ماتحت کالجوں اور مدارس کا جو جال پھیلا ہوا تھا، وہ سارا کا سارا سمیٹ دیا گیا۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ جامعہ عباسیہ کا احیا کیا جائے۔ اس جامعہ کے سارے وسائل اس کو واپس کیے جائیں اور اس کی عالیشان عمارت کو جو شہر بہاولپور کے وسط میں واقع ہے، دوبارہ جامعہ عباسیہ کا مرکز قرار دیا جائے۔ اب جبکہ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کی عمارت نئے کیمپس میں بن چکی ہے، سابقہ عمارتوں کو واپس کر کے جامعہ عباسیہ کا احیا کرنے میں کوئی انتظامی دشواری حائل نہ ہونی چاہیے۔

قیامِ پاکستان کے بعد جو اہم تعلیمی تجربے رونما ہوئے، ان میں نمایاں اور قابلِ ذکر درج ذیل ہیں:

۱۔ اردو کالج کراچی

۲۔ جامعہ اسلامیہ، بہاولپور (خوش درخشید و لے شعلہ مستعجل بود)

۳۔ پاکستان کی قومی جامعات

۴۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی

۵۔ بہت سے دینی مدارس میں کی جانے والی تجدید واصلاح کی کوششیں جن میں جامعہ محمدیہ جھنگ، شاہ ولی اللہ اورینٹل کالج منصورہ، جامع العلوم ملتان، دارالعلوم بھیرہ، دارالعلوم شہابیہ سیالکوٹ، منہاج القرآن لاہور اور حال میں قائم ہونے والا ادارہ دانش کدہ قابل ذکر ہیں۔

۶۔ سائنس اور ٹیکنالوجی اور انتظامی علوم پر زور دینے والے جدید ادارے جن میں لاہور کی یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز، ٹوپی کا غلام اسحاق خان انسٹی ٹیوٹ اور دوسرے سنٹرز آف ایکسی لنس شامل ہیں۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان سب تجربات میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا تجربہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد تجربہ ہے جس میں گزشتہ ایک سو سال کی تعلیمی فکر سے استفادہ کرنے کی پہلی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔ لیکن تجربات کے اس تنوع کے باوجود نظام تعلیم کا اصل دھارا سیکولر ہی رہا۔ علوم وفنون اور تعلیم وتعلم کا عمومی رخ مغربی انداز کا ہی رہا، نظام تعلیم کی اساس فلسفہ مستعار پر ہی رہی، درسگاہیں بے یقینی اور تذبذب کا ریگزار ہی رہیں، کسی بامعنی نصب العین سے غفلت اور لاپروائی ہی

ساری کاوشوں کا طرۂ امتیاز رہی۔ کتنے دکھ اور حیرت کی بات ہے کہ جس ملک میں ڈاکٹر رفیع الدین جیسے بالغ نظر مفکر نے نصب العین کے حصول کو تمام انسانی سرگرمیوں اور کاوشوں کا اساسی جذبہ محرکہ قرار دیا ہو، وہاں نصب العین سے غفلت کا یہ عالم ہو!

نصب العین سے لاپروائی کا ایک نمایاں نتیجہ سماجی زندگی کی وہ عمومی بے جہتی ہے جس کا سارا معاشرہ شکار نظر آتا ہے۔ ہمارے مغربی نظام تعلیم اور مغربی تعلیمی تصورات کے علم برداروں نے نیک نیتی سے یہ سمجھا کہ مغربی علوم اور مغربی تعلیم کو مغرب کے مسیحی بلکہ یونانی اور رومی عقائد، مغرب کی تہذیبی اقدار اور مغرب کے ثقافتی تصورات سے الگ کر کے برتا اور اپنایا جا سکتا ہے اور ایسا بندوبست کیا جا سکتا ہے کہ مغربی علوم وفنون کو بلا تنقید اپنا کر بھی مسلمانوں کی مذہبی زندگی اور تہذیبی اقدار کو بچایا جا سکے، لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکتا تھا۔ اس عدم امکان کی سب سے بڑی وجہ تو یہی تھی کہ اسلام اور مغرب کے اساسی عقائد اور تصورات میں بنیادی تعارض پایا جاتا تھا۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ جدید مغربی انداز کے اداروں میں تعلیم پانے والوں کا اولین اور آخری مقصد سرکاری نوکری اور ملازمت کا حصول تھا جس کے لیے نہ دین کی ضرورت تھی اور نہ دین اس سارے عمل میں کہیں کام آتا تھا۔ لہٰذا دین سے وابستہ ہر چیز عملاً تعلیم کے لیے غیر ضروری اور اس پورے عمل سے غیر متعلق ہوتی چلی گئی اور یوں ان تعلیمی اداروں کا ماحول روز بروز دین کے لیے ناسازگار ہوتا چلا گیا۔

علامہ اقبال نے اس صورت حال کو اجتماعی نفسیات کے حوالے سے بھی دیکھا۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''غلام قوم مادیات کو روحانیات پر مقدم سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ہر اس تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوت نفس اور روح انسانی کا ترفع ہو۔''

انہوں نے ''بندگی نامہ'' میں، جو ''زبور عجم'' کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اس مسئلے پر بڑی تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور بتایا ہے کہ غلام قوم کے افکار و نظریات میں غلامی کے اثرات سے کہاں کہاں اور کیا کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ضرب کلیم میں تو انہوں نے ایک مستقل بالذات باب ہی تعلیم و تربیت کے موضوع پر رکھا ہے اور ان نتائج و اثرات کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی ہے جو مغربی

تعلیم کو جوں کا توں اپنا لینے سے سامنے آتے ہیں۔ان نتائج کا سرسری جائزہ بھی لیا جائے تو ایسے بہت سے قابل توجہ امور سامنے آتے ہیں جن پر فوری غور وفکر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

انگریزی دور سے قبل تعلیم اور روزگار یا تعلیم اور ذریعہ آمدنی کا وہ تعلق موجود نہیں تھا جو گزشتہ دو صدیوں کے دوران قائم کر دیا گیا ہے۔چونکہ تعلیم سے مراد اب صرف انگریزی تعلیم ہے اور اس کی واحد غرض حصول روزگار ہے،اس لیے تعلیم اور روزگار لازم وملزوم بن گئے ہیں اور اب تو تعلیم ایک ایسا کاروبار بن گئی ہے جو ہزاروں سے گزر کر اب لاکھوں اور کروڑوں کی آمدنی پیدا کرنے کا آسان اور شاندار راستہ ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم کا رشتہ روزگار کے بجائے اخلاق،انسانیت، تہذیب اور سب سے بڑھ کر دین سے جوڑا جائے،تعلیم کو ایک تہذیبی اور دینی ضرورت قرار دیا جائے اور تعلیم کا کاروبار کرنے والے اداروں کو کنٹرول کیا جائے۔ جو لوگ غیر ملکی یونیورسٹیوں کے نام پر فرضی ادارے بنانے اور معصوم اور ناواقف طلبہ سے بھاری فیسوں کی شکل میں دولت جمع کر رہے ہیں،ان کی سرگرمیوں کو ایک مفصل قانون کے ذریعے کنٹرول کیا جائے۔

دوسری اہم اور قابل غور بات یہ ہے کہ اس تعلیم کے نتیجے میں ہمارا بااختیار طبقہ اپنے مزاج کے اعتبار سے اصلاً سیکولر بن کر رہ گیا ہے۔وہ اسلام کی صرف وہ اصطلاحات قابل قبول سمجھتا ہے جو جدید عالمی سیکولر نظام میں کھپ سکیں اور جن سے اسٹیٹس کو کی تزئین وآرائش کا کام لیا جا سکے۔جن اسلامی اصطلاحات سے مغرب خائف ہے، وہ ہمارے دانشور کے نزدیک پرے رکھنے کی چیزیں ہیں۔خلافت، جہاد، حجاب جیسے الفاظ یا ان پر مواد پاکستان کی شاید کسی بھی درسی کتاب میں موجود نہیں۔افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج ہمارے بااثر اور تعلیم یافتہ طبقات کے لوگ جن اوصاف سے عموماً متصف ہیں (الا ماشاءاللہ) ان کو دیکھ کر اقبال کی مشہور نظم ''حکمت فرعونی'' یاد آتی ہے جس میں انہوں نے حکمت فرعونی کے علم برداروں کے اوصاف گنائے ہیں۔ان اوصاف کو دیکھیے اور آج ہمارے بااثر طبقات کی اکثریت کو دیکھیے۔ یہ طبقہ آپ کو:

۱۔انگریز کا حامی

۲۔مغرب کی تہذیبی اور فکری برتری کا علمبردار

۳۔ مسلمانوں کے استقلال کے بارہ میں ڈھلمل یقین (Luke warm) رویے کا حامل

۴۔ مسلمانوں میں دینی حمیت رکھنے والوں کے عروج سے خائف

۵۔ مسلمانوں کی تعلیم کو مغرب کے نظام کا محض ایک ناپسندیدہ لیکن لازمی اور ناگزیر تتمہ اور ضمیمہ بنا دینے کا خواہش مند

۶۔ مذہب کو ایک گوشہ میں محدود کر دینے کے لیے کوشاں

۷۔ اہل مغرب کے ایجنڈے پر ایمان کامل رکھنے والا

معلوم ہوگا۔ بہت سے حضرات ان اوصاف کو دیکھتے ہیں تو پریشان ہوتے ہیں اور چیں بہ جبیں ہو کر ان کو افراد کی انفرادی کمزوری قرار دیتے ہیں اور ان خرابیوں کی انفرادی اور جزوی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کوششوں کی جزوی افادیت اور مبنی بر اخلاص ہونے میں شک نہیں، لیکن یہ خرابی اتنی بنیادی اور ہمہ گیر ہے کہ جزوی اصلاح سے اس میں کسی بہتری کی توقع نہیں۔ یہ ایک عمومی فکری اور تہذیبی انحراف کی وہ کیفیت ہے، جس کو مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے ارتداد سے تعبیر کیا ہے۔ بلاشبہ اس انحراف کو تہذیبی ارتداد بلاخوف تردید قرار دیا جا سکتا ہے۔ مذہب کو جدید تہذیبی، تمدنی، سائنسی ضروریات کے لیے غیر متعلق قرار دینا فکر منحرف کا بنیادی ستون ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تعلیم کو محض تدریس سمجھ کر دینی تعلیمات اور اخلاقی اقدار کے پورے نظام سے اس کو الگ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بنیادی اسباب خدا بیزار فکر، اقدار بیزار تعلیم، مغرب سے مرعوبیت اور ابلاغ شر کا وہ سیلاب ہے جو آئے دن اور ہر آئے دن کے ہر لمحہ مسلمان کے سروں پر برس رہا ہے۔

ان خرابیوں کی اصل جڑ دین و دنیا کی جدائی کا سیکولر اور مغربی تصور ہے۔ دین و دنیا کی جدائی دراصل مشرکانہ عقائد کا ایک بڑا مظہر بھی ہے اور اصل سبب بھی۔ اس کے مقابلے میں ان دونوں کی اکائی یعنی Ultimate unity توحید کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ وحدت تصور تعلیم اور نظام تعلیم کی اساس ہونی چاہیے۔ اس توحید کا لازمی نتیجہ وحدت علوم بھی ہے۔ مسلمانوں میں وحدت علوم کا تصور روز اول سے ہی ان کے نظریہ علم (Epistemology) کا ایک بنیادی پتھر رہا ہے۔ ابونصر فارابی جیسے خالص عقلی اور فلسفیانہ اسلوب کے حاملین سے لے کر امام غزالی جیسے خالص صوفی اور فقیہ تک بہت سے

حضرات نے وحدت علوم کے اس تصور پر خامہ فرسائی کی ہے۔ امام غزالی نے اپنی مایہ ناز کتاب ''المستصفی من اصول الفقہ'' کے مقدمے میں وحدت علوم اور عقل ونقل کے امتزاج پر جو عالمانہ گفتگو کی ہے، وہ اسلامی فکر کی تاریخ میں اہم مقام رکھتی ہے۔

علوم وفنون کے بارے میں اس موحدانہ اسلوب کے اثرات کا جائزہ لینا ہو تو یونانی علوم وفنون کی عربی میں منتقلی کے تجربے کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ مسلمانوں نے دوسری صدی ہجری کے اواخر سے یونانی علوم وفنون بالخصوص منطق، فلسفہ اور طب وغیرہ کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ کم وبیش دو سو ڈھائی سو سال تک جاری رہا، لیکن اس نقل وترجمہ کے ساتھ ساتھ ان علوم وفنون کا تنقیدی مطالعہ بھی ہوتا رہا اور ان علوم وفنون کی تطہیر، تدوین نو اور تعمیر نو کا عمل بھی جاری رہا۔ اس پورے تجربے کی تاریخ کا مطالعہ اس لحاظ سے بڑا دلچسپ ہے کہ یونانیوں کے خالص عقلی اور تجربی علوم میں کس طرح اسلامیت کی روح سموئی گئی، کس طرح علوم وفنون کی وحدت کے تصور کو برقرار رکھا گیا، کس طرح ان متفرق اور بعض اوقات متعارض علوم تطہیر وتنقید کے عمل سے گزار کر ایک لڑی میں پرو دیا گیا، حتیٰ کہ قرون وسطیٰ کے خود یہودی اور عیسائی مفکرین اسلام کے ان گہرے تہذیبی اثرات سے باہر نہ رہ سکے۔

وحدت علوم اور توحید دین ودنیا کا یہ ہدف صرف قرآن کو اساس بنانے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ جب درسیات کا سارا عمل قرآن کے نقطہ پرکار پر قائم ہوگا تو خود بخود وحدت علوم اور یکسانی فکر ونظر کی راہیں کھلتی چلی جائیں گی۔ اسلام کے گلستان علوم کا پہلا بیج قرآن مجید اور پہلی کیاری مسجد ہے۔ علوم وفنون کی اس وحدت اور نصب العین کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

> ''مذہب، فلسفہ، طبیعیات ... علوم وفنون سب کے سب مختلف راستے ہیں جو ایک ہی منزل مقصود پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں، کیونکہ سائنس یعنی علوم جدیدہ اور فنون حاضرہ کے باب کو کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں، اور اسلام ہی نے انسان کو منطق کا استقرائی طریق سکھایا اور علوم کی بنیاد نظریات اور قیاسات پر رکھنے کے طریق کو

مسترد کرنے کی تعلیم دی اور یہی بات علوم جدیدہ کی پیدائش کا موجب ہوئی۔''

اس کے برعکس بعض حضرات ان سب حقائق کو نظر انداز کر کے نصاب تعلیم کو پڑوس کی نرسری کے گملہ میں لگا ہوا ایک پودا سمجھتے ہیں جس کو جب چاہا اور جس گھر میں چاہا، منگا کر لگوا لیا۔ چنانچہ جو رطب ویابس مغرب کی نسبت سے آتا ہے، وہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ عالمی بنک کی ایک رپورٹ میں (آج سے کم وبیش ایک ڈیڑھ عشرہ قبل) کہا گیا تھا کہ

''ترقی پذیر ملکوں کے نصابات کی تبدیلیاں شمالی امریکہ کے نصابات کا چربہ ہوتی ہیں۔''

مغرب اب ان تصورات سے قطعی بے گانہ ہو چکا ہے جن پر دین کی اساس ہے۔ دوسری طرف مشرق اور دنیائے اسلام کا بڑا حصہ محض افسانوں اور بے اصل روایات کو دین سمجھے بیٹھا ہے۔ اساس صحیح پر ایک مکمل معاشرے کی تعمیر وتشکیل وقت کی فوری ضرورت بن چکی ہے:

مغرب زتو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی

تعلیم وتعلم کے میدان میں اتنی طویل اور عمیق تفکیر اور تجربات کے اس قدر تنوع کے باوجود آج ہم کہاں کھڑے ہیں؟ شاید یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ صورت ببیں حالت مپرس! آج صورت حال کیا ہے؟

۱۔ کم وبیش دو درجن بلکہ اس سے بھی زائد تعلیمی رپورٹوں اور نصف درجن سے زائد تعلیمی پالیسیوں پر عملدرآمد کا معاملہ صفر سے ذرا ہی آگے ہے۔ ۱۹۴۷ء کے نومبر سے لے کر آج بیسویں صدی کے اختتام تک ہم نے تعلیم کے موضوع پر بلا مبالغہ سینکڑوں کانفرنسیں اور ہزارہا اجلاس منعقد کیے ہوں گے اور بہت سی اچھی اچھی خوش نما تجاویز مرتب کی ہوں گی، لیکن ان پر کس حد تک عمل درآمد ہوا؟ یہ ہم سب کے سامنے ہے۔

۲۔ مسجد مکتب اسکیم کو جو شاید پاکستان کی تاریخ میں پہلی قابل عمل، کم خرچ اور نتیجہ خیز اسکیم ثابت ہو سکتی تھی، سرکاری کاغذوں اور فائلوں سے باہر نکل کر پورے طور پر برگ وبار لانے کا یا تو موقع نہیں ملا یا پھر اس کی اجازت ہی نہیں دی گئی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ملک کے چپے چپے میں قائم دواڑھائی لاکھ

مساجد میں سے صرف چند ہزار مسجدوں میں ہی مکتب اسکول بن سکے اور وہ بھی جاں بہ لب ہیں۔ ان مکتبوں کو کامیاب بنانے میں نہ علمائے کرام نے کوئی خاص دلچسپی لی اور نہ ہی تعلیم سے وابستہ حضرات نے ان کو اہمیت دی۔

۳۔ ۱۹۷۹ء کی تعلیمی پالیسی کا رخ اس کے نفاذ کے فوراً بعد انہی لوگوں نے موڑ دیا جو اس اسکیم کو چلانے کے ذمہ دار تھے۔ قائد اعظم کے پے در پے اعلانات اور دستور پاکستان کے واضح احکام کے مطابق اس پالیسی میں اردو کو بطور قومی زبان اپنانے کے لیے پہلی بار سنجیدہ اقدامات کیے گئے تھے، لیکن جلد ہی انگریزی زدہ اور انگریز گزیدہ اشرافیہ نے ان اقدامات کو کالعدم کرا دیا اور خود ان لوگوں سے جنھوں نے نہایت دھوم دھام سے یہ اسکیم تیار کرائی تھی، رجعت قہقری کا عمل شروع کرا دیا۔

۴۔ آج ہمارے ہاں تعلیم ایک باقاعدہ اور انتہائی نفع آور تجارت بن چکی ہے۔ اب استاد اور شاگرد کا رشتہ روحانی باپ اور بیٹے کا نہیں، بلکہ ایک دوکاندار اور خریدار یا ایک صانع اور صارف کے رشتہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔

۵۔ بھانت بھانت کے تعلیمی ادارے معاشرے کو طبقات میں تقسیم در تقسیم کے عمل کو پختہ سے پختہ تر کرنے کے عمل میں زور شور سے حصہ لے رہے ہیں۔

۶۔ آج ہمارے بیشتر ادارے استعمار کی ایک نئی قسم، تہذیبی اور فکری استعمار کے لیے اسی طرح مخلص رجال کار تیار کرنے کے عمل میں جوش و خروش سے مصروف ہیں جس طرح انیسویں صدی کے وسط میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفاتر کے لیے مقامی اور سستے کلرک تیار کیے جاتے تھے۔

۷۔ آج بے مقصد اور بے جہت تعلیمی اداروں کا سیلاب ملک میں آیا ہوا ہے۔ ان اداروں کے فارغ التحصیل حضرات نہ معاشرے کے کسی کام کے ہیں اور نہ ملک و ملت کے۔

۸۔ اس سب کچھ کے باوصف اور تعلیم کی اس ہمہ ہمی کے باوجود آج خواندگی کی سیڑھی پر ہمارا نمبر ۱۳۴واں ہے۔ ہمارے ہاں بہت کھینچ تان کر خواندگی کی سطح ۳۶ فیصد تک پہنچائی جا سکی ہے۔ خواندگی کمیشن، خواندگی کے فروغ کی ساری کاوشیں اور خواندگی مہم پر خرچ کیے جانے والے وسائل عموماً بے نتیجہ ہی ثابت ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جدید تعلیم کا سارا زور (Thrust) مسلمان کو

Diseducate کرنے یعنی تعلیم سے محروم کرنے پر ہی رہا ہے۔ یہ بات محض کسی زور بیان کی خاطر نہیں کہی گئی بلکہ حقائق اور تاریخ دونوں اس کے شاہد ہیں۔ ۳۵-۱۸۳۶ء کے لگ بھگ مرتب کی جانے والی ایک برطانوی رپورٹ کے مطابق پنجاب جیسے دور افتادہ صوبے میں مسلمانوں میں خواندگی کا تناسب سو فیصد اور صوبے میں مجموعی طور پر ۸۴ فیصد تھا۔ اس کے برعکس جب انگریز یہاں سے اپنی تہذیبی ذمہ داریاں ادا کر کے واپس گئے یعنی ۱۹۴۷ء میں تو پنجاب کے مسلمانوں میں خواندگی کی شرح چار فیصد تھی۔

۹۔ ہماری اجتماعی قیادت کا رویہ تعلیم کے بارے میں کیا ہے، اس کا اندازہ کرنا ہو تو پنجاب کے پانچ ہزار بھوت اسکولوں، سندھ کے زمینداروں کے اطاقوں اور دیہاتوں کے ٹاٹ اسکولوں سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ ان سب چیزوں نے مل کر استاد کے معاشرتی رتبے کو ختم کر دیا ہے۔ آج کے نوجوانوں کی آخری ترجیح استاد بننا ہوتی ہے۔ ہر سال سینکڑوں اساتذہ مدرسی چھوڑ کر سرکاری افسری اور تجارتی اداروں کی ملازمتوں کو اختیار کرتے ہیں، لیکن شاید آج تک کسی سرکاری افسر نے افسری چھوڑ کر مدرسی یا معلمی اختیار نہیں کی۔

۱۱۔ استاذ اب طلبہ کا آئیڈیل نہیں رہا، اور کیوں ہو؟ اب وہ محض ایک ملازم پیشہ شخص ہے جو ملازمتوں کے کلچر میں جیتا ہے، ملازمان سرکار کے سے مطالبات و ترجیحات رکھتا ہے، ٹریڈ یونینوں کے بل پر اپنے ''حقوق'' کے حصول کی کاوش میں سرگرداں رہتا ہے۔

۱۲۔ یہی حال تعلیم کے بجٹ کا ہے۔ ہمارے ملک میں تعلیم پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے، اس کی کمی کا رونا ملک کے اہل درد اکثر روتے رہتے ہیں، لیکن کم لوگوں کی نظریں اس طرف جاتی ہیں کہ جو بجٹ تعلیم کے نام پر مختص کیا جاتا ہے، اس کا بھی کم و بیش نصف تعلیم سے متعلق حکومتی اداروں کے محض انتظامی اخراجات کی نذر ہو جاتا ہے۔ تعلیم کی مد میں مرکزی حکومت ہی کے اداروں کی فہرست مرتب کی جائے تو وہ درجنوں اداروں اور دفتروں پر مشتمل ہوگی۔ ہر ادارے اور دفتر کے سربراہان، عملہ، دفاتر، آمد و رفت، الاؤنسوں وغیرہ کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس پر اس رقم کا بیشتر حصہ خرچ ہو جاتا

ہے۔ یونیورسٹیوں کے بجٹوں کا بڑا حصہ محض انتظامی ملازمین کی تنخواہوں اور ایسے ہی دوسرے غیر تعلیمی امور کی نذر ہو جاتا ہے۔

۱۳۔ اعلیٰ فنی اور سائنسی تعلیم اب صرف مغرب زدہ خواص کے طبقے تک محدود کی جارہی ہے۔ اب اعلیٰ فنی اور سائنسی تعلیم کے دروازے عام مسلمانوں اور غریب طبقہ کے لوگوں کے لیے بند ہوتے جارہے ہیں۔ گویا جس نام پر انگریزی تعلیم کے دروازے چوپٹ کھولے گئے تھے، وہی چیز ختم کی جارہی ہے۔

۱۴۔ ایسا نظر آرہا ہے کہ کسی بین الاقوامی منصوبہ بندی کے نتیجے میں آئندہ چند عشروں کے دوران اعلیٰ تعلیم سے دینی عناصر کو ایک ایک کر کے چھانٹا جائے گا۔

۱۵۔ تعلیم کے نصاب و نظام دونوں سے امت مسلمہ اور ملت واحدہ کو تقویت دینے والے عناصر ایک ایک کر کے نکالے جارہے ہیں۔

۱۶۔ تعلیم میں بیرونی معاونت اور معاونت کے بہانے عمل دخل تعلیم کے نام پر استعماریت اور طبقاتیت کے تحفظ کی ایک موثر کوشش ہے۔ آج تعلیم کے نام پر جو مدد باہر سے آرہی ہے، اس میں مادی تعاون کا حصہ برائے نام اور فکری تغلغل (Intellectual Penetration) اصل چیز ہے۔

۱۷۔ حکومتوں کے کنٹرول، اساتذہ اور اہل علم کی تعلیم کے مستقبل سے عدم دلچسپی اور سب سے بڑھ کر غیر ملکی اداروں کے عمل دخل نے علم اور تعلیم کی آزادی کو قریب قریب ختم کر ڈالا ہے۔ علم کی آزادی اور تعلیم کی خودمختاری اسلامی تاریخ کا ایک نمایاں وصف رہا ہے۔ آزادی اور سرکاری کنٹرول نہ ہونے کے باوجود صرف دہلی میں ایک ہزار مدارس تھے۔ ٹھٹھہ شہر کے چار سو مدارس کا ذکر تو مغربی سیاحوں نے بھی کیا ہے جن کی آمدورفت خاصی دیر سے شروع ہوئی تھی۔ مزید برآں اسلامی دور میں تعلیم مفت بلا فیس تھی۔ ۱۸۲۲ء میں ایک انگریز کی رپورٹ کے بہ موجب (جنوبی ہندوستان تک میں) ہر پانچ سو افراد کی آبادی کے لیے ایک مدرسہ موجود تھا۔

۱۸۔ گزشتہ چند عشروں کے دوران بجا طور پر مسلم ممالک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول پر زور دیا گیا اور ان فنون کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا، لیکن اکثر و بیشتر یہ کام بغیر کسی منصوبہ بندی اور بغیر کسی

مناسب غور وخوض کے کیا گیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی سے مشرقی اقوام کی مرعوبیت کو پس ماندہ اقوام کی ترقی اور خوش حالی کے لیے استعمال کرنے کے بجائے مغربی افکار واقدار کی بالادستی کے لیے زیادہ استعمال کیا گیا۔

۱۹۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس غیر منصوبہ بند غلبے نے علوم انسانی واجتماعی کی اہمیت کو کم کر دیا ہے۔ آج کا ذہین نوجوان خالص فنی اور تجربی تخصصات کی طرف جا رہا ہے اور انسانی واجتماعی علوم، بالخصوص فلسفہ وادب سے اس کی دلچسپیاں نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہیں۔ یہ صورت حال ملک وملت اور تہذیب وثقافت کے مستقبل کے لیے تباہ کن ہو سکتی ہے۔ تاریخ، فکر، کلام اور دوسرے انسانی اور اجتماعی علوم کو قوموں کے مزاج کی تشکیل میں جو اہمیت اور جو کردار ہے، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اجتماعی علوم اور انسانیات، لسانیات وادبیات کو نظر انداز کرنے یا کم از کم ثانوی قرار دینے کی پالیسی پر نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے۔ ان علوم کو نظر انداز کرنے کے نہایت تباہ کن تہذیبی اور تمدنی نقصانات ہیں جن کی طرف مختصراً اشارہ آگے چل کر کیا جائے گا۔ جن مغربی اقوام کی تقلید کے نام پر ان علوم وفنون سے نظریں چرائی جا رہی ہیں، وہاں ان علوم کی تدریس وتحقیق پر اربوں روپے خرچ کیے جا رہے ہیں۔

۲۰۔ سائنس پر غیر منظم، غیر منصوبہ بند اور بے نتیجہ زور دینے کا منفی اثر اخلاق وکردار پر پڑ رہا ہے۔ اس سے مادیت اور خالص افادیت (یعنی نفع اندوزی) کے عناصر جنم لے رہے ہیں۔

۲۱۔ نفع اندوزی کی اس مسابقت نے ماں باپ کی تربیت اور دادی نانی کی گود ختم کر ڈالی ہے۔ اب ترجیحات بدل گئی ہیں۔ قلیل معاوضے پر دوسروں کے بچوں کی بے دلانہ نگہداشت ترقی پسندی اور فعالیت کی علامت ہے، لیکن اپنی اولاد کی محبت کے گہرے جذبات کے ساتھ پرورش قدامت پسندی ہے اور عورت کو قید کر دینے کے مترادف! یاللعجب!

۲۲۔ اب تک کی تعلیمی کاوشوں کے بے نتیجہ ہونے کا سبب ان کی تہ میں کارفرما تصور دوئی ہے کہ دنیا اور ہے اور دین اور۔ علی گڑھ نے دنیا کو اصل قرار دے کر دین کے زیور سے اس کو آراستہ کرنا چاہا، حالانکہ معاملہ محض ظاہر یا لباس کے بدلنے کا نہیں، ظاہر اور باطن کے درمیان مکمل ہم آہنگی کا ہے۔

ایک جدید مفکر تعلیم نے علم دین اور علم دنیا کو دو آنکھوں سے تشبیہ دی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی برقرار رہے تو وحدت نظر برقرار رہتی ہے، ورنہ بصیرت ملی احول ہو جاتی ہے۔ آج ہماری بصیرت ملی دو نہیں، بے شمار سمتوں میں بیک وقت دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس ناکام کوشش نے وحدت نظارہ کو ختم کر دیا ہے اور ایک منقسم شخصیت جنم لے رہی ہے۔

قدیم وجدید کے درمیان (قدیم کی شرائط پر) ایسی ہم آہنگی جس کے نتیجے میں ایک متوازن اور متکامل شخصیت جنم لے، مستقبل کے تعلیمی اہداف کے حصول کی شاید سب سے اہم شرط ہے جس کے بغیر کسی بامعنی نظام تعلیم اور تصور تعلیم کی تشکیل ممکن نہیں۔ قدیم سے بے خبری کی صورت میں علامہ اقبال نے یورپ کے جس معنوی استیلا کا خدشہ آج سے پون صدی قبل ظاہر کیا تھا، وہ آج ہمارے گھروں میں آ پہنچا ہے۔

علم زندگی ہے اور زندگی کا حقیقی سرچشمہ ہی اس کا اصل سرچشمہ ہے۔ علم اشیا کا سرچشمہ وہی ایک ذات ہے۔ جو علم مقاصد حیات کو نظر انداز کر کے لوازم حیات سے بحث کرے، وہ علم بے اصل ہے۔ علم کا اصل وظیفہ مقاصد حیات کی تحقیق و توضیح ہے۔ لوازم حیات کی تحقیق ثانوی چیز ہے۔ اس وظیفے کی تکمیل اور بجا آوری اسی وقت ہو سکتی ہے جب علم دین کے تابع ہو۔ اگر علم دین کی راہنمائی سے آزاد ہو جائے تو وہ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں علم نہیں، محض شیطنت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیائے مغرب میں آج کل معروضیت کو لاقدریت اور لااخلاقیت کے ہم معنی قرار دیا جانے لگا ہے۔ جو تعلیم تہذیبی اقدار اور معیارات خیر و شر کے باب میں غیر جانب دار ہو، وہ دراصل غیر جانب دار نہیں بلکہ بدتہذیبی اور شر کے حق میں جانب دار ہے۔

۲۳۔ اس دردناک داستان بلکہ تعلیمی شہر آشوب کا آخری باب ہماری جدید درس گاہوں سے اردو، عربی، فارسی اور اسلامیات کی دردناک بے دخلی ہے۔ آج کی بیشتر یونیورسٹیوں میں یا تو ان موضوعات کو سرے سے ہی باریاب ہونے کی اجازت نہیں دی گئی یا ان کے کردار کو ہر ممکن حد تک محدود کر دیا گیا ہے۔ ایک ممتاز ماہر تعلیم کے الفاظ میں اسلامیات کے شعبوں کی حیثیت کم و بیش ایسی کالونیوں کی سی رہی ہے جن کے اثر کا حلقہ یونیورسٹیوں کے دوسرے شعبوں میں معمولی نفوذ رکھنے کا

اہل بھی نہیں ہو سکا۔ یونیورسٹیوں کے طلبہ میں اگر دینی رجحانات کہیں کہیں مل جاتے ہیں تو ان کا مصدر ومنبع نہ خود یونیورسٹی کی تعلیم ہے، نہ وہاں کا نظام تربیت اور نہ اسلامیات کے جز یرے۔ ان اثرات کا منبع وہ خارجی دینی تحریکات ہیں جن کے اثرات کسی نہ کسی ذریعے سے یونیورسٹیوں میں آگئے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر آج اس صورت حال کی اصلاح اور ان کی تمام خرابیوں کا ازالہ کرنا چاہیں جن میں سے بعض کا ذکر ان گزارشات میں کیا گیا تو ہمیں کیا اقدامات کرنے چاہییں؟ جب تک اقدامات اور کرنے کے کام واضح طور پر سامنے نہ ہوں، اصلاح کے لیے قدم بڑھانا آسان کیا معنی، ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا پہلے ان پہلوؤں کے تعین کی ضرورت ہے جن میں اصلاح اور تبدیلی درکار ہے۔ ایسے اہم پہلوؤں کو درج بالا عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ مقصد تعلیم

۲۔ منہاج تعلیم

۳۔ نظام تعلیم

۴۔ نصاب تعلیم

۵۔ ذریعہ تعلیم

۶۔ نتائج تعلیم

۷۔ نگرانی تعلیم

ان تمام شعبوں میں با مقصد اور دیرپا تبدیلی لانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کچھ اقدامات تو فوری نوعیت کے اور قلیل المیعاد ہوں تاکہ تعلیم کی دنیا میں جس سیلاب کا سامنا ہے، اس کے فوری نتائج سے ممکنہ حد تک بچا جا سکے۔ فوری اور قلیل المیعاد اقدامات کے ساتھ ساتھ ایسے دور رس اور طویل المیعاد اقدامات کی بھی ضرورت ہے جن سے کام لے کر تعلیم کے سارے عمل کی تحویل قبلہ کی جا سکے اور اس میں ایسی بنیادی اور دیرپا تبدیلیاں کی جا سکیں جن کا مقصد پاکستان اور دنیائے اسلام کے لیے ایک ایسی نسل کی تیاری ہو جو ملت اسلامیہ کی اکیسویں صدی کی ضرورت کو کما حقہ پورا کر سکے اور اسلامی اصولوں اور تصورات کی بنیاد پر علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کے عصر نو کا آغاز کرنے میں اپنا

قائدانہ کردار ادا کر سکے۔

فوری طور پر جن اقدامات کے کرنے کی ضرورت ہے، ان میں سے چند اہم اقدامات کی حیثیت ان ہنگامی نوعیت کے اقدامات کی ہے جو کسی طوفان یا آتش زدگی کے موقع پر گھروں اور آبادیوں کو بچانے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ طویل المیعاد اقدامات کے کیے جانے اور ان کے نتائج سامنے آنے میں جو طویل وقت صرف ہوگا اور جس کی وجہ سے مزید جن خرابیوں کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے، ان کے سدِ باب کے لیے ضروری ہے کہ چند فوری اقدامات عمل میں لائے جائیں۔

ا۔ اس ضمن میں سب سے پہلا کام اساتذہ کی تربیت اور توجیہ نو (Reorientation) کا ہے۔ پرائمری اور مڈل سطح کے اساتذہ سے لے کر کالج اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ تک کے لیے الگ الگ تربیتی پروگرام مرتب کیے جانے چاہئیں۔ بلاشبہ یہ ایک بہت بڑا دقت طلب اور وسائل طلب کام ہے، لیکن عزم و ارادہ اور اخلاص کے سامنے ہر بڑی مہم چھوٹی اور ہر بڑی مشکل اور رکاوٹ ہیچ ہو جاتی ہے۔ یونیورسٹیوں کی سطح پر اس کام کو انجام دینے کے لیے ملک کی تمام جامعات میں عارضی طور پر ایسے کریش پروگرام شروع کیے جا سکتے ہیں جن کے تحت تمام نوجوان اساتذہ (لیکچرار اور اسسٹنٹ پروفیسر صاحبان) کو ایک ایک ماہ کے تربیتی اور توجیہی پروگراموں میں شرکت کا موقع ملے۔ ان پروگراموں میں ڈگری کالجوں کے اساتذہ بھی شریک کیے جا سکتے ہیں۔ دیگر کالجوں کے اساتذہ کے لیے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام ایسے کورس مرتب کیے جائیں جو فاصلاتی تعلیم کے اصول اور طریقہ کار کو اپنا کر بڑی تعداد میں اساتذہ کو تربیت فراہم کر سکیں۔

البتہ سب سے اہم اور مشکل مرحلہ پرائمری اور ثانوی اساتذہ کی تربیت کا ہوگا۔ اس کام کے لیے فوری طور پر جو کچھ کیا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ تربیت اساتذہ کے تمام کالجوں اور اداروں کے نصابات میں بنیادی اور جوہری اصلاحات کی جائیں اور کوشش کی جائے کہ آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کا کام جس طبقہ کے سپرد ہے، اس کی اپنی توجیہ (Orientation) اور قبلہ درست ہو۔ اس بنیادی اقدام کے ساتھ ساتھ ایسے قلیل المیعاد کورسز بھی شروع کیے جانے چاہئیں جہاں پرائمری اساتذہ شریک ہو سکیں۔ اگر ایک بار اساتذہ کی تربیت کا ایک موثر سلسلہ شروع ہو جائے تو اس کے اثرات جلد ہی

سامنے آنا شروع ہو جائیں گے۔

اساتذہ کے تربیتی اور توجیہی پروگراموں کی طرح اہل قلم، ادیبوں، اصحاب دانش اور ارباب صحافت کے تربیتی پروگرام بھی انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ آج کا دور ابلاغ کا دور ہے۔ آج عالمی ذرائع ابلاغ جس ہولناک انداز میں دنیائے اسلام پر چھا رہے ہیں اور مذہب و اخلاق کی دیواروں کو ایک ایک کر کے ڈھا رہے ہیں، وہ کسی ذی عقل سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے مقابلے میں دنیائے اسلام میں ابلاغ سے وابستہ بیشتر لوگوں کو اس طوفان کی ہول ناکی کا شاید کوئی اندازہ نہیں۔ ان میں بہت تھوڑے حضرات ایسے ہیں جن کو خطرے کا صحیح اندازہ ہے اور وہ اس کی روک تھام کے لیے اپنے دلوں میں کوئی تڑپ بھی رکھتے ہیں۔

ان حالات میں یہ امر انتہائی ضروری ہے کہ اصحاب ابلاغ اور اصحاب تبلیغ کو قریب لایا جائے اور ابلاغ کو تبلیغ کا ذریعہ بنایا جائے۔ اگر ذرائع ابلاغ سے کفر والحاد، اقدار سے دوری، اخلاق سے بعد اور مذہب سے بے زار مسلمان نسلوں کے دماغوں میں اتارا جا سکتا ہے تو آخر مسلمانوں کو اس امر سے کیا چیز مانع ہے کہ وہ بھی آج کے ذرائع ابلاغ کو مذہب و اخلاق، اسلامی اخوت و مساوات اور شریعت و جہاد کی تبلیغ کے لیے استعمال کریں؟ یہ کام جس فوری توجہ کی متقاضی ہے، اس پر شاید دو رائیں نہ ہوں۔ اس غرض کے لیے اہل دین، تعلیمی اداروں اور اصلاح و تجدید کے کارکنوں کو آگے بڑھ کر پیش قدمی کرنی چاہیے۔ تجدید و احیائے دین کا کام محض مطالبات کرتے رہنے سے نہیں، انسان سازی اور ذہن سازی کی مسلسل، غیر منقطع اور مشترکہ کوششوں سے ہی ہو سکتا ہے۔

۲۔ دوسرا سب سے اہم اور فوری کام یہ ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کے لیے بالخصوص اور دیگر عام لوگوں کے لیے بالعموم ایسا دینی ادب تیار کیا جائے جو نئے شبہات کا جواب دے، نئے اجنبی اور نامانوس ماحول میں اسلام پر کاربند رہنے اور اسلام سے وابستگی پر فخر محسوس کرنے میں مدد دے اور وہ ترغیب و تحریک پیدا کرے جو مغرب کی فکری اور تہذیبی غلامی سے امت کو نجات دلانے کے لیے ناگزیر ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم قدم درسی کتب پر نظر ثانی کا ہے۔ بالخصوص انگریزی زبان میں جو درسی

کتب ہمارے ہاں رائج ہیں، ان میں بے شمار چیزیں اسلامی اقدار سے متعارض اور متصادم ہیں۔ اگر اس غرض کے لیے اساتذہ کی غیر سرکاری انجمنیں اور کمیٹیاں بن جائیں اور وہ اپنے ذمہ یہ کام لے لیں کہ جہاں جہاں جن درسی کتابوں میں اسلام سے متصادم مواد موجود ہو، اس کی نشاندہی کر کے متعلقہ افراد یا اداروں کو توجہ دلائیں تو اس کام میں بہت آسانی ہو جائے گی۔ ہمارے ہاں بہت سے موضوعات پر درسی کتب پڑوسی ملک سے درآمد کی جاتی ہیں اور وہ دھڑا دھڑ یہاں ری پرنٹ ہو رہی ہیں اور لاکھوں طلبہ ان کو پڑھ رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کتابیں ایسے موضوعات پر ہیں جن کے ماہرین و متخصصین کی ہمارے ہاں کمی نہیں ہے۔ معاشیات، تاریخ، سیاسیات، قانون اور انگریزی ادب وغیرہ سے ہمارا واسطہ اب کم وبیش دو سو برس پرانا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ان موضوعات پر بھی ہمارے اساتذہ بے دھڑک ہندو مصنفین کی کتابیں استعمال کرتے ہیں اور ان میں موجود زہریلی خوراک ہمارے نوجوان طلبہ کو پلا رہے ہیں۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ اس لاپروائی میں ہمارے وہ اساتذہ بھی شریک ہیں جو خیر سے دینی تحریکات اور اسلامی تنظیموں میں بھی پیش پیش رہتے ہیں اور اسلامی نظام تعلیم رائج کرنے کے مطالبات پیش کرنے اور نعرے بلند کرنے میں مصروف رہتے ہیں، لیکن اس اہم ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے۔

۳۔ فوری توجہ کا تیسرا میدان بڑھتی ہوئی ناخواندگی ہے جو دراصل مغربی استعمار کا وہ تحفہ ہے جس سے ہم ابھی تک اپنی گلو خلاصی نہیں کرا سکے۔ ناخواندگی کی فنی تعریف دنیا میں جو کچھ بھی کی جاتی ہو، اسلامی نقطۂ نظر سے ناگزیر علم کا نہ ہونا ناخواندگی ہے جس کا ختم کیا جانا مسلمانوں کا اجتماعی اور دینی فریضہ ہے۔ ناگزیر علم سے مراد علم و دانش کا وہ کم سے کم معیار ہے جس سے ہر شہری اور بالخصوص مسلمان شہری کو متصف ہونا چاہیے۔ اسلامی تعلیمات کے بہ موجب تعلیم کا ایک درجہ فرض عین کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جس کے ذریعے ایک مسلمان کا عقیدہ، عبادت اور زندگی کی دوسری ناگزیر سرگرمیاں منظم ہوتی ہیں۔ یہ وہ ضروری اور ناگزیر درجہ ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔ اس سے آگے فرض کفایہ کا درجہ ہے جس میں تعلیم کی وہ سطح شامل ہے جو ملک و ملت کی آزادی، ترقی اور تحفظ کے لیے ضروری ہے۔ امام غزالیؒ نے اس سطح میں صنعت، طب، تجارت اور ایسے ہی دوسرے علوم کو

شامل کیا ہے۔ ان دونوں درجات کے بعد تکمیلیات اور تحسینیات کے درجے آتے ہیں جو معاشرے کے تہذیبی ارتقا اور تمدنی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ ان درجات میں اعلیٰ ادبی تحقیق، فنون کی تعلیم اور دیگر اجتماعی اور انسانی علوم کی اعلیٰ تعلیم شامل ہے۔

اس گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ناخواندگی دور کیے بغیر علم کا وہ درجہ حاصل نہیں کیا جا سکتا جو فرض عین کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناخواندگی دور کرنے کے لیے سب سے اولین شرط ان اسباب وعوامل کا دور کرنا ہے جو ناخواندگی کا سبب ہیں اور اس کے تحفظ کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

وطن عزیز میں پھیلتی ہوئی ناخواندگی کے اسباب کا جائزہ لیا جائے تو درج ذیل اسباب سامنے آتے ہیں:

۱۔ جاگیرداری کا وہ ظالمانہ نظام جو انگریزی استعمار نے برصغیر میں قائم کیا۔ اس نظام کا بنیادی مقصد ہی یہاں کے عوام بالخصوص مسلمان عوام کو کنٹرول کرنا تھا۔ جاگیرداروں نے اپنے زیر اثر مظلوموں کو تعلیم، صحت اور زندگی کی دوسری بنیادی سہولتوں سے جس طرح سے محروم رکھا ہے، وہ پوری دنیا کے سامنے ہے۔ وطن عزیز میں جاگیردار طبقے کی خاصی بڑی تعداد وہ ہے جس نے ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی سے لے کر ۱۹۴۷ء میں آزادی ملنے تک ہر طرح انگریزی استعمار کی خدمت کی اور مسلمانوں کی ہر اس تحریک یا اقدام کو ناکام بنانے کی پوری کوشش کی جس کا مقصد انگریز کے اثرات سے قوم کو محفوظ رکھنا تھا۔ اس طبقے کے افراد کے لیے انگریزوں نے ملک کے چند بڑے شہروں میں اعلیٰ معیار کے تعلیمی ادارے پہلے ہی قائم کر دیے تھے جہاں ان کی اولاد کو اعلیٰ مغربی تعلیم کی تمام سہولتیں حاصل تھیں۔ اس طبقے کی اولادیں ان اداروں میں جو مغرب کے تہذیبی مراکز کی حیثیت رکھتے ہیں، تعلیم حاصل کر کے اپنی اس غریب، جاہل اور بے زبان رعایا پر حکومت کرتی چلی آ رہی ہیں جس کے نام پر آج وہ جمہوریت کے بھی چیمپئن بنے ہوئے ہیں۔ اب جہاں ان اداروں کو حقیقی مفہوم میں پاکستانی اور مسلمان بنانے کی ضرورت ہے، وہاں ان اداروں سے بالخصوص اور پورے ملک سے بالعموم جاگیرداری کے منفی اثرات کو بھی ختم کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ دوئی اور ثنویت کا یہ سلسلہ جاری رہے گا اور اقلیت کی فرماں روائی کی روایت قائم رہے گی۔

۲۔ ناخواندگی کے تسلسل کا دوسرا بڑا سبب وہ مہیب کرپشن اور بدعنوانی ہے جس نے جسد ملی کو ایک سرطان کی طرح اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ آج ہمارے ملک میں کوئی شعبہ بھی کرپشن کے نتائج بد سے محفوظ نہیں۔ اس دیمک نے عمارت کے ہر حصے کو اندر سے کھالیا ہے۔ پنجاب کے فرضی تعلیمی اداروں اور فرضی معلمین (گھوسٹ اسکولوں اور گھوسٹ ٹیچرز) کی افسوس ناک داستانوں سے کون واقف نہیں۔ صوبہ سندھ میں بہت سے سرکاری سکول وڈیروں کی اطاق بنے ہوئے ہیں۔ بلوچستان کی حالت اس سے بھی پتلی ہے۔ وہاں تعلیم کا بجٹ کیسے اور کہاں خرچ ہوتا ہے، ہر شخص جانتا ہے۔

۳۔ پھر ہمارے ہاں تعلیم کا ہماری ضروریات زندگی سے کوئی براہ راست تعلق نہیں ہے۔ انگریزی دور میں انگریزی تعلیم کا مقصد کالے انگریز اور کلرک پیدا کرنا تھا، وہ اس نظام نے خوب پیدا کیے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آزاد اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی اس جدید تعلیم کا وہی مقصد اور ہدف ہونا چاہیے جو سر سید احمد خان اور ان کے رفقا نے انیسویں صدی کے اواخر میں غلام ہندوستان کی پس ماندہ اور شکست خوردہ مسلم اقلیت کے لیے طے کیا تھا؟ آج واقعہ یہ ہے کہ ہماری بے مقصد اور بے جہت تعلیم کے نتیجے میں قوم کے ڈگری یافتہ نوجوانوں کی بے کاری اور بے مصرفی میں روز بہ روز جو اضافہ ہو رہا ہے، اس سے بے شمار معاشرتی، اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی قباحتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ لہٰذا جب تک تعلیم کے پورے نظام اور نصاب پر از سرنو غور کر کے اس کو وطن عزیز کی اجتماعی، ملی اور اقتصادی ضروریات سے ہم آہنگ نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک ہمارے فارغ التحصیل نوجوانوں کی بے کاری اور بے مصرفی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی لاتعداد اور لامتناہی خرابیوں کا سدباب نہ کیا جا سکے گا۔ اگر ہم اپنی قومی، ملی اور دیگر ضروریات کا واضح تعین کر لیں تو نظام تعلیم اور نصاب تعلیم میں اصلاحات اور نئی توجیہات (Reorientations) طے کرنا بہت آسان ہو جائے گا۔

اس ضمن میں ہماری تعلیم کے قومی اور ملی اہداف حسب ذیل ہونے چاہئیں:

۱۔ ایک شریف، بااخلاق، باکردار شہری کی تیاری۔

۲۔ زیر تعلیم نوجوان کو ایک باعمل اور باکردار مسلمان اور سچا پاکستانی بنانا۔

۳۔ وطن عزیز کی اقتصادی ضروریات کے لحاظ سے افرادکار کی تیاری۔

۴۔ ملک میں زراعت، چھوٹی صنعتوں اور ملک میں دستیاب خام مال کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تربیت یافتہ افرادی قوت کی فراہمی۔

۵۔ ایک مسلم پاکستانی ثقافت کے فروغ اور تحفظ کے لیے بقدر ضرورت ماہرین کی تیاری۔

۶۔ اجتماعی اور انسانی علوم کی تشکیل نو اور تدوین نو کے لیے مناسب تعداد میں ماہرین کی فراہمی۔

۷۔ ملک میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے ماہرین کی اس طرح فراہمی کہ ہمارے ملک میں تیار شدہ ماہرین ہماری ضروریات کی تکمیل کر سکیں۔ ہمارے خرچ پر پڑھ کر دوسروں کی تعمیر اور اپنی تخریب کا ذریعہ نہ بنیں۔ اس وقت ہمارے ہاں سے مہارتیں رکھنے والے لاکھوں نوجوان ہر سال مختلف مغربی ممالک کا رخ کر رہے ہیں اور ہمارے خرچ پر حاصل کی ہوئی مہارتوں سے ان کی تعمیر کر رہے ہیں۔

۸۔ ناخواندگی کا ایک اور اہم سبب یہ بھی ہے کہ مغربی ثقافت اور مغربی تعلیم بہت حد تک ہماری اپنی ثقافت سے الگ ایک اجنبی چیز رہی ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں برصغیر کی قدیم تعلیمی روایات کو توڑ پھوڑ کر انگریزی روایات کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی تو یہاں کے مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت نے ان نئی روایات کو اسلامی ثقافت اور اسلامی تہذیب کے لیے زہر قاتل قرار دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا سے جدید تعلیم حاصل کرنے والوں میں مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مغربی تعلیم کے بارے میں مسلمانوں کے اس شدید تحفظ کے پیش نظر ہی سرسید احمد خان کو ضرورت محسوس ہوئی تھی کہ مغربی تعلیم کو دینی تعلیم اور اسلامی ثقافت سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا جائے۔ ان کا یہ جملہ مشہور ہے کہ ہم ایک ایسی نسل تیار کرنا چاہتے ہیں جس کے ایک ہاتھ میں (مغربی) فلسفہ، دوسرے ہاتھ میں سائنس اور سر پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا تاج ہو۔ سرسید اور ان کے رفقا اور جانشین کس حد تک اس ہدف کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے، یہ ایک الگ سوال ہے جس کے جواب میں اہل علم کی آرا متفاوت ہو سکتی ہیں، لیکن سرسید کی طرف سے اس ہم آہنگی کی اہمیت وضرورت کا احساس کیا جانا ایک اہم ملی مسئلے اور قومی ضرورت کی نشان دہی کرتا ہے۔

جدید تعلیم کو اسلامی ثقافت سے ہم آہنگ کرنے کی جتنی ضرورت سرسید کے زمانے میں تھی، آج اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس زمانے میں مغربی تہذیب وثقافت کی وہ بھرپور اور جارحانہ یلغار نہیں تھی جو آج دیکھنے میں آرہی ہے۔ اس وقت مغربی ثقافت وتہذیب کے اثرات صرف چند بڑے شہروں کے ایک چھوٹے سے طبقے تک محدود تھے۔ آج یہ اثرات ٹی وی، فلموں، اخبارات اور رسائل کے ذریعے گھر گھر پہنچ رہے ہیں اور نظام تعلیم کے ذریعے ہونے والی فکری اور ذہنی تبدیلیوں کو سہ آتشہ بلکہ چہار آتشہ اور پنج آتشہ کررہے ہیں۔ مغربی تعلیم کے ذریعے مغربیت اور سیکولرازم کے جو بیج ناپختہ اور کچے دماغوں میں بوئے جاتے ہیں، ان کو ذرائع ابلاغ چشم زدن میں اباحیت اور الحاد کے تناور درختوں میں تبدیل کردیتے ہیں۔ جدید تعلیم کے ان مہیب نتائج کو دیکھ کر آج بھی وطن عزیز کے مسلمانوں کی ایک خاصی بڑی تعداد اس نظام کی افادیت کے بارے میں شدید تحفظات رکھتی ہے۔ یہ تحفظات بھی اس نظام کے بارے میں بہت سے لوگوں کی عدم دلچسپی کا سبب بنتے ہیں۔ پھر عدم دلچسپی کے نتیجے میں بچے سکولوں سے دور رہتے ہیں جو ناخواندگی کا ایک اہم سبب ہے۔

۵۔ ناخواندگی کا ایک اور سبب تعلیم کی طبقاتیت ہے۔ طبقاتیت نے جہاں ہمارے معاشرے کے اور بہت سے پہلوؤں کو تباہی سے دوچار کیا ہے، وہاں اس کے اثرات بد تعلیم پر بھی پڑے ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تعلیم اس طبقاتیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ نہ صرف قدیم اسلامی دور میں بلکہ آج بھی آزاد اور ترقی یافتہ معاشروں میں قوم کے ہر فرد اور ہر گروہ کے لیے ایک ہی تعلیم کا اصول رائج ہے۔ آج بھی دنیا کے کسی آزاد اور ترقی یافتہ ملک میں تعلیم کے نام پر ایسی طبقہ بندی نہیں ہے جس کا ہم شکار ہیں اور جس کے منفی نتائج آج پوری قوم کے سامنے ہیں۔ ہمارے ملک میں تعلیمی اداروں کی اتنی ہی سطحیں بن چکی ہیں جتنی سطحیں لوگوں کی آمدنیوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرے میں موجود معاشی درجہ بندیاں اس طبقاتی تعلیم کے ذریعے ذہنی اور فکری درجہ بندیوں کی شکل اختیار کرتی چلی جاتی ہیں اور یوں معاشرے میں تقسیم در تقسیم کا عمل جاری رہتا ہے۔ جب تک تعلیم کی اس طبقاتیت کو بیخ وبن سے نہ اکھاڑا جائے گا، اس وقت تک ملی وحدت اور یکجہتی کا حصول ایک خواب ہی رہے گا۔

اس تعلیمی طبقاتیت کے خاتمے کے لیے سب سے پہلا اور ناگزیر قدم یہ ہے کہ کم ازکم ابتدائی تعلیم سے لے کر دسویں جماعت تک پورے ملک میں ایک نصاب، ایک ذریعہ تعلیم اور یکساں قسم کا نظام امتحان ہو۔ دسویں جماعت کے بعد ہر بچہ اپنی استعداد اور ذوق کے مطابق جو میدان اختیار کرنا چاہے، اس کو اختیار کرنے کی اس کو نہ صرف مکمل آزادی ہو بلکہ نظام تعلیم بھی ایسا ہو کہ ہر بچہ کسی معاشی پریشانی میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے پسندیدہ میدان کو اختیار کر سکے۔ ۱۹۷۹ء کی تعلیمی پالیسی میں بڑی حد تک اس بات کی ضمانت دی گئی تھی۔ قبل ازیں ۱۹۶۹ء میں ائیر مارشل نور خان کی تعلیمی رپورٹ میں بھی خاصی حد تک یہ تصور موجود تھا۔ اگر ان دونوں رپورٹوں پر اخلاص سے عمل کیا جاتا تو بڑی حد تک اس طبقاتیت پر قابو پایا جا سکتا تھا۔

۶۔ ناخواندگی کے بہت سے اسباب میں ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ پرائمری اور متوسط سطحوں پر ہمارے نصاب تعلیم کا عامۃ الناس کے روزمرہ مسائل اور معاملات سے کوئی گہرا اور دیرپا ربط نظر نہیں آتا۔ بالخصوص ہمارے دیہاتوں کے ماحول میں ایک عام کسان یا مزدور کے بچے کو جن معاملات و مسائل سے دن رات واسطہ پڑتا ہے، ان کا تذکرہ اس کی نصابی کتابوں میں بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ اگر پرائمری اور مڈل کی سطح تک کم ازکم دیہاتوں میں تعلیم کو ملک کے زرعی مسائل اور فنی تعلیم کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو ایسے بہت سے بچے اپنی تعلیم کو جاری رکھنے میں افادیت محسوس کریں گے جو اب تیسری یا چوتھی جماعتوں کے بعد اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ برصغیر کے مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین خان نے تقسیم ہند سے بہت پہلے ایک ایسے تعلیمی نظام کا خاکہ تیار کیا تھا جس میں فنی تربیت اور زراعت کی تعلیم کو بنیادی اہمیت دی گئی تھی۔ یہ تعلیمی رپورٹ مسلمانوں میں بعض دوسرے اہم اسباب کی وجہ سے نہایت غیر مقبول ہوئی۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر پرائمری اور مڈل کی سطح پر تعلیم کا عوام کی روزمرہ کی ضروریات سے زیادہ گہرا تعلق ہو تو اس بات کی بڑی حد تک امید کی جا سکتی ہے کہ دیہاتوں میں خواندگی کا معیار بلند ہو جائے۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم اور حصول تعلیم میں اہمیت اور فرضیت کے لحاظ سے جو درجات اسلامی تعلیمات میں بتائے گئے ہیں، ان کا قدرے تفصیل سے تذکرہ کیا جائے۔ اسلام میں

تعلیم کا سب سے کم درجہ جو نہ صرف انتہائی ناگزیر بلکہ ہر شہری کے لیے فرض عین کا درجہ رکھتا ہے، وہ درج ذیل چار عناصر سے عبارت ہے:

الف: اسلامی عقائد کی بقدر ضرورت تعلیم۔ (ما تصح به العقیدة)

ب: بنیادی اسلامی احکام کا علم جس سے کم از کم روزمرہ کی عبادات انجام دی جاسکیں۔ (ماتصح به العبادة)

ج: بنیادی اور ضروری معاشرتی احکام اور حقوق وفرائض سے واقفیت۔ (ما تصح به المعاشرة)

د: اپنے پیشہ اور معاشی معاملات کا ضروری اور بنیادی علم۔ (ما تصح به المعیشة)

اگر پرائمری سطح پر نصاب تعلیم کی تدوین میں مذکورہ بالا چار عناصر کو بہ قدر ضرورت سمو دیا جائے تو نہ صرف تعلیم کی افادیت میں بہت اضافہ کیا جاسکے گا بلکہ تعلیم کی بے مصرفی کا تاثر بھی زائل کیا جاسکے گا اور ابتدائی تعلیم کی اسلامی تشکیل کے ایک اہم مقصد کی بھی تکمیل ہو سکے گی۔

تعلیم کے اس ناگزیر درجے کے بعد، جیسا کہ قبل ازیں اشارہ کیا جاچکا ہے، دوسرا درجہ فرض کفایہ کا ہے جس میں فقہائے اسلام نے سائنس، فنی مہارتوں، طب اور انجینئرنگ جیسے علوم کو شامل کیا ہے جن کا حصول پوری امت مسلمہ کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔ اگر امت مسلمہ میں ایک مؤثر تعداد ان علوم میں اتنی مہارت حاصل کر لے کہ امت ان علوم میں خودکفیل ہو جائے اور دوسروں کی دست نگر نہ رہے تو فرض کفایہ پر عمل درآمد کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں، لیکن اگر ان فرائض کی انجام دہی میں غفلت برتی جائے یا ان علوم وفنون کے ماہرین کی تعداد یا مہارتوں کی سطح ایسی نہ ہو جو امت کو خودکفیل بنا سکے اور اغیار کی دست نگری سے محفوظ رکھ سکے تو پوری امت گناہ گار ہوتی ہے۔

ان دو درجات کے بعد بقیہ دو درجے تکمیلی اور تحسینی درجات کہلاتے ہیں۔ یہ وہ درجات ہیں جو معاشرے میں ثقافتی ترقی، تمدنی پیش رفت اور تہذیبی ارتقا میں مدومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ علم کا یہ وہ درجہ جس کی نہ ہر شخص کو ضرورت ہے اور نہ کوئی معاشرہ بڑی تعداد میں ان علوم وفنون کے اعلیٰ ترین

ماہرین کی فراہمی کا بندوبست کر سکتا ہے اور نہ کما حقہ اس بڑی تعداد سے مستفید ہو سکتا ہے، اس لیے ان ماہرین کی ایک محدود لیکن بقدر ضرورت تعداد ہی کافی ہوتی ہے۔ ضرورت سے زائد ماہرین اگر معاشرے میں آ جائیں تو وہ بے مصرفی کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ شریعت کے ان احکام کی روشنی میں مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کا جو درجہ ناگزیر اور فرض عین ہے، اس کو پرائمری اور مڈل کی سطحوں تک مکمل کر لیا جائے۔ اس کے بعد جو درجہ فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کو گریجویشن سطح تک حاصل کر لیا جائے۔ تکمیلی اور تحسینی درجات کے ادارے محدود ہوں اور وہاں صرف اتنے ہی افراد کی گنجائش ہو جتنے افراد معاشرے کو درکار ہیں۔

یہ اتنا بڑا کام ہے کہ اس کے لیے نہ حکومت کے محدود وسائل کفایت کر سکتے اور نہ اس کو کلی طور پر پرائیویٹ شعبہ پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس عمل میں سرکاری اور غیر سرکاری تمام دستیاب وسائل کو یکجا کر کے ہی کوئی قابل ذکر پیش رفت کی جا سکتی ہے۔ اس غرض کے لیے بعض فوری اقدامات کے ساتھ ساتھ چند دوررس اور رجحان ساز اقدامات کی بھی ضرورت ہے۔ فوری طور پر جو اقدامات کیے جا سکتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

## فوری اقدامات

۱۔ بنیادی، ناگزیر اور لازمی تعلیم کا ایک ایسا نصاب مرتب کیا جائے جو مذکورہ بالا عناصر اربعہ پر مشتمل ہو۔ یہ نصاب فی سال ایک کتاب، ایک قاعدہ، ایک تختی اور ایک سلیٹ پر مشتمل ہو۔ اگر ملک میں موجود تمام مساجد کو جن کی تعداد کا اندازہ اڑھائی اور تین لاکھ کے درمیان بتایا جاتا ہے، ایسے مکتبوں میں تبدیل کر دیا جائے جہاں یہ آسان اور سادہ نظام پڑھا جائے تو بہت کم اخراجات سے چند سال کے اندر اندر ناخواندگی کی مصیبت اور بدنامی سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت پرائمری تعلیم کے پانچ سالوں کے دوران عملاً صرف تین سال تعلیم ہوتی ہے اور بقیہ ۳۰ے دن مختلف قسم کی تعطیلات کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اگر ان تمام تعطیلات کو ختم کر کے ایک بھرپور پانچ سالہ نصاب تیار کیا جائے تو بہت جلد ایک ایسی نسل تیار کی جا سکتی ہے جو ضروری دینی اور دنیوی تعلیم کے ساتھ

ساتھ ناگزیر فنی تعلیم اور پیشہ ورانہ تربیت کی بھی حامل ہوگی۔

۲۔ اگر پاکستان کے تمام رائے دہندگان کے لیے خواندگی کی شرط کو لازمی قرار دے دیا جائے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ انتخابات میں کھڑے ہونے والے ممکنہ قائدین اپنے ووٹوں اور ووٹروں کی تعداد میں اضافے کے لیے خود اپنے وسائل سے تعلیم بالغاں کی ایسی مہمات میں حصہ لینے کے لیے خوشی سے آمادہ ہو جائیں گے جن کا مقصد ان کے حامی رائے دہندگان کو ضروری تعلیم دے کر ان کے ووٹوں میں اضافہ کرنا ہو۔ اس غرض کے لیے ایک ایسا مختصر پیکج تیار کیا جا سکتا ہے جس کے ذریعے ایک سے دو سال کے اندر اندر ایک بالغ ووٹر لکھنا اور پڑھنا سیکھ سکے اور بہ قدر ضرورت حساب کے قواعد جان سکے۔ امیدواروں کو انتخابی نشان الاٹ کیے جانے کا رواج اس طرح ہوا تھا کہ ہمارے ہاں کے ووٹر ناخواندہ ہونے کی وجہ سے امیدوار اور اس کی جماعت کا نام نہیں پڑھ سکتے۔ اگر انتخابی نشان الاٹ کرنے کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور رائے دہندگان کو اس کا پابند کیا جائے کہ وہ بیلٹ پیپر پر امیدوار اور اس کی جماعت کا نام پڑھ کر اس پر مہر لگائیں تو یہ بات امیدواروں کے اپنے مفاد میں ہوگی کہ وہ اپنے حامی ووٹروں کو اتنا لکھنا پڑھنا ضرور سکھا دیں کہ وہ ان کا اپنا نام بیلٹ پیپر پر پڑھ سکیں۔

۳۔ ایک قانون کے ذریعے ان تمام اداروں اور افراد کو جو کسی شخص یا اشخاص کو بطور مزدور یا ملازم رکھیں، اس بات کا پابند بنا دیا جائے کہ وہ اپنے مزدوروں اور ملازمین کو بنیادی اور ناگزیر تعلیم دلانے کا بندوبست کریں۔ مزدور اور ملازم کو ناخواندہ رکھنا جرم قرار دیا جائے۔ اس طرح گھریلو ملازمین کی بڑی تعداد اور کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور زمینوں پر کام کرنے والے کسانوں کو مختصر عرصے میں خواندہ بنایا جا سکے گا۔

۴۔ اساتذہ کی تربیت، بالخصوص پرائمری اور مڈل اسکولوں کے اساتذہ کی فوری تربیت جہاں دیگر اسباب کی وجہ سے ضروری ہے، وہاں ناخواندگی کے فوری خاتمہ کے لیے بھی ضروری شرط ہے۔ ناخواندگی کے خاتمے کے لیے کیے جانے والے اقدامات اسی وقت مؤثر ہو سکتے ہیں جب اساتذہ کو مناسب انداز اور مناسب تعداد میں اس کے لیے تیار کر لیا گیا ہو۔ لہٰذا اساتذہ کی تربیت اس کام کے

لیے بھی ایک اہم اور ضروری قدم ہے جو فوری طور پر اٹھایا جانا ضروری ہے۔ یہاں تربیت سے مراد محض وہ فنی تربیت نہیں جو تربیت اساتذہ کے اداروں میں کسی نہ کسی حد تک پہلے ہی دی جا رہی ہے، بلکہ یہاں تربیت سے مراد نئی نسل کے مربی حضرات کی وہ توجیہ نو ہے جس کے نتیجے میں وہ قوم کو ایک نئے مستقبل کے لیے تیار کر سکیں۔ یہ تربیتی پروگرام اس انداز سے مرتب کیے جانے چاہییں کہ ان کے ذریعہ شرکا میں ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا ہو سکے۔ پروگرام اتنی تعداد میں منعقد ہوں کہ وطن عزیز کے ہر حصے سے اساتذہ کرام کی ایک بڑی تعداد ہر سال ان سے مستفید ہو سکے۔ اس غرض کے لیے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے علاوہ دوسرے اداروں کو متحرک کیا جانا چاہیے۔

## دور رس اور طویل المیعاد اقدامات

ایک متوازن، ترقی پذیر اور اسلامی روایات سے ہم آہنگ نظام تعلیم وضع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے لیے فکری سطح پر ضروری اور مناسب تیاری کی جائے۔ گزشتہ دو سو سال کے دوران جن جن تعلیمی مفکرین نے تصور تعلیم اور نظام تعلیم پر اظہار خیال کیا ہے، ان سب کے خیالات اور نظریات کو سامنے رکھ کر ایک جامع تصور تعلیم کی ترتیب و تشکیل ناگزیر ہے۔ اس ضمن میں کرنے کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ علوم و فنون کی نئی درجہ بندی کی جائے۔ اس درجہ بندی میں جہاں ناگزیر، ضروری، فرض کفایہ، تکمیلی اور تحسینی سطحوں کو پیش نظر رکھا جائے، وہاں پاکستان کی مستقبل کی ضروریات کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ جو علوم و فنون پاکستان کی بقا اور وطن عزیز کے اسلامی تشخص کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہیں، ان کو انتہائی ضروری اور ناگزیر علوم کے دائرے میں رکھا جائے۔ پھر جیسے جیسے علوم و فنون کی اخلاقی، نظریاتی، اقتصادی اور فنی ضرورتیں کم ہوتی چلی جائیں، ان کو درجہ بدرجہ فرض کفایہ، تکمیلی اور تحسینی سطحوں پر جگہ دی جائے۔ ایک قابل عمل اور دیرپا نظام تعلیم کی تدوین کے لیے یہ نئی درجہ بندی پہلے قدم کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کی بنیاد پر نظام تعلیم میں مختلف علوم و فنون کی حیثیت طے ہونی چاہیے۔

وطن عزیز میں موجود تعلیمی اداروں میں نصاب تعلیم کی تجدید اور تشکیل نو کے بارے میں دو انتہا

پسندانہ رویے پائے جاتے ہیں۔ایک رویہ جو عموماً روایتی دینی درس گاہوں کے ارباب بست وکشاد کا طرہ امتیاز ہے۔وہ نصاب تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی کو دین اور روایات سے انحراف کے مترادف قرار دیتا ہے۔ان حضرات کے خیال میں جو درسی کتابیں آج سے ایک ہزار سال قبل کے ماحول میں لکھی گئی تھیں، وہ آج جوں کی توں رہنی چاہییں، حتیٰ کہ خالص علوم آلیہ کی تعلیم کے باب میں جہاں جدید عرب دنیا میں بیش بہا تجربات ہوئے ہیں، وہاں بھی ہر نئی چیز سے صرف نظر کر کے پرانی کتابیں صرف اس لیے پڑھائی جائیں کہ وہ پرانی ہیں۔صرف ونحو اور قواعد کی جو کتابیں آج سے کئی سو سال قبل فارسی میں اس لیے لکھی گئیں کہ اس وقت تعلیم وثقافت کی زبان فارسی تھی، وہ آج بھی نصاب تعلیم کا جزو ہیں اور صرف ان کتابوں کو پڑھنے کے لیے پہلے تمام طلبہ کو فارسی پڑھائی جاتی ہے۔

اس کے برعکس ایک دوسرا انتہا پسندانہ رویہ یہ ہے کہ بغیر کسی جواز کے ہر سال یا دوسرے تیسرے سال نصابی کتابیں تبدیل کر دی جائیں، حتیٰ کہ اردو، دینیات اور تاریخ پاکستان جیسے موضوعات پر بھی، جن میں کسی نئی دریافت کے امکانات ناپید ہیں، ہر سال نیا نصاب متعارف کرایا جائے۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نہ طلبہ کی فکر میں کوئی تسلسل پیدا ہوتا ہے اور نہ کسی کم از کم معیار کے تحفظ کی ضمانت باقی رہتی ہے۔مزید برآں ہمارے ملک میں نصاب سازی ایک کاروبار بن کر رہ گئی ہے اور ایسے بہت سے پیشہ ور حضرات نے اس کو آمدنی کا ذریعہ بنالیا ہے جو سرکاری دفاتر میں اثر ورسوخ کی وجہ سے نصابی کتابیں لکھ کر حکومت کے ہاتھ فروخت کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔اس روزمرہ کی تبدیلی کا ایک منفی اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ حکومتوں کی وقتی مصلحتیں نصاب تعلیم پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ہر آنے والی حکومت ایک نیا نصاب اور ایک نئی تعلیمی پالیسی جاری کرنے کی کوشش کرتی ہے۔درسی مواد اور نصابی کتابوں کے کاروبار سے وابستہ افراد اور متعلقہ سرکاری اہلکار بھی آنے والی حکومتوں کو نئے نصاب اور نئی تعلیمی پالیسی مرتب کرانے پر آمادہ کرتے ہیں اور پھر خود ہی حسب سابق ایک نئی پالیسی بنا کر لے آتے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک متوازن اور متوسط راستہ اختیار کیا جائے۔نصاب میں جہاں تبدیلی اور اصلاح کی ضرورت اہل علم محسوس کریں، وہاں اصلاح کا عمل آسان ہو اور جہاں اس کی ضرورت نہ ہو، وہاں کسی وقتی سیاسی مصلحت یا انفرادی

مفاد کی خاطر نصاب میں تبدیلی کا عمل بہت مشکل ہو۔

قدیم اسلامی ادوار میں علوم، فنون اور صنائع میں فرق ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ ابن خلدون اور اس سے پہلے کے تعلیمی مفکرین نے ان تینوں چیزوں کے درمیان فرق کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ علوم سے مراد وہ تعلیمی اور فکری کاوشیں تھیں جن کے حصول اور فروغ میں بنیادی کردار انسانی ذہن اور دماغ کا ہو۔ چنانچہ تمام دینی علوم، عقلیات، فلسفہ، حکمت، بیشتر معاشرتی علوم اور انسانیت کے شعبے علوم میں شامل سمجھے گئے۔ فنون سے مراد وہ کاوشیں تھیں جن میں انسانی ذہن کے ساتھ ساتھ اس کی جمالیاتی حس بھی کارفرما ہو۔ فنون میں ادبیات عالیہ، شعروشاعری، خطاطی اور آرٹ وغیرہ شامل تھے۔ صنائع سے مراد عام طور پر وہ کاوشیں تھیں جن میں انسان کی فکری کاوش اور جمالیاتی حس کے ساتھ ساتھ اس کی جسمانی محنت اور کوشش کا زیادہ حصہ ہو۔ چنانچہ وہ طلبہ جو ذہنی اور فکری طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ہوتے تھے، وہ عموماً علوم کا میدان اختیار کرتے تھے۔ جو طلبہ جمالیاتی حس اور فنی شعور کے حامل سمجھے جاتے تھے، وہ عموماً فنون کا میدان اپناتے تھے اور باقی طلبہ کے لیے صنائع کا وسیع میدان کھلا ہوتا تھا۔

آج طلبہ کی بڑی تعداد ان میدانوں کو اختیار کر رہی ہے جو مذکورہ بالا تقسیم کی رو سے صنائع سے تعلق رکھتے ہیں۔ نہ صرف معاشرے بلکہ حکومت کے وسائل بھی طلبہ کی بڑی تعداد کو انہی علوم کی طرف راغب کرنے میں مصروف ہیں۔ بلاشبہ وطن عزیز کو آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ مہارتوں کی ضرورت ہے اور ملک کے بیشتر وسائل کا رجحان اسی طرف ہونا چاہیے، لیکن اس باب میں ہم سے بحیثیت قوم جو فروگزاشت ہوئی ہے، وہ طلبہ کی صلاحیتوں اور ملک کی ضروریات کا عدم ادراک ہے۔ اس کا نتیجہ وسائل اور صلاحیتوں کے ضیاع کی صورت میں ہمارے سامنے آرہا ہے۔ آج ہمارے ہزاروں ایسے نوجوان جو اعلیٰ سائنسی اور فنی تعلیم رکھتے ہیں، سرکاری دفاتر میں انتظامی ذمہ داریوں پر مامور ہیں۔ اس کے برعکس انتظامی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لیے جن مہارتوں کی ضرورت ہے، ان کا بہت تھوڑا ادراک تدوین نصاب کے مرحلے میں کیا جاتا ہے۔ اس عدم ادراک کا ایک منفی نتیجہ یہ بھی ہے کہ خالص انسانی علوم، ادبیات عالیہ اور اجتماعی علوم مثلاً تاریخ، عمرانیات وغیرہ سے نوجوان

نسل کی دلچسپی تیزی سے کم ہو رہی ہے۔ اس عدم دلچسپی کے خطرناک تہذیبی اور تمدنی نتائج برآمد ہونے کا شدید خطرہ موجود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اجتماعی علوم اور انسانیات، لسانیات اور ادبیات کو نظر انداز کرنے یا کم از کم ثانوی حیثیت کا حامل قرار دینے کی پالیسی پر نظر ثانی کی جائے۔ ان علوم کو نظر انداز کرنے کے نتیجے میں ہماری آئندہ نسلیں نہ صرف ماضی سے کٹ کر رہ جائیں گی بلکہ یہ چیز ہمارے تہذیبی اور تمدنی مستقبل کے لیے نہایت تباہ کن ثابت ہوگی۔ ہمارے ہاں یہ تاثر پھیل گیا ہے کہ مشرق و مغرب کی ترقی یافتہ اقوام نے صرف سائنس اور ٹیکنالوجی پر زور دینے کی وجہ سے ترقی کی ہے، لہٰذا ہمیں بھی انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بقیہ تمام فکری اور تہذیبی کاوشوں سے صرف نظر کر لینا چاہیے۔ ہمارے ہاں بہت سے حضرات یہ بات بھول جاتے ہیں کہ جن مشرقی یا مغربی اقوام کی نقالی کے نام پر ان اہم علوم و فنون سے نظریں چرائی جا رہی ہیں، وہاں انہی علوم و فنون کی تدریس و تحقیق پر اربوں روپے خرچ کیے جا رہے ہیں۔

ایک مسلم معاشرہ ہونے کی حیثیت سے ہم اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے کہ اپنے تمام معاملات اور فیصلوں میں ان کے اخلاقی پہلوؤں کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔ اسلام نے علم نافع اور علم غیر نافع میں فرق کیا ہے۔ پھر علم غیر نافع کے بعض شعبے ایسے ہیں جو علم ضار کی تعریف میں آتے ہیں۔ ہمارے نصاب تعلیم میں کوئی ایسی چیز شامل نہیں ہونی چاہیے جو روحانی، ملی، ملکی، مادی اور اقتصادی اعتبار سے ضرر رساں ہو۔ مادی ضرر رسانی کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ ہم لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے خرچ کر کے ایسے شعبوں کے ماہرین بھی تیار کر رہے ہیں جن کی ملک میں کوئی کھپت نہیں اور وہ اغیار کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے رہے ہیں۔

یہ بات خوش آئند ہے کہ اب وطن عزیز میں سائنس کی تعلیم کا ایک واضح اور طے شدہ منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے۔ اس منصوبے کی تیاری میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ اعلیٰ سائنسی تعلیم کے بہت سے شعبے اب مسلمانوں کے لیے شجر ممنوعہ قرار دیے جا رہے ہیں۔ دنیا کی بہت سی یونیورسٹیوں میں سائنس کے میدانوں میں مسلمان طلبہ کا داخلہ عملاً بند کر دیا گیا ہے۔ ان حالات میں سائنسی تعلیم کے کسی بھی منصوبہ کی تیاری کے لیے دنیائے اسلام کے دوسرے بڑے ممالک سے تعاون، تفہیم اور

تنسیق ضروری ہے۔ جب تک اس تعاون اور تنسیق کے نتیجے میں تقسیم کار نہیں ہوگی، اس وقت تک کوئی قابل عمل پیش رفت ممکن نہ ہوگی۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ دنیائے اسلام میں بعض مہارتیں ابھر رہی ہیں۔ پاکستان، ترکی، مصر، ملائیشیا اور قازقستان وہ ممالک ہیں جو اپنی خاص خاص مہارتوں کی وجہ سے اغیار کی آنکھوں میں کھٹک رہے ہیں اور ان ممالک کو ان مہارتوں سے محروم کرنے کی کوششیں جاری ہیں اور ان کوششوں کو کامیاب اور مؤثر بنانے کے لیے ترغیب اور ترہیب کے حربے اختیار کیے جا رہے ہیں۔ اگر پہلے ہی مرحلے میں ان ممالک کے مابین تعاون اور تنسیق کی فضا پیدا ہو جائے اور یہ مل کر ایک دوسرے کی مہارتوں کا تحفظ بھی کریں اور ان کو ترقی دینے میں ایک دوسرے سے تعاون بھی کریں اور اس کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی مہارتوں اور تجربوں سے فائدہ بھی اٹھائیں تو پوری دنیائے اسلام اس عمل سے مستفید ہو سکے گی۔

اگر مذکورہ بالا ممالک میں موجود اعلیٰ تربیتی اداروں کو مشترکہ تعاون سے سنٹرز آف ایکسیلنس کا درجہ دے دیا جائے اور وہاں ان سب مسلم ممالک کے طلبہ کے لیے مناسب تعداد میں نشستیں مختص کر دی جائیں تو اس عمل سے تعاون بڑھانے میں بڑی مدد ملے گی۔ مزید براں اس تعاون کے نتیجے میں امید ہے کہ کم از کم مسلم ممالک میں دستیاب مہارتیں ایک دوسرے کو آسانی کے ساتھ حاصل ہو جائیں گی۔

اس ضمن میں اسلامی ممالک کی مشترکہ تنظیم او آئی سی بھی اپنا کردار ادا کر سکتی ہے۔ او آئی سی کا متعلقہ شعبہ خوش قسمتی سے پاکستان میں ہی قائم ہے اور ہمارے ملک کے انتہائی نامور اور فعال سائنس دان محترم جناب ڈاکٹر عطاء الرحمٰن اس کے سربراہ ہیں جو اس وقت سائنس اور ٹیکنالوجی کے وفاقی وزیر کے منصب پر فائز ہیں۔ اگر او آئی سی کے زیر اہتمام دس بڑے مسلم ممالک میں تعلیمی، سائنسی اور فنی تعاون کا کوئی منصوبہ بن جائے جو مذکورہ خطوط پر کام کرے تو امید ہے کہ ایسی پیش رفت کو بہت جلد ایک قابل لحاظ سطح تک پہنچایا جا سکتا ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ دنیائے اسلام کے ان دس ممالک کی قیادت کسی حد تک جرات، عزم، ارادہ اور مردانگی کے ساتھ ساتھ غیرت ملی کا مظاہرہ کرے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، اس سارے عمل میں متعلقہ مسلم ممالک کی ضروریات اور کھپت کا حقیقی اندازہ کرنا ناگزیر ہے۔ آج ہمارے وسائل دوسروں کی تعمیر میں صرف ہو رہے ہیں۔ آج جب ہمارا اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان وطن عزیز کے وسائل سے کروڑوں روپیہ خرچ کر کے تیار ہو جاتا ہے اور پھر اپنی صلاحیتوں اور مہارتوں کو دوسروں کی تعمیر میں صرف کرتا ہے تو بے اختیار غنی کشمیری کا یہ شعر زبان پر آ جاتا ہے:

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

کیا ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے غریب ملک کے لاکھوں اور کروڑوں وسائل خرچ کرنے کے بعد کینیڈا اور امریکہ، یورپ یا آسٹریلیا سدھار جانے والے نوجوان وطن عزیز کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں؟

سائنسی تعلیم کے باب میں ایک اور اہم پہلو جو سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے، وہ یہ ہے کہ اب تک ہمارے ملک میں سائنسی تعلیم کا سارا تصور اور تجربہ امریکہ، برطانیہ اور ان چند اینگلو سیکسن ممالک سے آ رہا ہے جن سے انگریزی زبان کی قدر مشترک کی وجہ سے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ مانوس ہے۔ ہمارے ہاں سائنسی تحقیق اور سائنسی تعلیم سے مراد وہ تحقیق اور تعلیم ہے جو امریکہ، برطانیہ یا کینیڈا وغیرہ کی جامعات یا اعلیٰ تحقیقی اداروں میں ہو رہی ہے۔ ہمارے بیشتر سائنس دانوں کو شاذ و نادر ہی چین، روس، جاپان، جرمنی اور فرانس میں ہونے والی تازہ ترین تحقیقات سے واقفیت کا موقع ملتا ہے۔ اس صورت حال میں اس بات کا شدید خدشہ موجود ہے کہ ہم سائنسی علوم اور تحقیقات کے بڑے اہم سرچشموں سے محروم نہ ہو جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مناسب یہ ہے کہ سائنس کی اعلیٰ تعلیم کی سطح پر مذکورہ بالا ممالک کی زبانوں میں سے کسی ایک زبان کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ بہتر تو یہ ہے کہ ایم ایس سی کی سطح پر اس کا بندوبست کیا جائے، تاہم اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کم از کم پی ایچ ڈی کی سطح پر کسی ایک بڑی غیر ملکی زبان کی تعلیم لازمی قرار دی جائے اور سائنسی مضامین میں پی ایچ ڈی کرنے والے حضرات اپنے متعلقہ فن میں اعلیٰ مہارت کے ساتھ ساتھ کسی ایک غیر ملکی

زبان میں بھی مہارت حاصل کریں۔

سائنسی مضامین کے وہ شعبے جہاں غیر معمولی اخراجات اور وسائل درکار ہیں، خصوصی توجہ کے متقاضی ہیں۔ خاص طور پر تخصص کے وہ میدان جن کی بیرون ملک وسیع مانگ ہے، ان میں ملکی وسائل خرچ کرنے کے معاملے میں بہت احتیاط اور غور وخوض کی ضرورت ہے۔ ایسی ہزاروں مثالیں ہیں کہ حکومت پاکستان کے وظیفہ پر اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک جانے والے طلبا نے پاکستان کے خرچ پر تعلیم مکمل کی اور جونہی تعلیم مکمل ہوئی، وہ کسی نہ کسی بیرونی ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ اگرچہ اس صورت حال کا سو فیصد سدباب کرنا تو ممکن نہیں تاہم بڑی حد تک اس کو روکا جا سکتا ہے اور بعض ایسے اقدامات کیے جا سکتے ہیں جن کے ذریعے طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے بعد وطن عزیز کی خدمت کے لیے آمادہ کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر سائنسی اور فنی مضامین میں ایم اے کی سطح سے اوپر کسی طالب علم کو اس وقت تک کوئی وظیفہ نہ دیا جائے جب تک وہ واضح طور پر اس بات کا عہد نہ کرے کہ وہ ایک مقررہ مدت تک ملک میں کام کرے گا۔ یہ مدت مختلف مہارتوں کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہے۔

سائنسی اور فنی تعلیم کی اس اہمیت کے باوجود، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، اجتماعی اور انسانی علوم کی اہمیت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ مناسب یہ ہے کہ ملک کی عمومی جامعات (جنرل یونیورسٹیز) میں فی الوقت موجود شعبہ جات اور کلیات کو بہتر سے بہتر بنایا جائے اور ان کو ایسے سنٹرز آف ایکسی لینس کی حیثیت دے دی جائے جو متعلقہ تخصصات میں دستیاب مہارتوں کو بہتر سے بہتر بنائیں۔

ہماری جامعات میں آج اجتماعی اور انسانی علوم کی ناگفتہ بہ حالت افسوس ناک حد تک زوال پذیر ہو چکی ہے۔ آپ سے بڑھ کر کون اس حقیقت کو جانتا ہے کہ قوموں کی تہذیبی زندگی میں ان علوم کا کردار انتہائی بنیادی ہوتا ہے۔ تاریخ ہی کی مثال لیجیے۔ تاریخ قوموں کا حافظہ ہے۔ جو قوم تاریخ کو بھول جاتی ہے، وہ گویا اپنے حافظہ کو کھو بیٹھتی ہے۔ اگر کوئی فرد اپنا حافظہ کھو دے تو اس کا شمار فرزانوں میں نہیں، پاگلوں اور مجنونوں میں ہونے لگتا ہے۔ جو قومیں اپنا ماضی بھلا کر اپنا حافظہ کھو دیتی ہیں، ان کا شمار بھی زندہ اقوام میں نہیں رہتا۔ قرآن مجید نے تاریخ کو بڑی اہمیت دی ہے اور اسے افراد و ملل کے نشیب وفراز اور عروج وزوال کی داستان عبرت قرار دیا ہے۔ تاریخ کے اصول سنت

اللہ قرار دیے گئے ہیں اور سنت اللہ میں نہ کوئی تبدیلی ہوتی ہے نہ تغیر۔ ہم نے محض وقتی مادی فوائد کی خاطر تاریخ کی اس اہمیت کو بھلا دیا ہے۔ اول تو بہت سی جامعات میں تاریخ کے شعبے ہی سرے سے موجود نہیں اور جہاں کسی نہ کسی وجہ سے یہ شعبے قائم ہو گئے ہیں، وہاں وہ انتہائی بے توجہی کا شکار ہیں اور یوں ان کی حالت بڑی پتلی ہے۔

علم تاریخ کی اہمیت ہم مسلمانوں کے لیے یوں بھی اوروں سے بڑھ کر ہے۔ ممکن ہے بعض معاصر اقوام تاریخ سے تغافل اور تجاہل کی متحمل ہو سکیں، ممکن ہے ہماری پڑوسی اقوام اپنی بعض تاریخی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے اپنی حقیقی تاریخ کو نظر انداز کر دینے اور خود بھلا دینے اور دوسروں کو بھلوا دینے پر مجبور ہوں، (اگر چہ وہ ماضی بعید کی فرضی اور اساطیری داستانوں کو تاریخ کے نام سے منوانے اور ماضی قریب کی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوششوں میں دن رات مصروف ہیں) لیکن ہمارے لیے تاریخ سے تجاہل و تغافل ایک قومی خودکشی کے مترادف ہے۔ ہمارا دستور حیات قرآن مجید بار بار تاریخ پر زور دیتا ہے اور اس سے سبق آموزی کی بار بار تلقین کرتا ہے۔ عصر حاضر کے ایک بالغ نظر مفکر کی رائے میں قرآن مجید نے تاریخ اور اس سے سبق آموزی پر بار بار زور دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق خداوند تعالیٰ تاریخ سے یعنی زمانہ کے تسلسل اور اس کے اندر جو کچھ ہوتا ہے، اس سے اور خصوصاً انسانی تاریخ سے ہرگز غافل نہیں ہے، بلکہ اس پر ہر وقت نگران ہے۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تاریخ صحیح راستہ سے بھٹکتی نظر آئے تو اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ اس کے اندر دخل اندازی کر کے کچھ عناصر کو نیچے اور کچھ عناصر کو اوپر کر دیتا ہے۔ قرآن مجید کا یہ ایک بنیادی سبق ہے۔

اس کے علاوہ قرن اولیٰ کے مسلمان خود بھی انسانی تجربات و مشاہدات میں گہری دلچسپی رکھتے تھے اور خیالی دنیا بسانے کی بجائے واقعات کو نظر میں رکھنے اور ان پر غور و خوض کرنے کے عادی تھے۔ اس لیے بہ نسبت یونانیوں کے مسلمانوں نے اور علوم کے ساتھ ساتھ علم تاریخ پر بھی پوری توجہ مبذول کی۔ ہندوؤں کا تو ذکر ہی کیا کہ ان کے ہاں تاریخ کا کوئی تصور ہی نہیں۔ دوسری قدیم اقوام میں سے کسی نے بھی تاریخ پر اتنی توجہ نہیں کی جتنی مسلمانوں نے کی۔ تاریخ کو ایک مربوط اور منظم علمی شکل

میں اسلامی تعلیم جس کی مقتضی تھی، سب سے پہلے ایک مسلمان ابن خلدون ہی نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

یہی حال دوسرے اجتماعی اور انسانی علوم کا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض علوم زوال اور انحطاط کی آخری منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ پاکستان کی بیشتر یونیورسٹیوں میں فلسفہ اور نفسیات کے شعبے یا تو سرے سے موجود ہی نہیں یا انتہائی پس ماندگی اور درماندگی کا شکار ہیں۔اس صورت حال کا لازمی منطقی نتیجہ تہذیبی افلاس اور ثقافتی کمزوری کی شکل میں نکلتا ہے۔

کم وبیش یہی رویہ مشرقی زبانوں، بالخصوص عربی اور فارسی کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ایک زمانہ تھا کہ برصغیر کا عام تعلیم یافتہ شخص اپنی مقامی اور مادری زبان (اردو، ہندی، پشتو، سندھی) وغیرہ کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، ترکی اور بہت سی صورتوں میں سنسکرت کا بھی ماہر ہوتا تھا۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ٹھوس دینی تربیت کے ساتھ ساتھ ان زبانوں سے واقفیت کی وجہ سے اسلام کے دینی ادب اور ثقافتی ورثہ سے گہری آگاہی حاصل ہو جاتی تھی اور معاشرہ میں وسعت بھی آپ سے آپ پیدا ہو جاتی تھی۔آج کے سیاق وسباق میں مشرقی زبانوں کی تدریس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یقیناً جو طلبا سائنسی اور فنی علوم میں تخصص حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کو مشرقی زبانوں میں مہارت کی ضرورت نہیں اور ان کو لازمی مضامین کے طور پر یہ زبانیں پڑھانا غیر ضروری ہے، لیکن جو طلبہ آگے چل کر ادبیات، اجتماعی علوم یا انسانیت کے میدانوں میں تخصص کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے مشرقی زبانوں کا حصول ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

زبانوں کے بارے میں گفتگو کی جائے تو ملک میں موجود لسانی مشکلات بھی سامنے آجاتی ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان لسانی اختلافات کو گزشتہ دو سو سال کے اندر جتنی ہوا دی گئی اور جس طرح اس معاملہ کو مسلمانوں کے درمیان اختلاف کا ذریعہ بنایا گیا، وہ ایک افسوسناک داستان ہے۔سلطنت عثمانیہ کے زوال سے لے کر سقوط مشرقی پاکستان تک اور اب متعدد مسلم ممالک میں جنم لینے والے اختلافات تک لسانی عصبیتوں نے جو تباہی پیدا کیا ہے، وہ کسی صاحب بصیرت پر مخفی نہیں، لیکن لسانی عصبیت کوئی مرض نہیں ہے بلکہ مرض کی علامت اور نتیجہ ہے۔اگر یہ خود کوئی مرض ہوتا تو اردو اور بنگلہ

نزاع حل ہو جانے کے بعد اختلافات کو ختم ہو جانا چاہیے تھا، لیکن اختلافات ختم ہونے کی بجائے بڑھتے چلے گئے اور بالآخر شدید قتل و غارت اور تباہی پر منتج ہوئے۔ لسانی عصبیت دراصل علاقائی قومیت کا ایک شاخسانہ ہے۔ علاقائی قومیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی علاقائی گروہ کو ناانصافی کا نشانہ بنایا جائے اور اس کو فیصلوں میں شریک نہ کیا جائے۔ ایسی صورت حال میں اسلامی اخوت کمزور پڑتی ہے اور امت واحدہ سے وابستگی کا احساس دھندلا جاتا ہے۔ اس صورت حال کا وہ سب لوگ استحصال کرتے ہیں جو مسلمانوں میں اسلامی اخوت کی بقا کو اپنے لیے خطرناک سمجھتے ہیں۔ سقوط مشرقی پاکستان اور زوال سلطنت عثمانیہ کے اسباب پر غور کیا جائے تو یہی بات سامنے آتی ہے کہ لسانی اختلافات خود کوئی مرض نہیں لیکن دیگر امراض کی علامات میں سے ایک ہے۔ آج نہ صرف پاکستان میں بلکہ دیگر مسلم ممالک میں تعلیمی پالیسی کی تشکیل دیتے وقت لسانی اختلاف کے مسئلے کو گہرے غور و فکر کے ساتھ حل کرنا چاہیے۔ آج دنیا کے مختلف مسلم ممالک میں کہیں ازبک اور فارسی، کہیں پشتو اور تاجک، کہیں فارسی اور ازبک، کہیں تاجک اور ازبک، کہیں ترکی اور کرد، کہیں اردو اور سندھی، کہیں اردو اور گجراتی اختلاف سے مسائل پیدا ہونے کا شدید خدشہ موجود ہے۔ اس خدشہ کو ایک متوازن اور مبنی برانصاف حکیمانہ لسانی پالیسی سے دور کیا جا سکتا ہے۔

نظام تعلیم اور بالخصوص دینیات، تاریخ، انسانیات اور دوسرے معاشرتی علوم میں ایک اہم مسئلہ اس آزادی رائے اور حریت فکر کا بھی ہے جس کا چرچا ایک عرصہ سے ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ آزادی رائے کہیں بھی لامحدود نہیں ہے۔ مسلمانوں میں فکر کی آزادی کو ہمیشہ احترام کا مستحق سمجھا گیا، لیکن آزادیٔ فکر کے نام پر پورے ملک کو بالعموم اور تعلیمی اداروں کو بالخصوص ہائیڈ پارک نہیں بنایا جا سکتا۔ اس طرح کی مادر پدر آزادی سے جو فکری افراتفری جنم لیتی ہے، اس کے منفی اثرات پوری قوم کے حال اور مستقبل دونوں پر پڑتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے مسلمانوں کی متفق علیہ ملی اساسات اور فکری کلیات کے بارے میں آزادیٔ فکر کا دعویٰ ایک لغو اور بے بنیاد دعویٰ ہے، البتہ فروعی معاملات میں اختلاف رائے کی نہ صرف شریعت میں پوری گنجائش ہے بلکہ مناسب حدود کے اندر حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ فروع میں

اختلاف رائے سے فکر میں تنوع اور نظریات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ کلیات میں اختلاف رائے کے بارے میں ہی علامہ اقبال نے کہا تھا:

گو فکر خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

اکیسویں صدی کے تعلیمی تقاضوں پر گفتگو نامکمل رہے گی اگر علوم جدیدہ خاص طور پر جدید مغربی علوم اجتماعیات اور انسانیات کی اسلامی تشکیل نو کے لیے ضروری اقدامات نہ کیے جائیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے نصاب تعلیم میں ہر اصلاح نامکمل، ناکافی اور بے نتیجہ رہے گی اگر علوم جدیدہ کی اسلامی تشکیل کے لیے فوری اقدامات نہ کیے جائیں۔ علوم وفنون کو بالخصوص جدید علوم وفنون کو اسلامی خطوط پر تنقیدی مطالعہ کا موضوع بنانے اور ان کی تشکیل نو کرنے کی ضرورت کا سب سے پہلے علامہ اقبال کو احساس ہوا تھا۔ ان کی بہت سی نظموں اور اردو اور انگریزی کی نثری تحریروں کا ایک اہم موضوع مغربی فکر پر تنقید اور فکر و دانش کی اسلامی تشکیل نو ہے۔

گزشتہ چند عشروں کے دوران تعلیم کو اسلامی جہت دینے کی اہمیت اور ضرورت پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اب اسلامائزیشن آف نالج خود ایک اہم موضوع بن چکا ہے۔ جن حضرات نے اس باب میں جدید مسلم فکر کو نئی جہتوں سے آشنا کیا ہے، ان میں علامہ اقبال کے علاوہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر اسماعیل فاروقی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام مرحومین میں اور ڈاکٹر سید حسین نصر اور ڈاکٹر نقیب العطاس کے اسمائے گرامی زندہ شخصیتوں میں قابل ذکر ہیں۔ یہاں اس پوری تحریک اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تحریروں کا جائزہ لینا تو دشوار ہے، تاہم یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس ضرورت کے فکری پس منظر اور تعلیمی اہمیت کے بارے میں مختصر گفتگو کی جائے۔ اس موقع پر میں اپنی ایک سابقہ تحریر کے جو آج سے ۲۵ سال قبل لکھی گئی تھی، بعض اقتباسات پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں:

''چودھویں صدی ہجری کا نصف آخر جدید دنیائے اسلام کی تاریخ میں اس اعتبار سے ایک نہایت اہم، یادگار اور خوش گوار دور ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کی بڑی تعداد نے مغربی استعمار

سے سیاسی آزادی حاصل کی۔ انڈونیشیا سے لے کر مراکش اور ماریطانیہ تک بہت سے آزاد مسلم ممالک وجود میں آ گئے، لیکن دو ڈھائی سو سال کی سیاسی غلامی اور فوجی و عسکری ماتحتی کے جو گہرے فکری، ذہنی، تمدنی اور تہذیبی نتائج پیدا ہوئے تھے، وہ محض حکمرانوں کی تبدیلی سے دور ہونے والے نہ تھے۔ مسلمان قوم کو مکمل فکری آزادی، ذہنی ہم آہنگی، تمدنی استقلال اور تہذیبی خودمختاری سے ہمدوش کرنے کے لیے ضروری تھا کہ جس طرح سیاسی و عسکری آزادی کے لیے دنیائے اسلام میں بے مثال تحریکیں چلی تھیں اور جن کو کامیاب بنانے کے لیے مسلمانوں کے ہر طبقہ نے تن من دھن کی بے بہا قربانیاں دی تھیں، اسی طرح فکری آزادی، تمدنی استقلال، تہذیبی خودمختاری اور تعلیمی احیا کی تحریکیں بھی شروع ہوں اور اسی جذبہ سے کام لے کر آزادی کی اس تحریک کی تکمیل کی جائے۔

لیکن یہ ایک افسوس ناک امر واقعہ ہے کہ مسلمان اس نئی تکمیلی تحریک کے لیے ذہنی اور فکری طور پر تیار نہ تھے۔ مسلم ممالک میں سے بیشتر کے پاس وہ وسائل موجود نہ تھے جو اس تکمیلی تحریک کو کامیابی یا کم از کم ایک کامیاب آغاز کے لیے ضروری تھے۔ مسلم ممالک کو وہ رجال کار دستیاب نہ تھے جن کے ہاتھوں اس کام کی کما حقہ داغ بیل ڈالی جا سکتی۔ مسلم ممالک میں بہت سے لوگوں کو یہ شعور نہ تھا کہ دور استعمار کی سیاسی تحریک آزادی اور دور آزادی کی فکری، تمدنی اور تعلیمی تحریکات کے تقاضے بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان دونوں نوعیت کے کاموں کی جدا جدا حیثیت میں فرق نہ کرنے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی ایسی مخلصانہ کوششیں جو اس دور جدید کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے شروع کی گئیں، وہ مطلوبہ نتائج نہ دے سکیں اور غیر ضروری اختلافات اور ثانوی مسائل میں الجھ کر رہ گئیں۔ چنانچہ اول تو مسلم ممالک میں آزادی کے بعد احیائے اسلام کی کسی متفق علیہ اور متحدہ کوشش کا آغاز ہی نہ ہو سکا اور اگر کہیں ایسی کوشش ہوئی بھی تو وہ انہی مشکلات کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ فکری، تمدنی اور تعلیمی میدانوں میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا جو کام سیاسی آزادی کے فوراً بعد شروع ہو جانا چاہیے تھا، بلکہ جو سیاسی آزادی کا منطقی تقاضا اور اس کی بقا اور تحفظ کی تاریخی طور پر ضمانت تھا، شروع نہ ہو سکا اور ہم وہیں کے وہیں کھڑے رہ گئے جہاں آزادی سے قبل کھڑے تھے۔

ثقافتی، تہذیبی اور تمدنی نشاۃ ثانیہ سے بھی اہم تر کام فکری اور تعلیمی نشاۃ ثانیہ کا تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلمان تعلیم یافتہ اصحاب کے فکر و شعور بلکہ لاشعور اور تحت الشعور میں بھی ایک ایسا فکری

انقلاب پیدا کر دیا جاتا کہ ہر شخص ہر چیز کو اسلام ہی کے نقطہ نظر سے دیکھتا، ہر معاملے پر اسلام ہی کے نقطہ نظر سے غور کرتا، تعلیم، فکر، فلسفہ، آرٹ، تہذیب، تمدن غرض ہر چیز اسلام کے رنگ میں اسی طرح ڈھل جاتی جیسے صدر اسلام کے مسلم فاتحین نے ہر ملک کے نظام تعلیم، نظام حکومت، معیشت، معاشرت، فکر و فلسفہ غرض ہر چیز کو اس قدر گہرے اسلامی رنگ میں رنگ دیا تھا کہ یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ کسی خاص ملک میں کیا چیز عرب سے آئی تھی اور کیا چیز مقامی تھی جو عربی اسلامی رنگ میں رنگ گئی۔ اس ضمن میں جو کام سب سے پہلے کرنے کا ہے، وہ نظام تعلیم کی تشکیل جدید ہے۔ نظام تعلیم کی اسلامی خطوط پر تشکیل نو کر کے ہی ہم اس فکری اور ثقافتی انقلاب کی طرف قدم بڑھا سکیں گے جو اس وقت پوری دنیائے اسلام کا مقصود ہے۔ اس کام کے لیے ہمیں ایک ایسی ہمہ گیر علمی تحقیق اور فکری تحریک کی ضرورت ہے جو ہمارے دل و دماغ کو بدل کر رکھ دے۔

یہ علمی تحقیق اور فکری کاوش نہ کوئی وقتی چیز ہے اور نہ محض کچھ سر پھرے لوگوں کی ذہنی تفریح کا مشغلہ ہے۔ یہ تو کسی قوم کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ دنیا میں وہی قومیں آگے بڑھتی ہیں جو علمی میدان میں دوسروں سے آگے ہوں، جن کو اوروں پر فکری برتری حاصل ہو، جو کائنات کے اس نظام قدرت کو دنیا والوں سے بہتر طور پر سمجھتی ہوں۔ دنیا کے زندہ اقوام میں ایسے لوگوں کی ایک قابل ذکر اور موثر تعداد ہمیشہ موجود رہتی ہے جو علمی اور فکری اعتبار سے کائنات میں کام کرنے والی قوموں کو سمجھتے ہوں، جن کی انگلیاں ہر وقت تاریخ کی نبض پر رہتی ہوں۔ مشہور انگریز مفکر ہکسلے نے لکھا ہے کہ کسی معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے از حد ضروری ہے کہ اس میں سوچنے اور فکر کرنے والوں کی ایک کم از کم تعداد ضرور موجود رہے۔

پھر علمی تحقیق کا یہ کام ان اقوام کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے جو اپنا مخصوص نظام حیات اور اپنا جداگانہ نظریہ فکر و عمل رکھتی ہیں۔ ان قوموں کے لیے ضروری ہے کہ تمام علوم کو اس طرح مرتب کریں کہ وہ ان کے مخصوص نظام حیات اور نظریہ فکر و عمل کا نہ صرف ساتھ دے سکیں بلکہ اس کی خدمت کریں اور اس کو ترقی دے سکیں، اس کے قیام میں ممد و معاون ہوں اور اس کی بقا کی ضمانت دے سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام علوم، چاہے وہ علوم اجتماعی ہوں یا علوم انسانی، علوم طبیعی ہوں یا علوم مابعد الطبیعی، وہ سب کے سب کچھ نظریات اور معلومات کے ایک مجموعے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان علوم کے ماہرین ان نظریات و معلومات کو اپنے اپنے خیالات، اپنے اپنے مزاج اور

اپنے اپنے اجتماعی ماحول کے مطابق مرتب کر لیتے ہیں اور ان سے وہی نتائج اخذ کرتے ہیں جو ان کے انداز فکر کے مطابق ہوں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انہی علوم عمرانی و طبیعی سے کام لے کر مختلف قوموں نے مختلف تہذیبیں قائم کیں اور مختلف نظام ہائے فکر و عمل مرتب کیے۔

اب جو قوم اس علمی اور فکری معرکے میں دوسروں پر بازی لے جائے گی، دنیا کی سروری کا جھنڈا اسی کے ہاتھ میں ہوگا۔ کائنات کے بارے میں اسی کا پیش کردہ نقطہ دنیا میں مانا جائے گا، لوگ اسی کے مرتب کردہ نظام فکر و عمل کو قبول کریں گے اور اس کے نتیجے میں جو تہذیب و تمدن قائم ہوگا، اسی کی دنیا میں پیروی کی جائے گی۔ دنیا میں جتنے علوم و فنون پیدا ہوں گے، وہ اسی رنگ میں رنگے ہوں گے، ان میں وہی روح رچی بسی ہوگی۔ مثال کے طور پر آج کل کے مغربی علوم و فنون کو لیجیے۔ اس وقت مغربی تہذیب و تمدن کے پیدا کردہ جو علوم دنیا میں رائج ہیں، وہ تمام تر مغرب کے مخصوص فکری سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ مغرب کا استعماری رنگ ان میں مکمل طور پر چھایا ہوا ہے۔ علوم طبیعی اور علوم حسی تو خیر خدا بیزار اور وحی والہام کی راہنمائی سے برگشتہ ہیں ہی، علوم عمرانی و اجتماعی بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں۔ مغرب کے علوم طبیعی جس مفروضے کی بنیاد پر مرتب ہو رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ علم دراصل وہی ہے جس کو ہم اپنے حواس سے معلوم کر سکیں، ہر وہ چیز جو غیر محسوس ہے، وہ غیر موجود بھی ہے تاوقتیکہ اس کا موجود ہونا ہمارے حواس خمسہ میں سے کسی ایک کی گرفت میں آ جائے۔ اس مفروضے کو اگر ہم ایک لمحہ کے لیے بھی صحیح تسلیم کر لیں تو بتائیے کہ وحی و الہام سے لے کر توحید و معاد تک کون سا عقیدہ ہے جس پر ضرب نہیں پڑتی؟

یہی حال آج کل کے علوم اجتماعی کا بھی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی ایک مخصوص روح اور مخصوص مزاج رکھتا ہے۔ اس روح اور اس مزاج کی تشکیل میں بہت سے عوامل نے حصہ لیا ہے۔ تاریخی روایات، مخصوص مذہبی پس منظر، تہذیبی اقدار، ثقافتی ماحول، یہ سب مل کر علوم و فنون کی تشکیل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مختلف زبانوں اور ان کی ادبیات کی کیفیت بھی دوسرے علوم سے مختلف نہیں ہوتی۔ جس طرح کسی قوم کے خیالات، اس کے مذہب، اس کی تہذیب اور اس کی ثقافت کا اس کے اجتماعی علوم میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، اسی طرح یہ سب چیزیں اس کی زبان و ادبیات میں بھی رچی بسی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی زبان کو لیجیے۔ اس زبان کے الفاظ، جملے، تراکیب، محاورے اور استعارات ہر چیز میں انگریز قوم کا اپنا مزاج جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ مادہ پرستی اور دیوتاؤں

جس طرح انگریز قوم کا خاصہ ہے، اسی طرح انگریزی زبان بھی ان خصائص سے معرا نہیں۔ مشرقی زبانوں میں ہندی اور سنسکرت کی مثال لے لیجیے۔ ان دونوں زبانوں میں ہندوؤں کے اساطیری خیالات اور ہندو علم الاصنام اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا تقریباً ناممکن ہے، ان زبانوں کی پرورش ہی ہندو اساطیر کی غذا سے ہوئی ہے۔

لیکن اس کے برعکس مسلمانوں کے پیدا کردہ علوم کو دیکھیے۔ ان سب میں اسلامی تہذیب و تمدن کا اپنا مزاج نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ اجتماعی اور فکری علوم کی تو خیر بنیاد ہی قرآن وسنت کی تعلیمات پر رکھی گئی، خالص دینوی اور تجرباتی علوم میں بھی اسلام کی روح موقع بہ موقع جلوہ گر رہتی ہے۔ مسلمانوں کی مرتب کردہ کوئی بھی سائنس کی کتاب لے لیجیے۔ وہ خطبہ مسنونہ اور درود وسلام کے بعد اللہ کی ان صفات کے ذکر سے شروع ہوگی جن میں اس کی قدرت، شان ربوبیت، رزاقیت اور اسی طرح کی متعلقہ صفات بیان کی گئی ہوں۔ پھر قرآن مجید کی وہ آیات ہوں گی جہاں مختلف مظاہر قدرت پر غور کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر ہر مرحلے پر اسلامیت کی یہ روح قاری کی راہنمائی کرتی نظر آئے گی۔

آج اگر مسلمان مغرب کی تہذیبی اور سیاسی برتری سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے جو کام بنیادی اہمیت رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ بیسویں صدی کے ماحول میں اسلامی تہذیب و تمدن کا احیا کریں۔ اپنے تمام علوم وفنون، اپنے ادبیات، اپنے آرٹس اور سب چیزوں کی اسلامی بنیادوں پر تشکیل جدید کریں اور سب سے پہلے اس اصول کا انکار کریں کہ جو مغرب سے جتنا قریب ہے، اتنا ہی کامل ہے اور جتنا دور ہے، اتنا ہی ناقص ہے، یا علامہ اقبال کے الفاظ میں کافر افرنگ اور مومن خود ہوں۔ مغرب کے علمی، فکری اور تہذیبی استیلا سے اسلامی فکر و دانش کے جو چشمے خشک ہو گئے ہیں، ان کو از سر نو جاری کیا جائے، اسلامی علوم وفنون کو دوبارہ متحرک اور فعال بنایا جائے۔

اس کام کی اہمیت نہ فرضی ہے نہ محض وہمی۔ اس وقت یہی عالم سلام کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ جدید علوم وفنون اور جدید تہذیب کے بارے میں کوئی واضح، متفق علیہ اور اسلامی تعلیمات کے مطابق نقطہ نظر قائم کیا جانا اس وقت اولین اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کام ایک وسیع اور ہمہ گیر علمی اور فکری تحریک کا متقاضی ہے اور اسلامی تحقیق اسی علمی وفکری تحریک کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔

اسلامی تحقیق کے کام کو تین بڑے بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ پہلی تحقیق وہ ہے، جس کو ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم نے میکانکی اسلامی تحقیق کا نام دیا ہے، یعنی وہ کام جو مقصود بالذات نہ ہو لیکن تحقیق وتفکیر میں مدد دے سکے۔ مثلاً قوامیس کی ترتیب، فہرستوں کی تیاری، قدیم مخطوطات کی نشر واشاعت وغیرہ۔

۲۔ تحقیق کی دوسری قسم وہ ہے، جس کو ہم تطہیر فکر کا نام دے سکتے ہیں۔ رائج الوقت علوم وفنون کا اسلامی نقطۂ نظر سے تنقیدی جائزہ لے کر کھرا اور کھوٹا الگ کر دینا اس میں شامل ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے مغرب کی فکری امامت کے وہم وطلسم کو پاش پاش کر دیں، انہوں نے جو نظام فکر وعمل مرتب کیا ہے، اس کا باطل اور بر سر غلط ہونا دلائل و براہین سے ثابت کر دیں۔ یہ کام عالم اسلام کی فکری آزادی اور ثقافتی بقا کے لیے سب سے زیادہ ضروری ہے۔ عالم اسلام کو سیاسی آزادی حاصل کیے چوتھائی صدی (اب نصف صدی سے زائد) کے قریب گزر چکا، لیکن فکری طور پر مسلمان آج پہلے سے زیادہ غلام ہیں۔ اس وقت مغرب اور معصومیت ہمارے نزدیک دو مترادف الفاظ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک آج کسی چیز یا نظریے کی مغرب سے نسبت اس کے مبنی برحق اور مبنی برانصاف ہونے کا کافی معیار ہے، کسی چیز کی صداقت اور حقانیت کو پرکھنے اور جانچنے کے لیے آج اس کا مغرب کے رائج الوقت تصورات کے مطابق ہونا کافی سمجھا جاتا ہے۔

اس انداز فکر کو تبدیل کرنا اور مغرب کی عصمت سے انکار کرنا ہی اس راہ میں پہلا قدم ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں ہمیں تمام مغربی علوم وفنون بلکہ مغربی تہذیب وتمدن کے تمام عناصر کو خام مال Raw Material سمجھنا چاہیے اور اس معاملے میں ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیے جو ہر خام مال کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ نہ تو ہم اس سارے مواد کو جوں کا توں اپنے کام میں لا سکتے ہیں اور نہ محض ناکارہ قرار دے کر پھینک سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی اقدار کی روشنی میں ان سب کو باریک بینی اور دقت نظر سے پرکھنا چاہیے۔ جو چیزیں حقائق ثابتہ کا درجہ رکھتی ہوں، ان کو ہم قبول کر لیں۔ جو چیزیں حقائق ثابتہ نہ ہوں اور ہماری اقدار سے متعارض ہوں، ان کو ہم رد کر دیں اور باقی ماندہ کی اصلاح کر کے ان سارے علوم کو اپنے مقاصد کے لیے تیار کریں۔

اس ضمن میں پہلے جن علوم ونظامات فکری کی تطہیر کرنی ضروری ہے، ان میں فلسفہ اور اس کی ساری شاخیں، علم سیاسیات، قانون ودستور، نفسیات، معاشیات، عمرانیات، انسانیت وغیرہ شامل

ہیں۔اس معاملے میں ہم کو بلا جھجک سابقہ کمیونسٹ ممالک کے تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ انہوں نے گزشتہ نصف صدی میں سارے علوم وفنون کی تدوین جدید کر کے ان کو مکمل طور پر کمیونسٹ فلسفے اور پرولتاری نظام فکر سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔کمیونسٹ انقلاب سے قبل کے سارے علوم کوانہوں نے بوژروا قرار دے کر مسترد کر دیا اور اپنے مقاصد کے لیے ناکام ٹھہرایا۔حتیٰ کہ انہوں نے سائنس جیسے خالص مادی علم کی دو قسمیں قرار دیں۔ایک بوژروا سائنس قرار پائی، ایک کمیونسٹ سائنس۔انہوں نے دنیا بھر کی تاریخ تک بدل ڈالی۔کمیونسٹ علمائے تاریخ نے دنیا بھر کی تاریخ کی مادی تعبیر کر کے اس کو از سرنو مرتب کر کے رکھ دیا۔اس طرح کمیونسٹ اصولوں پر معاشیات، سیاسیات، قانون، فلسفہ غرضیکہ ہر علم وفن کی ترتیب نو کر دی۔ پھر آخر ہم مسلمانوں کو یہ کام کرنے سے کیا چیز مانع ہے؟ کمیونسٹوں کے مقابلے میں تو ہم کہیں کم مدت میں اور نہایت بہتر عقلی اور علمی انداز میں یہ کام کر سکتے ہیں۔ ہمارا کام کمیونسٹوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ دیرپا اور قابل قبول ثابت ہوگا۔

مزید برآں علوم وفنون کی یہ تطہیر ایک مسلسل عمل ہے جو کبھی بھی ختم نہ ہوگا۔اس لیے کہ علم ایک مسلسل ترقی پذیر چیز ہے۔جوں جوں کائنات اور اس کے مختلف شعبے اپنے آپ کو انسانی عقل وفکر کے سامنے کھولتے جائیں گے،علوم کی ترقی ہوتی رہے گی۔اگر علوم وفنون کی اس پیہم ترقی اور ہر دم تغیر کے ہر مرحلہ میں ان کا از سرنو جائزہ نہ لیا گیا اور ان کی مرحلہ وار جانچ پڑتال نہ کی گئی تو جلد ہی ہماری تہذیبی اقدار اور معاشرتی علوم میں خلا اور تباین پیدا ہو جائے گا اور ایک زبردست فکری اختلال معاشرے میں جنم لے گا۔علوم وفنون کی اسی تطہیر و تنقیح مسلسل کی ضرورت کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> ''ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم انسانی فکر کے ارتقا پر نہایت محتاط انداز میں نظر رکھیں اور اس کے بارے میں ایک آزادانہ اور تنقیدی نقطہ نظر کو بھی قائم رکھیں۔''

۳۔تطہیر فکر کے بعد اسلامی تحقیق کا تیسرا سب سے بڑا کام تعمیر فکر کا ہے،یعنی اسلامی نقطہ نظر سے تمام علوم وفنون کی ترتیب نو اور تشکیل جدید۔اس میں جدید علوم کی تشکیل جدید بھی شامل ہے اور قدیم اسلامی علوم کی تعمیر نو بھی۔قرآن وسنت کے غیر متغیر اور ناقابل تبدل اصولوں کی روشنی میں

علوم کو اس طرح مرتب کرنا کہ وہ عصر حاضر میں ہمارے لیے کارآمد ثابت ہو سکیں اور ایک ایسے نظام فکر و عمل اور تہذیب و تمدن کی تعمیر میں مدد دے سکیں جو عصر حاضر میں دنیا کے سامنے اللہ کے دین کی گواہی دے سکے۔ لئلا یکون للناس علی اللّٰہ حجۃ۔(۱۱) تا کہ اللہ کی حجت دنیا والوں پر تمام ہو سکے اور کوئی شخص اللہ کے خلاف کوئی حجت پیش نہ کر سکے۔

علوم کی تشکیل جدید کے اس کام کی ضرورت و اہمیت کو برصغیر میں سب سے پہلے شاید علامہ اقبال نے محسوس کیا تھا۔ فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کے میدان میں علامہ مرحوم کی تطہیری اور تعمیری مساعی اسلامی فکر کی تاریخ کا نمایاں باب ہیں۔ علامہ کے بعد یہ میدان تقریباً خالی ہی نظر آتا ہے۔ بعض افراد نے مختلف علوم میں بلاشبہ کچھ قابل ذکر کام کیا، لیکن یہ کام ایک دو اشخاص کے کرنے کا نہیں۔ اس کے لیے ایک ہمہ گیر اور بھرپور تحریک کی ضرورت ہے۔ ایک ہمہ گیر اور بھرپور مہم کے طور پر علوم کی تشکیل جدید کا یہ کام کامیابی کے ساتھ جبھی ہو سکتا ہے جب ہمارا تعلیمی نصب العین متعین ہو اور ہم پوری سنجیدگی کے ساتھ فی الواقع ایسے ارباب فکر و دانش کی ایک جماعت پیدا کرنا چاہتے ہوں جو قرآن مجید کی روشنی میں سارے رائج الوقت علوم و معارف کا جائزہ لیں اور کھرا کھوٹا الگ کر دکھائیں۔ ابھی تک تو ہمارے ہاں کوئی ایسا مربوط نظام تعلیم بھی نہیں ابھر سکا جو سارے اسلامی، عمرانی اور طبیعی علوم کا جامع ہو اور اس کے ہر ہر جزو میں خدا پرستی اور اسلامیت کی قرآنی روح جاری و ساری ہو۔ ابھی تک جو ایک دو کوششیں ہوئی ہیں، وہ غیر مربوط پیوند کاری کے مترادف ہیں۔

علوم کی تنقید و تنقیح کے اس عظیم الشان کام کے لیے اب تاریخ ہم کو شاید مزید مہلت نہ دے۔ اگر مستقبل قریب میں بھی ہم کچھ کر لینے میں کامیاب ہو گئے تو خیر، ورنہ اسلامی اقدار اور اسلامی تہذیب کا احیا ایک خواب و خیال ہو کر رہ جائے گا، بلکہ تغیر پیہم کی اس دنیا میں ہمارے لیے اپنا ملی وجود باقی رکھنا بھی ممکن نہ رہے گا۔ علامہ اقبال نے آج سے پچاس (اب پچھتر) سال قبل جو بات اسلامی اصول فقہ کے بارے میں کہی تھی، وہ آج سارے علوم و فنون پر صادق آ رہی ہے۔ اس وقت اس کی جتنی اہمیت تھی، آج اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ علامہ نے فرمایا تھا:

''میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص زمانہ حال کے جورس پروڈنس (اصول قانون) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب

سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔قریباً تمام ممالک اسلامیہ میں مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں یا قوانین اسلامیہ پر غور کر رہے ہیں۔.... غرض یہ وقت عملی کام کا ہے، کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔''

لیکن علوم وفنون کی تدوین نو کے اس عمل کے انتظار میں ہم دوسرے شعبوں میں اسلامی نقطہ نظر سے اصلاحات کے کام کو نہ تو ملتوی کر سکتے ہیں اور نہ موخر کر سکتے ہیں۔ ہماری رائے میں یہ دونوں کام ایک ساتھ ہی ہونے چاہییں، بلکہ اگر یہ دونوں کام ایک ساتھ شروع کیے جائیں تو دونوں ایک دوسرے کے مدو معاون اور تکمیل کنندہ ثابت ہوں گے اور ایک کی راہ میں حائل دشواریوں کو دور کرنے کی ہر کوشش دوسرے کی راہ میں حائل دشواریوں کو ختم کرنے میں بھی مدد دے گی۔''

پچیس سال قبل جب یہ تحریر لکھی گئی تھی، اس وقت اسلامائزیشن آف نالج کا یہ عمل اپنے ابتدائی مراحل میں تھا۔گزشتہ ربع صدی کے دوران ڈاکٹر اسماعیل فاروقی شہید، ڈاکٹر سید حسین نصر اور ڈاکٹر نقیب العطاس کی انتہائی فاضلانہ تحریروں نے اس میدان میں غیر معمولی پیش رفت کی ہے۔۱۹۸۰ء کی دہائی میں ڈاکٹر اسماعیل فاروقی کی علمی سرپرستی اور فکری راہنمائی میں ایک باقاعدہ ادارہ اس کام کے لیے وجود میں آیا۔ڈاکٹر اسماعیل فاروقی اور ان کے ساتھیوں اور دیگر معاصرین نے مغربی علوم وفنون کی اسلامی تشکیل اور اسلامی علوم وفنون کی تدوین نو کے لیے تفصیلی نقشہ ہائے کار مرتب کیے۔ ان حضرات نے مختلف میدانوں میں انتہائی قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں اور اسلامائزیشن آف نالج یعنی علوم وفنون کو اسلامی نہج پر از سر نو مرتب کرنے کے عمل کو موثر انداز میں آگے بڑھایا ہے۔ان سب حضرات نے جو کاوشیں کی ہیں اور ان موضوعات پر جو خامہ فرسائی کی ہے، اس کی روشنی میں اس عمل کے نمایاں مدارج ومراحل درج ذیل ہونے چاہییں:

۱۔ جدید علوم پر کامل دسترس وہ پہلا مرحلہ ہے جو اسلامائزیشن کے اس طویل عمل کو مکمل کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ جب تک ہمارے ماہرین اپنے اپنے میدان ہائے اختصاص میں ایسی مہارتیں حاصل نہیں کریں گے کہ اہل مغرب ان کی ان مہارتوں کو بلا چوں وچرا تسلیم کرلیں، اس وقت تک

متعلقہ علوم وفنون پر ان کی تنقید کو علمی دنیا میں وہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکے گی جو اس کام کے لیے ناگزیر ہے۔ امام غزالی، امام رازی اور علامہ ابن تیمیہ کی فکر یونان کے بارے میں تنقیدی تحریروں کو وقعت اس لیے حاصل ہوئی کہ ان میدانوں میں ان کی مہارت مسلم تھی۔ آج اگر مسلم اہل علم مغربی معاشیات، سیاسیات اور قانون وغیرہ پر تنقید کرتے ہیں اور ان کی تنقید غیر موثر معلوم ہوتی ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان علوم وفنون میں ان کی مہارت ابھی تک اہل مغرب نے تسلیم نہیں کی۔ آج بھی جن مسلم ماہرین کی مہارت مغربی علوم وفنون میں مسلم ہے، ان کے تنقیدی خیالات نہ صرف سنے جاتے ہیں بلکہ وہ اہل مغرب اور اہل مغرب سے متاثر اہل مشرق کے ذہن کو بھی متاثر کرتے ہیں۔

۲۔ مغربی علوم وفنون پر اس کامل دسترس کے بعد دوسرا مرحلہ ان علوم وفنون کے تجزیاتی مطالعہ کا ہے۔ تجزیاتی مطالعے سے مراد یہ ہے کہ متعلقہ علم وفن کے اساسی مباحث اور موضوعات کا بغور جائزہ لے کر یہ طے کیا جائے کہ اس فن یا علم کے بنیادی تصورات اور اصول موضوعہ کیا ہیں اور کن مباحث کو اساسی حیثیت حاصل ہے اور کون سے مباحث فروعی حیثیت رکھتے ہیں۔

۳۔ اس جائزاتی عمل کے بعد تیسرا بڑا مرحلہ اس پورے مواد کے تنقیدی محاسبے کا ہے۔ تنقیدی محاسبے سے مراد یہ ہے کہ ہم خالص فنی اور عقلی بنیادوں پر اس بات کا جائزہ لیں کہ اس فن کے بنیادی اصولوں اور قواعد وضوابط میں کون سی چیزیں عقلاً قابل قبول ہیں اور ہمارے فکری، نظریاتی اور اخلاقی معیار پر پوری اترتی ہیں اور وہ کون سے پہلو ہیں جو عقل کی میزان میں کمزور اور اسلامی نقطہ نظر سے ناقابل قبول ہیں۔ یہ عمل کم وبیش اسی انداز کا ہوگا جس انداز کا کام امام غزالی کی کتابوں مقاصد الفلاسفہ اور تہافت الفلاسفہ میں نظر آتا ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جو کام امام غزالی نے فلسفہ یونان کو سامنے رکھ کر کیا تھا، وہی کام آج کے علوم وفنون بالخصوص عمرانی اور انسانی علوم کے باب میں کیا جانا ناگزیر ہے۔ آج بہت سی مقاصدیں (مقاصد الاقتصادیین، مقاصد السیاسیین، مقاصد القانونیین وغیرہ) اور شاید اس سے زیادہ تہافتیں (تہافت الاقتصاد، تہافت القانون، تہافت الفنون وغیرہ) لکھنے کی ضرورت ہے۔

۴۔ چوتھا بڑا قدم علوم وفنون کے اس عظیم الشان اور بے مثال ورثہ پر ماہرانہ دسترس حاصل کرنا ہے

جو مسلم مفکرین اور دانش وروں نے گزشتہ چودہ سو سال اور بالخصوص دوسری صدی ہجری سے لے کر گیارہویں صدی ہجری تک پیدا کیا۔ یہ علمی ورثہ جو عقلیات اور نقلیات اور علوم مقصودہ اور علوم آلیہ وغیرہ کے عنوان سے مختلف علوم وفنون میں تقسیم ہے، جن کی تعداد بعض مسلم محققین کے نزدیک ساڑھے چار سو سے زائد ہے، انسانی زندگی اور تہذیب وتمدن کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ علوم وفنون کا یہ سارا ذخیرہ خالص اسلامی بنیادوں اور قرآنی نظریہ علم پر مبنی ہے۔ اس ورثے پر کامل دسترس اور ماہرانہ عبور حاصل کیے بغیر اسلامی نظریہ علم اور روایت تعلیم کی روح سے آگاہی دشوار ہے۔

۵۔ اسلامی ورثے پر کامل دسترس اور ماہرانہ عبور کے بعد اگلا مرحلہ اس کے ازسرنو تجزیاتی مطالعے کا ہے۔ اس ورثے میں جو چیزیں علوم آلیہ کے دائرے میں آتی ہیں، ان میں سے بیشتر کو ازسرنو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح عقلیات کے دائرے میں آنے والے علوم وفنون کا تنقیدی مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ اسلامی ورثے کی اساس یعنی قرآن مجید اور سنت نبوی وہ دائمی اور حقیقی مصدر علم ہیں جن کی بنیاد پر علوم وفنون کی یہ ساری عمارت کھڑی ہے۔ علم فقہ، عقائد، تصوف اور عربی زبان وادب کو اس عمارت کے ستونوں کی حیثیت حاصل ہے۔ ان سب ستونوں کو اپنی جگہ قائم رکھتے ہوئے عمارت کے بقیہ حصوں میں ردوبدل، اصلاح وترمیم اور ترتیب وتنظیم نو کے عمل کی خاصی ضرورت ہے اور یہ کام ایک گہرے تجزیاتی مطالعے کے بغیر ممکن نہیں۔

۶۔ چھٹا مرحلہ مسلمانوں کی فکری تاریخ اور علمی کیریئر میں ایسے پہلوؤں کی نشان دہی کرنا ہے جو مختلف اسباب کی بنا پر آج کے تقاضوں کا سامنا کرنے سے قاصر ہے۔ اس غرض کے لیے ان پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے قدیم مفکرین نے فلاسفہ یونان کے زیر اثر منطق کے جس اسلوب کو زیادہ فروغ دیا، وہ منطق کا استخراجی اسلوب تھا۔ منطق کی بیشتر کتابیں جو فارابی اور ابن سینا جیسے عباقرہ کے زیر اثر لکھی گئیں، وہ سب کی سب منطق استخراجی کے اصول پر مرتب ہوئیں۔ متکلمین اسلام اور علمائے اصول مثلاً امام غزالی، امام رازی کی خالص دینی تحریروں (مثلاً المستصفیٰ اور المحصول) میں منطق استخراجی کے اصول وقواعد سے ہی کام لیا گیا ہے۔ آج منطق استقرائی کی اہمیت زیادہ ہوگئی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی ورثے کی

ان تمام چیزوں کو از سرنو جائزہ لیا جائے جہاں بنیاد استدلال منطق استخراجی کے قواعد تھے اور کوشش کی جائے کہ ان دینی حقائق کو جو اس وقت ائمہ اسلام نے منطق استخراجی کی بنیاد پر ثابت کیے تھے، آج منطق استقرائی کی بنا پر ثابت کیا جائے۔

۷۔ ان دونوں امور کے بعد یعنی علوم جدید کی تنقید و تحقیق اور اسلامی ورثے کے تجزیہ و تنقید کے بعد اگلا مرحلہ اسلامی ورثہ کے مختلف پہلوؤں اور جدید علوم وفنون کی مختلف شاخوں کے مابین تعلق کی تعیین وتجدید ہے۔ یہ کام اس لیے ضروری ہے کہ قدیم وجدید علوم کے مابین ہم آہنگی اور امتزاج پیدا کرنے کی حدود وشرائط کا پہلے سے تعین کر لیا جائے اور دونوں کے درمیان ایسا امتزاج پیدا کیا جائے جو توازن، جامعیت اور اعتدال کے اوصاف سے متصف ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ قدیم علمائے اسلام نے علوم وفنون کی جو تقسیم کی تھی، اس کا بھی از سرنو جائزہ لیا جائے۔ فارابی کے ''احصاء العلوم'' سے لے کر متاخرین کی تحریروں (مثلاً قاضی عبدالنبی ابن عبدالرسول احمد نگری کی ''دستور العلماء'' اور علامہ محمد اعلیٰ تھانوی کی ''کشاف اصطلاحات الفنون'') تک علوم وفنون کی تقسیم کا ایک خاص انداز چلا آ رہا ہے۔ اب اس پر نئے علمی حقائق اور رجحانات کے سیاق وسباق میں دوبارہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس کو باقی رکھنا ہے تو جدید مغربی علوم کے قابل قبول اجزا کو اس قدیم تقسیم میں سمونا پڑے گا تاکہ اسلامی علوم وفنون کی روایتی ساخت اور قدیم تشکیل کو برقرار رکھتے ہوئے نئے علوم وفنون اور علمی وفکری تجربات کو اس کا حصہ بنایا جا سکے، لیکن اگر اس قدیم تقسیم پر نظر ثانی کرنا ہو اور نئے علوم وفنون کی رعایت سے کسی نئی تقسیم کی ضرورت محسوس ہو تو پھر مختلف میدانوں میں نئے تخصصات کے حوالے سے قدیم وجدید کی اس ہم آہنگی کے عمل کی ضرورت اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔

۸۔ ہم آہنگی، تشکیل نو اور ترتیب نو کے بعد آٹھواں مرحلہ مستقبل کی سمت میں نئے سفر کے آغاز کا ہے۔ اس مرحلے میں امت کو درپیش اہم مسائل کا جائزہ اور ان کا ایک ایسا قابل عمل حل پیش کرنے کی ضرورت ہے جو دور جدید کی تمام مشکلات اور مسائل کو حل کر سکے۔ اس وقت امت کو جو بڑے بڑے فکری چیلنج درپیش ہیں، وہ ایک غیر معمولی بصیرت، طویل غور وخوض اور اجتماعی مشاورت

کے متقاضی ہیں۔ جب تک ایسے مسائل بلکہ چیلنجوں کا احاطہ نہ کرلیا جائے، اس وقت تک اسلامی علوم وفنون کی واقعی اور حقیقی تدوین نو کا عمل تشنہ تکمیل رہے گا۔

۹۔ اگر اسلام پوری انسانیت کا دین ہے، اگر اسلامی تہذیب واقعتاً ایک عالمی تہذیب ہے، اگر اسلام کے پاس انسان کے ہر دکھ کا علاج موجود ہے تو پھر مسلمانوں کا یہ دینی اور ملی فریضہ ہے کہ جہاں وہ امت کو درپیش بڑے بڑے مسائل کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائیں، وہاں امت کے دائرے سے باہر بسنے والے انسانوں کے مسائل کو نظر انداز نہ کریں۔ انسانیت کے مسائل کا جائزہ ایک ہمدرد اور انسان دوست روحانی معالج اور معاشرتی طبیب کی حیثیت سے لینا اور ان کا حل تجویز کرنا انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت کا ایک اہم پہلو ہے۔ دنیا کو اسلام کے نقطہ نظر سے باخبر اور بالآخر اس کا ہم خیال اور گرویدہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ انسانیت کے مسائل مفکرین اسلام کی اولین ترجیحات میں شامل ہوں۔

۱۰۔ دسواں مرحلہ اب تک کیے جانے والے فکری اور تحقیقی کام کو اس طرح مرتب کرنا ہے کہ مشرق ومغرب میں ہونے والی فکری تخلیقات ایک دوسرے سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو جائیں اور ایک ایسا امتزاج وجود میں آجائے جو اسی طرح توحید کی اساس پر قائم ہو جس طرح صدر اسلام میں ائمہ اسلام کی تحقیقات وتخلیقات ہوا کرتی تھیں۔

۱۱۔ ان سب مراحل کے بعد آخری اور تکمیلی مرحلہ اسلامی علوم وفنون کی اس نئی تحسین وتکمیل کا ہوگا جو دراصل اسلام کے تہذیبی احیا کا مقدمۃ الجیش بھی ہوگی اور اس کی غماز بھی۔ اسلامی خطوط پر علوم وفنون کی حتمی تشکیل نو کا یہ عمل ایک دیرپا عمل ہوگا جو شاید صدیوں میں مکمل ہو لیکن جس کے اثرات کئی ہزاریوں تک پھیل سکتے ہیں۔

اسلامی علوم وفنون کی تدوین نو کا یہ کام ایک ہمہ پہلو تعلیمی اور فکری جدوجہد کا تقاضا کرتا ہے۔ اس جدوجہد میں بعض نئے مسائل پر اجتہادی نقطہ نظر سے غور وخوض بھی شامل ہے اور بعض اجتہادی آرا پر ازسرنو ناقدانہ نظر ثانی بھی ناگزیر ہے۔ دور جدید نے بعض ایسے مسائل ومعاملات ہمارے سامنے پیش کردیے ہیں جو سلف کے سامنے نہیں تھے، اس لیے ماضی میں مجتہدین امت اور مفکرین اسلام

کوان پر کوئی رائے قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔مثال کے طور پر ایک کثیر العناصر (pluralistic) معاشرے میں اسلام کا کردار کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو بیسویں صدی کے اواخر میں سامنے آیا، بالخصوص مجاہدین افغانستان کے ہاتھوں سوویت یونین کی تباہی اور بالآخر کمیونزم کے زوال کے نتیجے میں جو یک قطبی دنیا سامنے آئی تو اس مسئلے کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔اب ایک طرف تو مغرب کے بالا دست فاتحین کی کوشش یہ ہے کہ تاریخ کے خاتمے کا اعلانات اور تہذیبوں کے تصادم کے پردوں میں ایک یک عنصری نظام دنیا پر مسلط کر دیں اور دوسری طرف کثیر العناصر نظاموں کی تلاش کے نام پر دوسروں کے معاملات میں مداخلت کا جواز پیدا کریں۔ان حالات میں مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ قرآن وسنت کی نصوص اور فقہاے اسلام کی تصریحات کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کا تعین کریں کہ ایک مسلم معاشرے میں دوسری تہذیبوں اور ثقافتوں کی بقا کیونکر اور کن حدود کے اندر رہ کر ہو سکتی ہے اور ایک غیر مسلم معاشرے میں اسلامی ثقافت اور اسلامی تمدن کا تحفظ کیسے کیا جا سکتا ہے۔

آج دنیا کا کوئی بڑا شہر ایسا نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ نہ ہو رہا ہو، جہاں آئے دن مسلم تنظیمیں قائم نہ ہو رہی ہوں، جہاں مسجدیں اور اسلامی مراکز پھل پھول نہ رہے ہوں، جہاں قدیم اور جدید مسلمانوں کے مابین تفاعل نہ ہو رہا ہو،ان شہروں میں تیزی سے پھیلنے والی مسلم آبادیاں جہاں اپنے آپ کو سیاسی،اقتصادی اور ثقافتی طور پر منظم نہ کر رہی ہوں۔مشرق ومغرب کے غیر مسلم ممالک میں بسنے والے یہ لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلم نوجوان اپنے تشخص کا تحفظ اور اپنی شخصیت کا اظہار چاہتے ہیں۔ان حالات میں ان کو آئے دن نت نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔شریعت اسلامی کی رو سے ان مسائل کا حل کیا ہے،ان سب سوالات کا شافی جواب آج اہل علم کے ذمے ایک قرض اور فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ماضی میں یہ صورت حال اتنی شدید اور وسیع نہیں تھی جتنی آج ہو چکی ہے۔اس کی شدت اور وسعت میں روز بہ روز تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ہر آنے والا دن ایک نیا مسئلہ لے کر طلوع ہوتا ہے۔

ہماری قدیم فقہی کتابیں اسلام کے دور عروج میں مرتب ہوئیں۔مجتہدین اسلام نے اسلامی

ریاست، اسلامی تہذیب، اسلامی ثقافت، اسلامی معاشرہ اور اسلامی زندگی کے ایسے مسائل تو نہایت باریک بینی اور دقت نظر سے مرتب کر دیے جو مسلمانوں کو اپنے دور عروج میں پیش آئے یا جن سے مسلمانوں کو مسلم ماحول میں واسطہ پڑتا ہے۔ رہے وہ مسائل جو ایک مسلم اقلیت کو پیش آتے تھے یا غلامی کی زندگی گزارنے والے مسلمانوں کو پیش آ سکتے تھے، ان سے فقہائے اسلام کو زیادہ اعتنا کرنے کا موقع نہ ملا اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی۔ اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب مسلمانوں کو سیاسی زوال کا سامنا کرنا پڑا تو یہ وہ زمانہ تھا جب فقہ اسلامی بھی ایک طرح کے تعطل کا شکار تھی اور دور انحطاط سے گزر رہی تھی۔ اجتہاد کا سلسلہ تقریباً بند ہو چکا تھا اور علمائے اسلام بالعموم دور انحطاط میں لکھی ہوئی فقہی کتابیں اور متون کی شرحوں اور حاشیوں کے پڑھنے پڑھانے میں مصروف تھے۔ ان حالات میں مغربی ممالک میں جا کر بسنے والے مسلمانوں کی راہنمائی کا خاص سامان فراہم نہ ہوا اور یہ لوگ مختلف مغربی معاشروں میں جا جا کر گم ہوتے رہے۔ آج نئی تحقیقات اور تاریخی انکشافات سے ان لاتعداد مسلم آبادیوں کا پتہ چل رہا ہے جو امریکہ، آسٹریلیا، برازیل اور ارجنٹائنا جیسے بڑے ممالک کے سمندروں میں گم ہو گئیں۔ اگر اٹھارویں صدی کے اوائل ہی سے کسی فقہ الاقلیات پر غور وخوض کی داغ بیل ڈال دی جاتی اور ایسے غیر موافقانہ ماحول میں مسلم وجود کے احکام پہلے سے مرتب شدہ موجود ہوتے تو شاید یہ مسلمان آبادیاں یوں آسانی اور تیزی سے گم نہ ہوتیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ آج فقہائے اسلام اور علمائے امت کی یہ اولین ذمہ داری ہے کہ ان بدلتے ہوئے حالات میں پیش آنے والے سوالات اور نت نئی مشکلات کا ایسا قابل عمل حل پیش کریں جو غیر مسلم ماحول میں مسلم وجود کے تحفظ اور بقا کا ضامن ہو۔

اس معاملے کا ایک اور اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آج کے حالات کی مناسبت سے مسلم معاشرے اور مسلم ریاست کی تجدید نو کی جائے اور جدید معروضی حقائق اور فکری مباحث کے پس منظر میں واضح کیا جائے کہ اسلامی معاشرے کی تعریف کیا ہے اور اسلامی ریاست آج کے سیاق وسباق میں کس ریاست کو کہا جائے گا۔ اس بات کی ضرورت اس لیے پیش آ رہی ہے کہ فقہائے اسلام نے آج سے کم وبیش ایک ہزار دو سو سال قبل دارالاسلام، دارالحرب اور دارالصلح وغیرہ کی جو حد بندیاں تجویز کی تھیں،

وہ آج کے زمینی حقائق کی روشنی میں اجنبی معلوم ہوتی ہیں۔ خود فقہاے اسلام کو ابتدائی دوتین صدیوں میں ہی ان تقسیمات پر کئی بار از سرِ نو غور وخوض کرنا پڑا۔ دوسری صدی ہجری کے نصف اول کے زمینی حقائق کی روشنی میں امام ابوحنیفہؒ (متوفی ۱۵۰ھ) کے فہم اسلام کی رو سے روے زمین کو صرف دوحصوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے تھا، یعنی دارالحرب اور دار الاسلام، لیکن جلد ہی امام شافعیؒ (متوفی ۲۰۴ھ) بلکہ خود امام ابوحنیفہؒ کے تلامذہ کو اس تقسیم پر دوبارہ غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور انہوں نے دار الاسلام اور دار الحرب کی دوگانہ تقسیم کے مابین دارالعہد اور دارالصلح کی درمیانی تقسیمیں تجویز کرنا ضروری سمجھا۔ کچھ اور بعد کے فقہا نے دار العدل، دارالبغی اور ایسی ہی دوسری تقسیموں کی ضرورت محسوس کی۔ آج کے بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں جدید زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ان تمام تقسیموں پر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کوئی ایک ملک نہ دنیا سے بالکل لاتعلق ہوکر رہ سکتا ہے اور نہ کسی ملک سے تعلق کی وہ نوعیت ہو سکتی ہے جو فقہاے اسلام نے دارالحرب کے حوالے سے سوچی تھی، یہاں تک کہ جن ممالک سے مسلمان عملاً برسرِ جنگ ہیں (مثلاً ہندوستان، اسرائیل، روس اور فلپائن) ان کو بھی کلی طور پر دارالحرب قرار دینا اس لیے مشکل ہے کہ فقہاے اسلام نے اس وقت دارالحرب کی جو شرائط بیان کی تھیں، ان میں سے کئی شرائط ان ممالک میں نہیں پائی جاتیں۔ اسی طرح کئی ایسے ممالک جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، جہاں مسلمانوں کی خودمختار حکومتیں بھی ہیں، جہاں انہیں مذہبی مراسم اور مذہبی تعلیم کی آزادی بھی حاصل ہے، لیکن وہ خود کو آئینی طور پر سیکولر یعنی لامذہبی ریاست قرار دیتے ہیں۔ ان کو نہ شاید دارالاسلام کے زمرہ میں رکھا جا سکتا ہے اور نہ غالباً ان کو دارالحرب قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہ اور اس طرح کے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کے پیش نظر ایک نئی تقسیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور نصوص اور فقہاے اسلام کے متفق علیہ اجتہادات کو سامنے رکھتے ہوئے ان حدود کا آسانی سے تعین کیا جا سکتا ہے جن کے ذریعے جدید بین الاقوامی تعلقات اور میل جول کے معاملات کو نئے انداز سے منظم کیا جا سکے۔

اسی طرح کا ایک اور مسئلہ گزشتہ چند سالوں کے درمیان ہونے والی بحثوں کے نتیجے میں پیدا ہوا

ہے۔ یہ بحثیں جو مشہور امریکی فضلا سموئیل ہن ٹنگٹن اور فوکویاما کی تحریروں سے شروع ہوئی تھیں، اس وقت دنیا میں بحث ونظر کا موضوع بنی ہوئی ہیں۔ ہن ٹنگٹن نے تہذیبوں کے تصادم کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس نے مستقبل کی ممکنہ تہذیبی جنگ یا کم از کم کشمکش کے بارے میں مسلمانوں کے لیے اہمیت رکھنے والے متعدد سوالات اٹھائے ہیں۔ تہذیبوں کے اس تصادم میں اسلام کا رویہ کیا ہوگا؟ جس چیز کو اسلامی تہذیب کہا جاتا ہے، اس کے تحفظ اور بقا کے لیے مسلمانوں کو کس حد تک جانا چاہیے؟ کیا اسلامی تہذیب کے مادی اور فنی مظاہر (مثلاً تاج محل اور الحمرا) اسی طرح دفاع کے مستحق ہیں جس طرح اسلامی تہذیب کے فکری اور تعلیمی امتیازات (مثلاً اسلامی علوم، کلام اور اصول فقہ وغیرہ)؟ تہذیبوں کے اس ممکنہ تصادم یا کشمکش میں مذاہب کی روایتی تقسیم (مذاہب اہل کتاب، شبہ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب) کی حیثیت کیا ہوگی؟ تہذیبوں کے اس تصادم کے دوران مسلمانوں کی ذمہ داری کیا ہوگی؟ اس باب میں کیا مسلم حکومتوں، مسلم عوام اور مسلم اقلیتوں کی ذمہ داریوں کے مابین فرق کیا جائے گا؟ اگر تہذیبوں کا یہ تصادم شروع ہوا تو دنیائے اسلام میں اس وقت قائم قومی ریاستوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ قومی ریاستوں اور تصورامت کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کی کیا صورت ہوگی؟ دنیائے اسلام کے وہ علاقے جہاں بہت سے لوگ خود کو مغربی تہذیب کا تسلسل قرار دیتے ہیں، ان کا طرز عمل اس تصادم کے دوران کیا ہونا چاہیے؟ یہ اور ایسے بے شمار سوالات ہیں جو ایک اجتہادی بصیرت کے متقاضی ہیں۔ ان سوالات کا جواب نہ محض فقہی اسلوب استدلال سے کام لے کر دیا جاسکتا ہے اور نہ محض متکلمین اسلام کی تحریروں سے۔ اس کام کے لیے نہ صرف قرآن مجید پر گہری نظر اور پیغام قرآن میں عمیق بصیرت کی ضرورت ہے بلکہ فکر اسلامی میں مہارت، تصوف اور کلام سے واقفیت اور تاریخ اسلام پر گہری نظر کے ساتھ ساتھ جدید مغربی افکار بالخصوص فلسفہ تاریخ اور معرکہ مذہب وسائنس کی تاریخ اور نشیب وفراز سے ناقدانہ واقفیت بھی ضروری ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم میں اس کی گنجایش ہے کہ ایسے اصحاب بصیرت پیدا ہوسکیں جو اس طرح کے چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے میں امت مسلمہ کی راہنمائی کر سکیں؟ اکیسویں صدی میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کا کم از کم ایک بنیادی ہدف ایسے افراد کار کی

تیاری بھی ہونا چاہیے۔

اسلامی علوم وفنون کی تدوین نو کے حوالے سے ایک اہم مسئلہ جو جدید دینی تحریکات اور تحریکی فکر کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے، وہ جہاد اور دعوت کے رشتہ شکستہ کی بازیابی ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائیوں میں جب پہلی جنگ عظیم میں کامیابی کے بعد سلطنت برطانیہ کا آفتاب نصف النہار پر معلوم ہوتا تھا، جب لینن اور اسٹالن کی سربراہی میں کمیونزم کی جبروتی طاقت سامنے آئی، جب ہٹلر اور مسولینی کی قائم کردہ کلیت پسندانہ اور مستبدانہ سلطنتیں وجود میں آئیں تو دنیائے اسلام میں بہت سے حساس اور مخلص خادمین اسلام نے یہ محسوس کیا کہ دنیائے اسلام کی کمزوری اور ادبار کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ امت مسلمہ کی پشت پناہی کے لیے کوئی ایسی بڑی سلطنت موجود نہیں جو مذکورہ بالا ریاستوں کے مقابلے میں کھڑی ہو سکے اور ان کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر اسلام کے موقف کو بیان کر سکے۔ اس احساس نے، جس کی بنیادیں اخلاص اور دردمندی کے خمیر سے اٹھی تھیں، متعدد طاقتور اسلامی تحریکات کو جنم دیا۔ ان تحریکوں کی صفوں سے ایسے بہت سے اہل قلم اور ارباب صحافت سامنے آئے جنھوں نے ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی لازمی شرط اور خشت اول کے طور پر اسلامی ریاست کے وجود کو لازمی قرار دیا اور یوں بیسویں صدی کے وسط سے لے کر آئندہ کم وبیش پچاس سال کے دوران یہ بحث معاصر اسلامی فکر کی شاید سب سے اہم بحث بن گئی جس نے دنیائے اسلام میں مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو متاثر کیا اور اس طرح احیائے اسلام اور اقامت دین کی اصطلاحیں تاسیس ریاست کے مترادف بن گئیں۔ ان مباحث میں جہاد اور دعوت کی اصطلاحات کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا، لیکن اکثر وبیشتر یہ دونوں اصطلاحات ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال ہوئیں، حالانکہ یہ دونوں اصطلاحات مسلمانوں کی دینی ذمہ داریوں کے دو مختلف مراحل کی نمائندگی کرتی ہیں۔

اسلامی تعلیم کی بنیادی روح ایمان کامل، تعلق مع اللہ اور اخروی کامیابی کا حصول ہے۔ اسلام کا مزاج داعیانہ ہے، فاتحانہ نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاصر حکمرانوں کو جتنے بھی تبلیغی والا نامے تحریر فرمائے، ان میں سے بہت سے والا ناموں میں یہ بات قدر مشترک کی حیثیت رکھتی تھی کہ اگر تم

اس پیغام کو قبول کرلو تو تمہاری حکومت برقرار رہے گی اور تمہارا اقتدار قائم رہے گا۔ اسلامی دعوت کی تاریخ میں یہ بات انتہائی اہمیت رکھتی ہے کہ آغاز وحی سے لے کر ریاست مدینہ کے قیام اور سنہ ۲ ہجری میں میثاق مدینہ کی تحریر و تدوین تک کا یہ سارا پندرہ سالہ عمل ایک انتہائی پرامن تبدیلی کے عمل سے عبارت تھا۔ بغیر ایک قطرہ خون بہائے اور تلوار ہاتھ میں لیے ایک مسلم معاشرہ اور مسلم ریاست وجود میں آ گئی۔ جہاد بالسیف کی اجازت اس وقت دی گئی جب اس ریاست پر بیرونی حملوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دعوت اور جہاد کے مابین اس نہایت اہم تاریخی ترتیب کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں اصل دعوت ہے اور جہاد بالسیف اس کا ایک ناگزیر مرحلہ۔ یوں بھی قرآن مجید کی متعلقہ نصوص کی رو سے جہاد کی بہت سی قسموں (جہاد بالمال، جہاد بالقرآن، جہاد بالنفس) کے ساتھ جہاد بالسیف ایک مرحلہ ہے، اگرچہ وہ اپنی اہمیت اور فضیلت کے اعتبار سے بقیہ تمام مراحل سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

بیسویں صدی کی اسلامی تحریکات میں جو مزاج تیار ہوا اور جو ادب سامنے آیا، اس میں دعوت اور جہاد کے ان مراحل اور ترتیب کا لحاظ رکھنے کی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شعوری کوشش نہ کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دعوت کا خالص نبوی اسلوب پس منظر میں چلا گیا اور مغربی انداز کے سیاسی عمل اور سیاسی تنظیم نے اس کی جگہ لے لی۔ سیاسی سرگرمیوں کا یہ انداز خالص دعوتی انداز سے چونکہ خاصا مختلف تھا، اس لیے جب ان سرگرمیوں کو دینی مکالمے اور دینی محاورے میں بیان کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس میں جہاد کی اصطلاح زیادہ موزوں اور قریب الفہم محسوس ہوئی، اس لیے اس کو بلا تکلف استعمال کیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاد کے وہ تمام مستلزمات جو جہاد بالسیف کے ساتھ خاص ہیں، روزمرہ کے سیاسی عمل کا لازمی حصہ سمجھے جانے لگے اور یوں دینی تحریکات کے پرجوش کارکنوں کے ذہنوں میں معمول کا مغربی انداز کا سیاسی عمل ایک جہادی سرگرمی بن گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اس میں شدت پیدا ہوتی گئی تو اس کا اظہار شدت پسندانہ اور بعض اوقات دہشت پسندانہ انداز میں ہونے لگا۔ گزشتہ چوتھائی صدی کے دوران مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک پھیلی ہوئی بہت سی اسلامی تحریکات کے کارکنوں کی شدت پسندی کے اسباب فکری

پس منظر میں تلاش کیے جانے چاہییں۔

ان حالات میں مسلمان اہل علم اور مفکرین کی یہ ذمہ داری ہے کہ جہاد اور دعوت کے گرد گھومنے والے اس نئے علم کلام کا ازسرنو جائزہ لیں اور یہ واضح کریں کہ دعوت اور جہاد کا رشتہ کیا ہے اور یہ کہ دور جدید کے مغربی انداز کے عام سیاسی عمل کی اسلام میں کیا حیثیت ہے، اور یہ کہ اس عمل کو کب اور کس طرح دعوتی رنگ دیا جانا چاہیے اور کب اور کن حالات میں اس عمل کو جہاد بالسیف میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

جہاد کے سیاق وسباق میں جہاں دعوت و جہاد کے رشتہ شکستہ کی بحالی ضروری ہے اور جہاں اسلام کے داعیانہ (بمقابلہ فاتحانہ) کردار کی اہمیت پر زور دینے کی ضرورت ہے، وہاں جہاد اصغر (جہاد بالسیف) اور جہاد اکبر (جہاد بالنفس) کا تعلق یاد دلانا بھی ضروری ہے۔ عدل، وفائے عہد، احساس ذمہ داری، نظم، سمع و طاعت اور اس طرح کے بہت سے احکام جہاد کے لازمی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان عناصر کے بغیر اگر تلوار اٹھائی جائے گی تو وہ فتنہ اور افراتفری پیدا کرے گی اور اس سے جہاد کے تقاضے پورے نہ ہوں گے۔ تلوار آخری چارہ کار ہے، اس لیے پہلے دعوت اور اس کے مراحل، تالیف قلب اور اس کے مراحل اور دشمن پر پرامن دباؤ کے مراحل کا گزرنا ضروری ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ جدید اسلامی فکر کے نمائندہ بعض انتہائی محترم اسلامی مفکرین کی تحریروں سے جو یک طرفہ رجحان جنم لے رہا ہے، اس میں توازن پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس عدم توازن کی بڑی وجہ سلف کی احتیاط، توازن اور جامعیت کا نظروں سے اوجھل ہو جانا ہے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے نئے معاملات ہیں جو سنجیدہ اور گہرے غور و خوض کے متقاضی ہیں۔ اسلامی علوم وفنون کی تدوین نو کا یہ عمل ان بنیادی تصورات اور مفاہیم کی تصحیح و توضیح کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔

اسلامی علوم وفنون کی تدوین نو پر گفتگو نامکمل رہے گی اگر ہم روایتی مذہبی تعلیم اور اس کے رائج الوقت اسالیب پر گفتگو نہ کریں۔ ان اسالیب میں سب سے نمایاں پہلو قدیم انداز کا وہ نظام تعلیم ہے جو انڈونیشیا، ملائشیا، بنگلہ دیش، بھارت، پاکستان اور افغانستان وغیرہ میں دینی مدارس کے نام سے معروف ہے۔ یہ دینی مدارس جو اپنی پشت پر ایک نہایت تابناک فکری اور علمی تاریخ رکھتے ہیں،

بعض پہلوؤں سے مسلمانوں کی نہایت روشن تعلیمی روایت کا تسلسل ہیں۔ جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے، یہ مدارس جامعیت اور توازن کی اس روایت کا ایک مظہر ہیں جو مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ اور علمی روایات کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔ برصغیر میں جس تعلیمی روایت کی پیداوار شیخ احمد سرہندی جیسے عظیم مذہبی عبقری، نواب سعد اللہ خان جیسے بالغ نظر مدبر اور منتظم اور استاد احمد خان معمار جیسے بے مثال معمار اور مہندس تھے، وہ روایت اگرچہ انگریزی استعمار کے ساتھ ہی دم توڑ چکی تھی، تاہم اس کی جھلکیاں وقتاً فوقتاً دیکھنے میں آتی رہی ہیں۔ آزادی کے بعد ضرورت اس بات کی تھی کہ جدید آزاد دنیائے اسلام کے تقاضوں اور ضروریات کے پیش نظر دینی تعلیم کے مقاصد اور اہداف واضح طور پر متعین کیے جائیں اور ان اہداف و مقاصد کے پیش نظر جامع اور مناسب نصابات کی تدوین کی جائے، لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہ ہوا۔ کم از کم برصغیر کی حد تک صورت حال یہی ہے کہ صدیوں پرانا درس نظامی رائج ہے جو بعض محدود مقاصد کے لیے تو کارآمد ہو سکتا ہے لیکن اس سے ایک جدید آزاد اسلامی ریاست کے دینی و تعلیمی تقاضے کما حقہ پورے نہیں کیے جا سکتے۔ آج جو طلبا درس نظامی کی تعلیم پا کر نکلتے ہیں، ان کی غالب اکثریت مساجد میں امامت اور خطابت کے فرائض انجام دیتی ہے۔ مساجد کی امامت اور خطابت کے تقاضے بھی درس نظامی کی تعلیم سے کما حقہ پورے نہیں ہوتے۔ آج کے ایک دینی خطیب کو جن سوالات سے آئے دن واسطہ پڑتا ہے، ان میں بیشتر کا جواب درس نظامی کی کتابوں میں موجود نہیں۔ درس نظامی میں پڑھائے جانے والی منطق اور فلسفے کی قدیم کتابوں کے قدیم مباحث کی مساجد کی امامت میں کہیں ضرورت نہیں پڑتی، اس لیے کم از کم ائمہ مساجد کی حد تک مکمل درس نظامی کی تعلیم پر اصرار وقت اور وسائل دونوں کا ضیاع ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں دینی تعلیم کے بارے میں چند گزارشات پیش کرنے سے قبل رائج الوقت دینی نصاب تعلیم یعنی درس نظامی اور دینی مدارس کے نظام کے بارے میں مختصر گفتگو کی جائے۔ یہ مختصر گفتگو درس نظامی کے تاریخی پس منظر اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے جائزے پر مشتمل ہوگی۔

واضح ہونا چاہیے کہ درس نظامی پر گفتگو محض ایک نصاب تعلیم پر گفتگو نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی تعلیمی

روایت، تہذیبی ورثے اور ماضی پر گفتگو ہے جس کے ہماری ملی اور اجتماعی زندگی پر بڑے گہرے اثرات ہیں۔ گزشتہ دو سو سال کے دوران برصغیر میں جو دینی قیادت سامنے آئی، ان میں غالب تعداد، جیسا کہ اشارہ کیا گیا، ان حضرات کی تھی جو درس نظامی کے پس منظر سے تعلیم پا کر آئے تھے۔ اس دوران جو دینی فکر ہمارے سامنے آئی، اس پر درس نظامی کے بنیادی فلسفے اور روح کے نہایت واضح اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس درس نظامی کے مثبت و فعال کردار یا منفی پہلو (اگر کوئی ہے) پر ناقدانہ گفتگو اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان سارے مسائل کو سمجھنا اور ان کی روشنی میں مستقبل کا ایک نقشہ کار اور ممکنہ اصلاح کے لیے خاکہ تیار کرنے کے لیے یہ جائزہ لینا اور ایسی ناقدانہ گفتگو کرنا ناگزیر ہے۔ برصغیر اور دنیاے اسلام کو کن کن مسائل کا سامنا ہے؟ ان مسائل کا حل کن خطوط پر کام کرنے سے ہوگا؟ علماے کرام کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ دینی قیادت کے کیا تقاضے ہیں؟ ان سب سوالات کا جواب [illegible] سارے نقشے پر غور کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ دینی تعلیم کے باب میں ماضی کا سارا تجربہ اور حال کی صورت حال کا ہمیں صحیح صحیح اندازہ ہو، ورنہ ہم مستقبل کی منظر کشی اور نقشہ سازی نہیں کر سکیں گے۔

برصغیر میں اسلامی فکر اور اسلامی تعلیم کا تاریخی جائزہ لیا جائے تو یہاں کئی ادوار سامنے آتے ہیں۔ برصغیر میں اسلامی تعلیم کا آغاز ایک انتظامی ضرورت کے تحت ہوا۔ محمود غزنوی فقہ شافعی کا پیرو تھا، اس لیے اس کے ہاتھوں اور بعد میں بھی یہاں جو اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں، ان سب کا نظام فقہ شافعی کی بنیاد پر استوار ہوا۔ ان حکومتوں کے کارندوں کی اکثریت فقہ شافعی کی پیروکار تھی۔ لیکن بعد میں مختلف اسباب کی بنا پر فقہ حنفی مروج ہوگئی اور سلطنت کا سارا نظام شریعت کے مطابق، جیسا کہ فقہ حنفی میں اس کی تعبیر ہے، جاری ہوگیا۔ اس کام کے لیے ایسے افراد کار اور ماہرین کی ضرورت تھی جو نہ صرف دفتری اور عدالتی فرائض انجام دے سکیں، بلکہ نئی سلطنت کی دینی قیادت کے فرائض بھی انجام دے سکیں۔ اس مقصد کے لیے ایک نظام تعلیم وضع کیا گیا جس میں سب سے بنیادی مضمون کی حیثیت علم فقہ اور اس کے متعلقات کو حاصل تھی، اس لیے کہ نظام ریاست وقضا کو چلانے کے لیے فقہی علوم میں مہارت ناگزیر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طویل عرصے تک ہمارے نصاب تعلیم میں فقہ کو بنیادی اہمیت

حاصل رہی۔ باقی علوم کی تدریس فقہ اور اصول فقہ کی اعلیٰ فنی کتابوں کے سمجھنے کے لیے طلبا کو تیار کرنے کی خاطر تھی۔

اول اول برصغیر کے نصاب میں حدیث اور تفسیر کی کتابیں یا تو سرے سے شامل ہی نہ تھیں یا محض برائے نام شامل تھیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ جب حج کے لیے تشریف لے گئے تو پہلی بار مشکوٰۃ کا نسخہ ساتھ لائے۔ اس کے بعد ہی برصغیر میں اسلامی تعلیم کی تاریخ میں غالباً پہلی بار باقاعدہ طور پر علم حدیث کی درسی کتاب کے طور پر مشکوٰۃ شریف مروج ہوگئی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ حج سے واپسی پر موطا امام مالکؒ ساتھ لے آئے تو مشکوٰۃ شریف اور موطا دونوں رائج ہوگئیں۔ بہت بعد میں دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو پوری صحاح ستہ درس نظامی کے ایک تتمے کے طور پر آخری سال میں شامل کر لی گئی۔

اس مختصر تمہید سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ نصاب عمومی انداز میں ایسا نصاب نہیں تھا جو اصلاً دینی علوم میں تخصص پیدا کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ یہ کام لوگ انفرادی طور پر ماہر علما کی خدمت میں رہ کر کیا کرتے تھے۔ بنیادی نصاب فقہ ہی کا تھا، کیونکہ اس وقت فقہ میں مہارت حاصل کیے بغیر قضا، احتساب اور دیگر سرکاری مناصب نہیں ملتے تھے، اس لیے انتظامی ضرورت کے تحت فقہ اور پھر فقہ کو سیکھنے کے لیے اصول فقہ لازمی ٹھہرا۔ اصول فقہ کے لیے منطق اور فلسفہ اور دیگر معاون کتب لازمی تھیں۔ ان خطوط اور ضروریات کی بنیاد پر ترتیب پانے والا یہ نصاب ہندوستان میں ایک ہزار برس جاری رہا۔ اس طویل عرصے میں مختلف کتابیں مقبول ہوئیں اور مختلف شارحین اور مصنفین مقبول ہوئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف ادوار میں کتابوں اور شارحین کے انتخاب میں اس دور کے تقاضے کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

جب مغلیہ سلطنت کمزور پڑ گئی اور انگریزوں نے طاقت پکڑنا شروع کی تو بندرگاہوں پر اپنا تسلط مکمل کرنے کے لیے انہوں نے بمبئی، مدراس اور کلکتہ پر قبضہ کرلیا اور بالآخر بہار اور یوپی کے کچھ حصہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ اس کے بعد مرکزی حکومت نے انگریزوں کو ایک موثر قوت کے طور پر تسلیم کرلیا اور مغلیہ سلطنت اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ انتقال دیوانی طے پایا۔ اس معاہدے کا

درس نظامی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ معاہدے میں طے پایا گیا تھا کہ انگریز ان دونوں صوبوں کے عدالتی نظام کو نہیں چھیڑیں گے، بلکہ مسلمان عدالتیں اور مسلمان قاضی ہی شریعت محمدی کے مطابق فیصلے کریں گے۔ انگریزوں نے غالباً وقتی سیاسی مصالح کی خاطر یہ بندوبست تسلیم کرلیا، چنانچہ ان دونوں صوبوں میں نظام عدالت قائم کرنے اور دیگر انتظامی امور کی تفصیلات مرتب کرنے کے بعد ان کو یہ جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ شریعت کے لیے فقہ حنفی کے ماہرین کہاں سے لائے جائیں۔ چونکہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں نظام تعلیم آزاد تھا اور یہ اسلامی روایت ہر جگہ رہی ہے کہ نظام تعلیم حکومتوں کے کنٹرول سے باہر اور آزاد ہو، اس لیے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کئی آزاد نصابات تعلیم جاری تھے۔ ان میں خیرآبادی، فرنگی محلی اور دہلوی علما کے اختیار کردہ نصابات زیادہ مشہور ہوئے۔ یہ صورت حال شاید انگریزی مزاج کے لیے زیادہ قابل قبول نہ تھی، کیونکہ ان کی روایت یہ تھی کہ نظام تعلیم حکومت کے کنٹرول میں ہی ہو۔ اس لیے وہ جاننا چاہتے تھے کہ اسے حکومتی کنٹرول میں کیسے لائیں، نیز وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ ماہرین شریعت کا انتخاب کس بنیاد پر کریں! انہیں بعض علما نے مشورہ دیا کہ درس نظامی سے استفادہ اس معاملہ میں نہ صرف آسان رہے گا بلکہ عملی مشکلات کے لحاظ سے دوسرے نصابات کے مقابلہ میں نسبتاً بہت مفید ہوگا۔ یہ وہ نصاب تھا جس کی اٹھان فرنگی محل کی روایت سے ہوئی جس میں خیرآبادی روایت کے عناصر بھی سمو دیے گئے۔ چنانچہ ملا نظام الدین نے، جو اس وقت زندہ تھے، اس ضرورت کی خاطر یہ نصاب مرتب کیا۔ انہی کے نام کی مناسبت سے یہ نصاب درس نظامی کہلاتا ہے۔ بعض لوگ غلط فہمی سے اس کا تعلق بغداد کے نظامیہ سے جوڑتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ اس میں اسی فیصد وہ کتب ہیں جو نظامیہ بغداد کے بعد بہت کی ہیں۔ ملا نظام الدین نے برصغیر کی روایات کے مطابق سارے تعلیمی ورثے کو سامنے رکھ کر ایک نصاب تیار کیا جس کی کئی ایک خصوصیات نمایاں تھیں:

بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا بڑا حصہ تین بنیادی علوم فقہ، اصول فقہ اور منطق پر مشتمل تھا۔

دوسری خصوصیت یہ تھی کہ جتنے علوم اس زمانے میں مسلم ہندوستان میں مروج تھے، وہ اس میں شامل تھے۔ کوشش یہ تھی کہ اس نصاب کا فارغ کسی رائج الوقت علم سے بالکل ناواقف نہ ہو، چاہے وہ

سائنس ہو، طب ہو، انجینئرنگ ہو، جو بھی اس زمانے کی سائنس اور انجینئرنگ تھی، وہ اس میں شامل تھی۔ اقلیدس، الجبرا، جیومیٹری اور ریاضی کے مضامین اس زمانے میں بھی نصاب شامل تھے۔ آزاد معاش کا طریقہ اختیار کرنے میں مدد دینے کے لیے طب شامل نصاب تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس درس کے پڑھے ہوئے بے شمار لوگ طبیب، مہندس، منتظم اور معمار ہوئے۔ (درس نظامی سے پہلے جو شکل نظام تعلیم کی تھی، اسے ہم درس نظامی کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں) چنانچہ وہ ماہر مہندس جس نے تاج محل تعمیر کیا یعنی استاد احمد معمار، وہ اسی درس کا پڑھا ہوا تھا۔ معماری کا یہ فن اس نے مدرسے ہی میں بیٹھ کر سیکھا تھا۔ یہ درس اس زمانے میں ایک اپ ٹو ڈیٹ معاشرے کو چلانے کے لیے ہر لحاظ سے مکمل تھا، معاشرے کی ضرورت کے مطابق تمام علوم وفنون اس میں شامل تھے۔

تیسری خصوصیت یہ تھی کہ یہ نصاب نہایت ٹھوس اور مشکل تھا اور فارغ ہونے والے کے لیے ہر فن کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتاب سے گزرنا ضروری تھا۔ یہ اس لیے کیا جاتا تھا کہ کوئی کتاب آگے چل کر اس کے لیے مشکل نہ رہے۔ بعض لوگ اس پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں اور مشکل کتابوں کو ختم کر کے آسان کتابیں شامل کرانا چاہتے ہیں، لیکن میں ذاتی طور پر اس کو درست نہیں سمجھتا۔ اس مشکل پسندی میں آج بھی بڑی معنویت ہے۔ اگر طالب علم کو مشکل کتابوں کا یہ پہاڑ عبور کرا لیا جائے تو اس کا مطالعہ اتنا ٹھوس ہو جاتا ہے اور ذہن میں ایسی تیزی آ جاتی ہے کہ اسے پھر آج کل کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور درس گاہوں کا نصاب اور علوم بڑے آسان معلوم ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ اتنی اعلیٰ سطح پر جو مباحث پڑھائے جاتے ہیں، ان میں علمی اعتبار سے اس کے لیے کوئی مشکل اور ناقابل فہم چیز نہیں ہے، بشرطیکہ طالب علم اس وسیع ذخیرے سے اچھی طرح واقف ہو، اس لیے ضروری ہے کہ ان کتابوں کو باقی رکھا جائے۔

درس نظامی کی کتابوں کی بالخصوص اور علوم اسلامیہ کی بیشتر کتابوں کی بالعموم ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کا آپس میں نہایت گہرا اور مضبوط ربط ہے۔ اسلامی علوم وفنون دوسری اقوام کے علوم وفنون کی طرح ماضی سے لاتعلق بالفاظ دیگر یتیم نہیں ہیں، ان کا اپنے ماضی سے بہت گہرا تعلق ہے اور ماضی سے تعلق کا یہ سلسلہ کہیں بھی منقطع نہیں ہوتا۔ ان سب علوم اور کتابوں میں ایک غیر منقطع فکری

وحدت اور فکری تسلسل پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی علوم میں یہ خوبی نہیں ہے۔ مثلاً انگریزی قانون کے کسی موضوع پر کوئی کتاب لکھی جائے اور وہ مقبول ہو جائے تو اچھی کتاب ہے، اس سے بحث نہیں کہ اس سے پہلے کس نے کیا کہا۔ مسلمانوں میں یہ بات نہیں ہے۔ مثلاً ظاہر الروایت کی چھ کتابوں کو لیجیے جو فقہ حنفی کی بنیادیں ہیں۔ آج جو کتابیں فقہ حنفی کی ہمارے پاس ہیں، ان سب کا ماخذ وہی ظاہر الروایت ہے۔ ظاہر الروایت کی کتابوں کی تلخیص ''الکافی فی فروع الحنفیہ'' ہے۔ الکافی کی شرح امام سرخسی کی المبسوط ہے۔ دوسری طرف ظاہر الروایت کی ایک اور کتاب الجامع الصغیر کی بنیاد پر بدایۃ المبتدی لکھی گئی جس کی شرح ہدایہ ہے۔ پھر ہدایہ کی تلخیص وقایہ اور وقایہ کی شرح ''شرح وقایہ'' ہے۔ اب اگر آپ کہیں کہ ہدایہ کو نصاب سے نکال دو تو اس لیے کہ مشکل ہے کہ اس سے ایک خلا پیدا ہو جائے گا اور کسی بھی نئی مجوزہ فقہی کتاب کو ہدایہ کی جگہ رکھ دینے سے دوسرے علمی نقصان کے علاوہ ایک بڑا نقصان یہ ہوگا کہ نئی مجوزہ کتاب کا اس پورے فقہی شجرۂ نسب اور علمی ورثہ سے رشتہ منقطع ہو جائے گا۔ اس لیے فقہ اور فلسفہ کی کتابیں مشکل تو ہیں لیکن ضروری ہیں، کیونکہ ایک دوسرے پر ان کا دارومدار ہے۔ ذاتی طور پر میں ہرگز اس کا قائل نہیں ہوں کہ درس نظامی کی مشکل کتب کی جگہ آسان کتابیں رکھی جائیں۔

البتہ اپنے گزشتہ تیس سالہ درس و تدریس کے تجربے کی روشنی میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ عربی زبان اور صرف و نحو سے تعلق رکھنے والی کتابوں میں آسانی اور جدت کی ضرورت ہے۔ فارسی بطور زبان پڑھائی جائے، لیکن ذریعہ تعلیم کے طور پر اسے اختیار کرنے کی آج ضرورت نہیں ہے۔ لہٰذا صرف و نحو اور دیگر علوم لغت کی وہ مشکل کتابیں جو یا تو فارسی میں ہیں یا غیر ضروری مباحث میں طلبا کو الجھا دیتی ہیں، ان کی ضرورت نہیں، مثلاً کافیہ وغیرہ۔ مشکل پسندی کی مشق اور اس کے اسلوب سے متعارف کرانے کے لیے وہ کتابیں کافی ہیں جو براہ راست اسلامی علوم سے متعلق ہیں۔ صرف و نحو (عربی قواعد) دنیا کا ترقی یافتہ ترین ذخیرہ ہے، اسے ہمارے اسلاف نے نہایت منظم منطقی اور سائنسی طریقہ سے مرتب کیا ہے۔ اس کو سمجھانے کے لیے آسان اور عصری انداز کی کتابیں ہی زیادہ موزوں ہیں، بالخصوص مبتدئین کے لیے تو ان کی افادیت مسلم ہے۔

۱۸۵۷ء میں کمپنی کی حکومت کے خاتمے اور براہ راست انگریزی حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی انتقال دیوانی کا معاہدہ بھی ختم ہو گیا۔ اب انہوں نے شریعت کا دائرہ ایک ایک کر کے محدود کرنا شروع کر دیا۔ پہلے حدود، پھر دیوانی قوانین، پھر شخصی قوانین سے ہوتے ہوئے آخر میں نکاح، طلاق کے قانون کا تھوڑا سا حصہ رہ گیا۔ مکمل انگریزی تسلط کے ساتھ ہی مسلم عدالتیں ختم ہو گئیں اور اسلامی اوقاف ضبط ہو گئے۔ اب مسلمانوں کے لیے مسئلہ اپنے ورثے کے تحفظ کا رہ گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے سوچا کہ امت مسلمہ کی دینی راہنمائی کے لیے جو کچھ بھی کیا جا سکتا ہو، وہ کیا جائے۔ اب واحد راستہ تعلیمی اور فکری کام ہی کا رہ گیا تھا، بقیہ تمام راستے مسدود ہو چکے تھے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس میں درس نظامی کو کچھ ترامیم کے ساتھ اختیار کر لیا گیا۔

مولانا نظام الدین سہالوی کے درس نظامی میں ۲۰۰ کے قریب کتابیں تھیں جن میں تقریباً ۵۵، ۵۶ علوم شامل تھے۔ دینی علوم کے ہر فاضل کو یہ دوسو درسی کتابیں اور یہ سارے علوم پڑھنے پڑتے تھے۔ دارالعلوم دیوبند نے منطق وفلسفہ میں قابل ذکر تبدیلی کی، طب کو نکال دیا۔ مولانا رشید احمد گنگوہی اس بات کے قائل تھے کہ منطق وفلسفہ کو مکمل طور پر خارج کر دیا جائے۔ بعد میں مولانا کو بہ مشکل آمادہ کر کے منطق وفلسفہ کی کچھ کتابیں رکھی گئیں۔ اس طرح دوسو میں سے تقریباً ۸۰ کے قریب کتابیں منتخب ہوئیں۔

تفسیر کا شروع سے ہی کسی قدر اہتمام کیا گیا۔ اس سے پہلے درس نظامی میں تفسیر نہیں تھی۔ (جلالین یا بیضاوی کی ایک سورت تھی جو برائے نام اور برائے برکت زیادہ تھی اور برائے تخصص مشکل ہی سے کفایت کرتی تھی) قریب قریب یہی معاملہ علم حدیث کا تھا۔ اس سے قبل مشارق الانوار یا مشکوٰۃ اور بعد میں موطا پڑھائی جاتی تھی، لیکن صحاح ستہ کو ٹھوس انداز سے پڑھانے کا اہتمام نہیں تھا، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ درس نظامی میں اب بھی حدیث کو بطور علم حدیث اور قرآن کو بطور علم قرآن نہیں پڑھایا جاتا۔ ایک سال میں پوری صحاح ستہ پڑھا دی جاتی ہیں، حالانکہ حق ادا کیا جائے تو ایک صحیح بخاری بھی ایک سال میں ختم نہیں ہو سکتی۔ پہلے چھ ماہ کتاب الایمان میں لگا دیے جاتے ہیں۔ بحث یہ ہوتی ہے کہ ایمان میں کمی بیشی کا امکان ہے یا نہیں۔ یہاں لوگوں کے سرے سے

ایمان ہی ضائع ہو رہے ہیں اور لوگوں نے اسلام چھوڑ دیا ہے۔ آج کے دور کے انسان کا نہ یہ مسئلہ ہے کہ ایمان میں کمی بیشی کا امکان ہے یا نہیں اور نہ ہی اس بحث سے ہمارے اور آپ کے ایمان میں کوئی فرق پڑتا ہے۔ چھ ماہ اس طرح کی نظری بحثوں میں گزر جاتے ہیں۔ اسی طرح حدیث میں رفع یدین، آمین بالجہر اور تراویح کی تعداد وغیرہ جیسے مسائل کی افضلیت ثابت کرنے میں ساری توانائیاں خرچ ہو جاتی ہیں۔ حنفیوں کے ہاں بقیہ تین ماہ امام بخاری کی تنقید (قال بعض الناس) کا جواب دینے میں اور اہل حدیث کے ہاں امام بخاری کی تائید میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا، اس سے نہ بیشتر طالب علموں کو خاص بحث ہوتی ہے اور نہ اساتذہ کو۔ اسی طرح کا معاملہ قرآن مجید کے درس اور تفسیر کا بھی ہے۔ بیضاوی کے ذریعے قرآن نہیں، علم کلام پڑھایا جاتا ہے، کیونکہ یہ علامہ جاراللہ زمخشری معتزلی کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس پر ملا عبدالحکیم کے حاشیے کا اسلوب بھی کلامی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ معتزلہ کی تردید نہ کریں۔ ضرور کریں، لیکن اس کے لیے قرآن مجید کو تختۂ مشق نہ بنائیں۔ یہ کلام علم کلام کے ضمن میں کریں، قرآن مجید پڑھاتے ہوئے معتزلہ اور ماتریدیہ کا کیا سوال؟

یہ درس نظامی کے متعلق میرا ذاتی تاثر ہے جس سے آپ اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔ ایک اور تاثر میرا یہ ہے کہ درس نظامی کا ایک خاص مقصد تھا، لیکن ہم نے اسے اور مقصد کے لیے اختیار کرنا شروع کر دیا۔ اس کا اسلوب اب یہ بن گیا ہے کہ پہلے طالب علموں کا ایک مخصوص ذہن بنایا جاتا ہے، مثلاً حنفی ذہن، پھر دیوبندی یا بریلوی، پھر ہلکے یا گاڑھے دیوبندی یا بریلوی، اخیر تک خوب پکا کر اب اسے مخصوص عینک لگا دیتے ہیں کہ اس عینک سے قرآن پڑھو اور اس عینک سے حدیث رسول کو دیکھو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات جو ہر چیز سے بالاتر اور ہر چیز پر حاوی ہیں، جن کے بعد ہر چیز ختم ہے اور جن سے متعارض ہر چیز اور ہر رائے منسوخ ہو جاتی ہے، مخصوص نظریا رائے کے تابع کر دیے جاتے ہیں اور ہماری حنفیت، دیوبندیت اور بریلویت کو منسوخ نہیں کر سکتے۔ انہی کی روشنی میں متعارض احادیث کی تاویل کی جاتی ہے جس سے کبھی طالب علم کا ضمیر مطمئن نہیں بھی ہوتا ہے، لیکن زبردستی تاویل کر کے نعوذ باللہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو حنفی، دیوبندی یا بریلوی

ثابت کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کسی کو یہ الفاظ سخت معلوم ہوں لیکن افسوس کہ امر واقعہ یہی ہے۔

ان سب کے باوجود میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ درس نظامی کی بیشتر کتابوں کو جوں کا توں رہنا چاہیے، لیکن آغاز قرآن وحدیث اور عربی زبان وادب سے کرنا چاہیے، البتہ عربی قواعد آسان انداز میں ہوں۔ پھر اس کے پختہ ہونے کے بعد بتدریج فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دی جائے۔ درمیان میں کہیں منطق، فلسفہ اور علم کلام بھی ہو، لیکن اختتام فقہ، اصول فقہ اور قرآن وحدیث کے خصوصی مطالعہ پر ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حنفیت کو چھوڑ دیں یا شافعیت کو نظر انداز کر دیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ ہر چیز قرآن وحدیث کے تابع ہو۔ اللہ کی کتاب تو ہر چیز کو منسوخ کرنے کے لیے ہے، 'لیظهره على الدين كله'، [۱۲] اس کے فیصلے کے بعد تو ہر کسی کی رائے اور اجتہاد کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس خاص رجحان نے جو خطرناک ذہنیت اور سوچ پیدا کی ہے، اسے بہر حال بدلنے کی ضرورت ہے۔

ایک اور اہم پہلو درس نظامی میں بعض نئے علوم وفنون اور مضامین شامل کرنے کا ہے۔ آج ان علوم وفنون کی دین کی نشر واشاعت کے لیے ایسے ہی ضرورت ہے جیسے کبھی یونانی علوم وفنون کی ضرورت تھی۔ یونانی علوم ہمارے ہاں دوسری صدی ہجری میں آنے شروع ہوئے، پھر زور وشور سے پوری دنیائے اسلام میں پھیل گئے۔ یہ علوم وفنون اکثر وبیشتر بت پرستوں اور یونانی کفار ومشرکین کے ہاں سے آئے ہیں جو بیشتر لامذہب، دہریے، بدکردار اور بداخلاق لوگ تھے، لیکن علمی اعتبار سے بہر حال بلند پایہ رکھتے تھے۔ ارسطو اور افلاطون کی بدکرداریوں کی داستانیں غیر معروف نہیں ہیں۔

جب یہ علوم مسلمانوں میں آئے تو ان علوم کے حوالے سے مسلمانوں میں تین قسم کے رویے سامنے آئے: ایک رویہ محدثین ومفسرین کا تھا جنھوں نے ان علوم کو ناپاک اور گندہ قرار دے کر ان سے مکمل احتراز کرنے کی تلقین کی۔ دوسرا رویہ ایک دوسرے گروہ یعنی حکما کا تھا کہ جنھوں نے قرآن وسنت بلکہ ہر چیز کی تاویل یونانی علوم کے مطابق کر دی، حتیٰ کہ یونانی حکما اور فلاسفہ کو مسلمانوں کے لیے رول ماڈل قرار دے ڈالا، یہاں تک کہ افلاطون جیسے بت پرست کو افلاطون الٰہی کا لقب دے دیا۔ یہ دوسری انتہا تھی۔ تیسرا نقطہ نظر یہ تھا کہ جو چیز غلط ہے، اس کی تردید کی جائے اور جو صحیح ہے، اسے لے لیا جائے اور اس سے استفادہ کرنے میں کسی بے جا تعصب کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ شروع

میں دو سو سال تک تینوں نقطہ ہائے نظر ساتھ ساتھ چلتے رہے، لیکن بعد میں تیسرے نقطہ نظر کو عروج ہوا۔ بالآخر آپ نے دیکھا کہ یونانی منطق کو گویا اسلامیا لیا گیا، یعنی اسلامائز کر لیا گیا اور بالآخر وہ خالص دینی علوم تفسیر اور اصول فقہ میں بھی ایک اہم عنصر کے طور پر داخل ہو گئی۔ اب ہر چیز منطق کے مطابق آنے لگی حتیٰ کہ متاخرین کی اصول تفسیر بھی اسی اسلوب پر آ گئی۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ جو علمائے دیوبند کے سب سے بڑے نمائندے تھے، ان کے مواعظ اور ملفوظات تک میں منطق موجود ہے۔ تربیت السالک جو مریدوں کی روحانی تربیت کے لیے تھی، اس میں بھی منطقی انداز بڑا نمایاں ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ کفار، بت پرستوں اور یونانیوں کے علوم وفنون کو مسلمانوں نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا کہ وہ علوم جو اسلام پر حملے کے دوران اسلحہ کے طور پر استعمال ہو رہے تھے، ان کو اسلام کے دفاع کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ پھر ایک ہزار سال تک منطق کے اسلوب واستدلال سے کام لے کر اسلامی عقائد وتعلیمات کو پیش کیا گیا۔ منطق کے بارے میں مسلمانوں میں محدثین ومفسرین کے نقطہ نظر کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جن کا منطق کے خلاف اتنا شدید ردعمل تھا کہ بعض نے کہا کہ منطق کی تعلیم ہی سرے سے حرام ہے، حتیٰ کہ منطق کی کتابوں سے نجاست دور کرنا بھی جائز ہے۔ بعد میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ امام غزالی اور امام رازی کی المستصفیٰ اور المحصول جیسی مذہبی کتابیں منطقی اسلوب پر لکھی گئیں۔

یہی چیز آج ہمیں درپیش ہے اور وہی تین نقطہ ہائے نظر اور رویے آج ہمارے سامنے ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں جب مغربی علوم ہمارے ہاں آئے تو ایک رویہ قدیم طرز کے علما کا قدیم محدثین ومفسرین کی طرح یہ سامنے آیا کہ یہ کچھ سب ناجائز اور ناپاک ہے۔ اس کو چھیڑنے اور چھونے کی ضرورت نہیں۔ دوسرا رویہ ان لوگوں کا تھا جو کلی طور پر ان علوم کے رنگ میں رنگ گئے۔ ایک درمیانہ نظریہ جو اعتدال اور توازن پر مبنی تھا، یہ تھا کہ مسلمان ان علوم کو سیکھیں، ان کا مطالعہ کریں اور ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کریں۔ جو چیز غلط ہے، دلائل سے اس کی تردید کر کے یہ ثابت کریں کہ یہ غلط ہے، جیسا کہ امام رازی، امام غزالی اور علامہ ابن تیمیہ نے اپنے دور میں تردید کر کے

یہ ثابت کیا کہ منطق وفلسفہ کی فلاں فلاں چیزیں، اصول اور عقائد غلط ہیں اور یہ بات انہوں نے منطق ہی کے دلائل سے غلط ثابت کی۔ جو چیزیں درست تھیں، انھیں اسلامی علوم کی خدمت کے لیے برتا اور استعمال کیا۔ یہی کام آج مغربی علوم وفنون کے بارے میں کرنا چاہیے۔ ان علوم میں جو عناصر ہمارے نقطہ ہائے نظر سے غلط ہیں، ان کی تردید انہی کے دلائل سے کریں۔ اہل علم اور علمائے کرام کے لیے ضروری ہے کہ وہ مغربی علوم وفنون کا تنقیدی انداز میں مطالعہ کریں۔ ان کے پانچ علوم ایسے ہیں جو اس وقت سب سے زیادہ غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں اور جتنا کفر والحاد اس دور میں پھیلا ہے، وہ اکثر بیشتر انہی پانچ علوم کی وجہ سے پیدا ہوا ہے:

۱۔ علم نفسیات

۲۔ علم بشریات

۳۔ علم عمرانیات

۴۔ علم سیاسیات

۵۔ علم معاشیات

علمائے کرام کو ان پانچ علوم وفنون کا مطالعہ کر کے ان میں موجود غلط اساسات وتصورات کی تردید عقلی انداز میں دلائل وشواہد کے ساتھ کرنی چاہیے۔ جو چیزیں درست ہیں، ان سے ہم کو پورا پورا استفادہ کرتے ہوئے مہارت حاصل کرنی چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ان علوم وفنون کے رائج الوقت اسلوب اور طرز استدلال سے کام لے کر ہم اپنے عقائد وتصورات کو آج کی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کریں، تاکہ وہ جدید دنیا کے لیے زیادہ قابل فہم ہوں۔ کیونکہ ایک عقلی سانچہ پہلے سے ان کے ذہن میں موجود ہے جس کی بنیاد پر وہ معاملات کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اس طرح ان میں عدل وانصاف رکھنے والے لوگ ان سے متاثر ہوں گے اور پھر فکری اخذ وعطا کا عمل شروع ہو جائے گا جو منطقی علوم اور یونانی ذخیرہ کے ساتھ مسلمانوں نے اختیار کیا۔ شروع میں بہت سے مسلمان ان سے متاثر ہوئے جس طرح آج ہو رہے ہیں۔ آج ان کی کتابیں موجود ہیں۔ آپ اخوان الصفا کی کتابیں دیکھیے، ان میں بڑی مرعوبیت ملتی ہے۔ ابن رشد بڑے فقیہ تھے، لیکن ان کی کتابوں میں

بھی یونانی علوم سے مرعوبیت کا احساس ہوتا ہے۔اس طرح کندی جو فیلسوف العرب اور حکیم العرب کہلاتے ہیں،ان کے ہاں مرعوبیت کے خاصے جراثیم ملتے ہیں،جس طرح مرعوبیت کے جراثیم ہمارے ہاں مغربی علوم وفنون کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں۔لیکن یہ عارضی اور وقتی چیز تھی۔ بالآخر معتدل نقطہ ہائے نظر رکھنے والے علماے کرام کی کاوشیں رنگ لائیں اور دیگر دونوں طبقوں (مخالفین اور موید ین) کا زور گھٹتا چلا گیا۔

مثلاً شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' جو ساری کی ساری منطق وفلسفہ سے لبریز دلائل کی بنیاد پر ہے،اس میں انہوں نے تمام اسلامی تصورات نئے انداز سے مرتب کیے۔اسی طرح ''الموافقات'' (اصول فقہ کی کتاب) دیکھیے۔اس کتاب میں امام شاطبی نے شریعت کے اصول منطق سے ثابت کیے ہیں۔اس میں ایک چیز بھی ایسی نہیں جو عقلی بنیاد پر ثابت نہ ہوتی ہو۔کوئی آدمی جو اس زمانے کی روایات کے مطابق عقلیات کا علم بردار ہو،وہ اس کی کسی ایک چیز سے بھی انکار نہیں کر سکتا۔اسی طرح علامہ کاسانی کی کتاب ''بدائع الصنائع'' خالص فقہ کی کتاب ہے،لیکن عقلی انداز میں مرتب کی گئی ہے،اور پڑھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ فقہ حنفی ہو،تفسیر ہو،حدیث ہو،کوئی چیز ایسی نہیں جو انسانی عقل اور فہم سے بالاتر ہو،بلکہ ہر چیز خالصتاً عقل کی بنیاد پر ہے۔اس سے ایمان میں جو اطمینان کی کیفیت پیدا ہوتی ہے،وہ ہم جیسے کمزور ایمان والوں کے لیے ناگزیر ہے۔صحابہ کرام جیسا ایمان ہو تو یہی بات کافی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دیا،لیکن ہر شخص تو ایمان ویقین کے اس درجے پر فائز نہیں ہے۔عام آدمی کا حال تو یہ ہے کہ جب تک آپ اس کو اس کے اپنے اصول موضوعہ کے مطابق عقلی دلائل سے قائل نہیں کریں گے،وہ قائل نہیں ہوگا۔

ان گزارشات کی روشنی میں ہمیں پاکستان میں دینی تعلیم کے مستقبل اور آئندہ کی ضروریات کا جائزہ لے کر وطن عزیز میں دینی تعلیم کے مقاصد واہداف کا تعین پہلے سے واضح طور پر کر لینا چاہیے۔

ہماری رائے میں پاکستان میں دینی تعلیم کے مقاصد واہداف درج ذیل ہونے چاہییں۔

۱۔ایک عام تعلیم یافتہ مسلمان کے لیے ایسی دینی تعیلم کا بندوبست جو اس کو ایک پابند اسلام شہری بنا سکے۔

۲۔ مساجد کے لیے ائمہ اور خطبا کی تیاری۔

۳۔ قرآن پاک کی تعلیم و تدریس کے حفاظ، قرا اور مجودین کی تیاری۔

۴۔ پرائمری اور ثانوی مدارس میں اسلامیات پڑھانے کے لیے مناسب اساتذہ کی تیاری۔

۵۔ غیر ممالک میں تبلیغ اسلام کے لیے مبلغین کی تیاری۔

۶۔ ملکی جامعات میں اسلامیات اور عربی زبان کے شعبوں میں اعلیٰ سطح کی تعلیم و تدریس کے لیے اساتذہ کی تیاری۔

۷۔ دینی تعلیم کے مختص اداروں میں دینی علوم کے ماہر اساتذہ کی تیاری۔

۸۔ ایسے محقق اہل علم کی تیاری جو دور جدید کے تقاضوں سے بہ قدر ضرورت ناقدانہ واقفیت کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم و فنون میں گہری اور ماہرانہ بصیرت رکھتے ہوں اور ملک و ملت کی راہنمائی اور فکری قیادت کے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہوں۔

ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر مقصد کے حصول کے لیے افراد کار اور طلبا کے انتخاب سے لے کر نصاب تعلیم تک الگ الگ غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ کوئی ایک نصاب تعلیم خواہ وہ کتنا ہی جامع ہو، ان سب مقاصد کو بہ یک وقت پورا نہیں کر سکتا۔ ایک عام مسلمان کے لیے دینی تعلیم کا ایک ایسا مختصر نصاب کافی ہے جو عام دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہفتے میں تین چار گھنٹے کے حساب سے پہلی جماعت سے میٹرک یا ایف اے تک پڑھا دیا جائے یا بالغوں کے لیے روزانہ دو تین گھنٹے کے حساب سے ایک سال یا حد سے حد دو سال میں مکمل ہو جائے۔ ائمہ مساجد کی تیاری کے لیے میٹرک کے بعد دو یا تین سال کا ایسا نصاب جن میں حفظ و تجوید، ابتدائی عربی، اردو میں تفسیر کی ایک دو کتابیں، حدیث کی ایک دو کتابیں، بقدر ضرورت فقہی احکام و مسائل کے ساتھ ساتھ دور جدید میں اسلام اور مذہب کے حوالے سے بعض مضامین شامل ہوں۔ اسی طرح دینی تعلیم کے متخصصین و محققین کے لیے ایک طویل المیعاد اور جامع نصاب کی ضرورت ہوگی جس میں درس نظامی کی تمام یا کم از کم بیشتر کتب کے ساتھ ساتھ بہت سے نئے مضامین اور موضوعات شامل کرنے پڑیں گے۔ اس غرض کے لیے آٹھ سالہ درس نظامی قطعاً ناکافی ہوگا۔

خلاصہ کلام یہ کہ دینی تعلیم کے باب میں جس غوروخوض کی ضرورت پاکستان بننے کے بعد فوراً محسوس کی جانی چاہیے تھی، وہ ابھی تک محسوس نہیں کی گئی۔ تعلیمی مشین کا فولاد نصاب تعلیم ہے اور استاد کی حیثیت اس مشین کو چلانے والے مہندس کی ہے۔ ہمارے ہاں نہ اس دینی تعلیمی مشین کو فولاد میسر ہے اور نہ مہندس۔ ہم ابھی تک اپنی ساری ضروریات کے لیے اس نظام اور نصاب کی بقایا جات پر بھروسہ کررہے ہیں جو درس نظامی نہیں بلکہ درس نظامی کا محض ایک چربہ ہے۔ اب یہ اس نظام سے نکلنے والے فارغ التحصیل طلبا کی ذاتی صلاحیت پر ہے کہ وہ مسجد کی امامت پر اکتفا کرتے ہیں یا فکری قیادت سنبھالنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ اول الذکر صورت میں ان کو دستیاب اور حاصل شدہ علمی ذخیرے کا بیشتر حصہ غیر کارآمد محسوس ہوتا ہے، جب کہ ثانی الذکر صورت میں حاصل شدہ ذخیرہ علم انتہائی ناکافی ثابت ہوتا ہے۔

ایک مثالی نصاب تعلیم وضع کرنے لیے ضروری ہے کہ پہلے تعلیم کے مقاصد کا حتمی طور پر تعین کر لیا جائے اور پھر کوشش کی جائے کہ وہ مقاصد اور اہداف اس نصاب میں مکمل طور پر منعکس ہوتے ہوں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اکیسویں صدی میں دینی قیادت کے لیے آمادہ حضرات کی غالب اکثریت اکیسویں صدی کے فکری رجحانات سے واقفیت حاصل کرنے کے بجائے آٹھویں نویں صدی کے فلسفیانہ مسائل اور عقلی مباحث کے پڑھنے پڑھانے میں اپنا وقت صرف کرتی ہے۔ ایک مثالی نصاب تعلیم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نصاب کے تحت تعلیم پانے والے طلبا کو مقاصد تعلیم سے سرشار کردیا جائے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو آج دینی مدارس کے فضلا کی بڑی تعداد جن مقاصد سے سرشار محسوس ہوتی ہے، وہ عمومی ملی اور اسلامی مقاصد نہیں ہیں۔ ان میں بیشتر لوگ گروہی اور فرقہ وارانہ مقاصد سے سرشار نظر آتے ہیں۔ ان کی سرگرمیوں کا بیشتر ہدف اسلام اور اسلامی فکر کا فروغ نہیں، بلکہ اپنی کسی محترم دینی شخصیت کے انداز فکر کو فروغ دینا اور دوسرے اسالیب فکر پر اس کی برتری جتانا معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت دینی مدارس کے نصاب میں بہت سی ایسی کتابیں شامل ہیں جن سے مضمون کا ذوق طالب علم میں پیدا ہونے کی بجائے اس کو لفظی پیچیدگیوں اور عبارت کی بھول بھلیاں میں گم کردیا جاتا ہے۔ اس وقت ایسے ہزاروں طلبا یا شاید لاکھوں کی تعداد میں موجود ہوں جو

صرف ونحو کی باریکیوں اور شذوذ پر متاخر شارحین اور حاشیہ نویسوں کی موشگافیوں سے تو خوب واقف ہوں گے لیکن عام صرفی ونحوی اغلاط سے پاک چند فقرے لکھ لینے کی اہلیت سے عاری ہوں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تحریر سنبٹ اور سوال کابلی اور سوال باسولی کی عبارتیں رٹ لینے سے کون سا دینی یا دنیاوی مقصد حاصل ہوسکتا ہے، اگر طالب علم ایک صفحے کی صحیح عربی عبارت لکھ لینے کی (اور اب تو پڑھ لینے کی بھی) اہلیت نہ رکھتا ہو؟

ایک اچھا نصاب تعلیم طالب علم کو نہ صرف تحقیق اور جستجو کا خوگر بنا دیتا ہے بلکہ اس میں نئے آفاق علم کے انکشاف کی امنگ بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو آج ہمارا دینی نظام تعلیم بانجھ محسوس ہوتا ہے۔ تحقیق وجستجو کا ذوق نہ عصری جامعات کے فضلا میں نظر آتا ہے اور نہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات میں۔

یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

اس کی وجہ یہی ہے کہ تعلیم کے مقاصد واہداف نہ جامعات میں واضح ہیں اور نہ دینی مدارس میں۔ یہاں مقصد ملازمت کا حصول ہے اور وہاں امامت وخطابت کا۔ بلکہ مدارس کے طلبا کو ایک گونہ گویا برتری حاصل ہے کہ اگر کسی موجودہ مسجد میں امامت وخطابت میسر نہ ہو تو امامت وخطابت کی خاطر جہاں بس چلے، نئی مسجد کھڑی کی جاسکتی ہے۔ پھر اس نئی مسجد کے وجود کو جواز پیدا کرنے کی خاطر فقہی اور مسلکی حوالوں کو بہ سہولت مدد کے لیے پکارا جاسکتا ہے اور یوں ہر مسجد اپنے روز آغاز ہی سے اسلام کا حوالہ بننے کی بجائے مسلک کا حوالہ بن جاتی ہے اور امت میں وحدت اور اخوت واخلاق پیدا کرنے کی بجائے افتراق اور تشتت کو فروغ دینے پر مجبور ہوتی ہے۔

آزاد اور باا ثر قوموں کا نصاب تعلیم طلبا میں اپنی تہذیب وتمدن سے گہری وابستگی پیدا کرتا ہے۔ تہذیب وتمدن سے وابستگی کے لیے ضروری ہے کہ نصاب کی تدوین تہذیبی ضروریات کو سامنے رکھ کر کی جائے۔ ایک زندہ تہذیب کے تقاضے زندہ انسانوں کے تقاضوں کی طرح ہوتے ہیں۔ مردہ تہذیب کا مطالعہ ماضی کی تاریخ کی حوالے سے تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس کو روزمرہ زندگی کے وقائع وحوادث سے ہم آہنگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت ہمارے مذہبی نصاب تعلیم کا بیشتر حصہ ہمارے جدید

تہذیبی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن مجید، علم تفسیر، علم حدیث، علم فقہ اور علم کلام کی تعلیم زندہ علوم کے طور پر دی جائے۔ان کو کسی سابقہ دور کے از کار رفتہ مضمون کے طور پر نہ پڑھایا جائے۔اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ سلف کی تحقیقات اور امت کے متفقہ عقائد کے بارے میں کوئی مصالحانہ رویہ اپنایا جائے۔بلکہ اس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ تمام اسلامی علوم وفنون کو ایک زندہ، مسلسل، رواں، ہردم دواں اور ہر آن وسعت پذیر علم کے طور پر پڑھا اور پڑھایا جائے۔اسلامی علوم وفنون کی حیثیت ایک دریائے رواں بلکہ ایک محیط بے کراں کی ہے جس کا ہر حصہ اور ہر دور زندگی سے بھرپور اور عصری تقاضوں سے مسلسل ہم آہنگ ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلامی فکر میں کبھی بھی ماضی اور حال کے درمیان خلا پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا حال ہر وقت ماضی سے اسی طرح وابستہ رہتا ہے جیسے درخت کی شاخیں اپنے تنے سے اور تنا اپنی جڑ سے وابستہ ہوتا ہے۔اس کا حال اس طرح مستقبل کو جنم دیتا رہتا ہے جیسے ایک ثمر آور اور بارآور درخت کی شاخیں پھل اور پھول پیدا کرتی رہتی ہیں۔اسلامی علوم فنون کے ایسے نصاب کی تیاری ناگزیر ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل کے ایسے ہی رشتوں کی ضمانت دی گئی ہو۔

اکیسویں صدی میں شاید سب سے نمایاں تبدیلی جو تعلیم اور نظام تعلیم کے حوالے سے پیش آنے والی ہے، بلکہ پیش آرہی ہے، وہ تعلیمی اداروں کے کردار میں بڑھتی ہوئی کمی کا وہ رجحان ہے جو زور بروز نمایاں ہوتا چلا جارہا ہے۔آنے والا دور رسمی تعلیم سے کہیں زیادہ غیر رسمی تعلیم کا دور ہے۔یہ غیر رسمی تعلیم جو ذرائع ابلاغ سے دن رات برس رہی ہے، ہماری نسلوں کو بری طرح متاثر کررہی ہے۔یہ غیر رسمی تعلیم ہر قسم کی جغرافیائی، تہذیبی، مذہبی اور اخلاقی حدود سے آزاد ہے۔اس کا کردار روز بروز بڑھتا چلا جارہا ہے۔مستقبل میں تعلیم کے کردار کا تعین اور اس کے اہداف کی نقشہ کشی کرتے ہوئے ابلاغ کے اس ہمہ گیر اور کثیر الجہات کردار سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں رہے گا۔اس کے لیے فوری غور وخوض اور گہری منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔معلومات کے اس سیلاب اور افکار ونظریات کے اس طغیان میں اسلامی عقائد ونظریات کا تحفظ کیونکر کیا جائے اور اخلاقیت کے اس سمندر میں گھر جانے والے اخلاقی جزیروں کو پہنائیاں کیسے عطا کی جائیں، یہ مستقبل کا سب سے بڑا تعلیمی چیلنج ہے۔

اب پہلی تعلیم گاہ کی حیثیت ماں کی گود کی بجائے وی سی آر کو حاصل ہو رہی ہے۔ اب دادی اور نانی کی لوریوں کی جگہ ٹیلی ویژن کے نغمے لے رہے ہیں۔ ان حالات میں اولین ضرورت اس بات کی ہے کہ رسمی اور غیر رسمی تعلیم میں ہم آہنگی کی فضا پیدا کی جائے۔ آج ثقافت، تعلیم اور اطلاعات و معلومات نے مل کر فکر و نظر کی تشکیل میں سب سے بڑے عامل کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ انگریزی استعمار کے دو سو سال اور آزادی کے ابتدائی عشروں تک تعلیم کا بیشتر عمل حکومت کی نگرانی میں بڑی حد تک سرکاری تعلیمی پالیسیوں کے مطابق ہوتا تھا۔ نئے حالات میں یہ عمل اتنا پھیل چکا ہے کہ اب حکومتوں کے لیے اس پر اثر انداز ہونا دن بدن مشکل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مزید برآں ہمارا گزشتہ نصف صدی کا تجربہ بھی انتہائی حوصلہ شکن رہا ہے۔ حکومتوں کی روزمرہ سیاست اور افراد کے وقتی مفادات نے مل کر تعلیم اور مقاصد تعلیم کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم اور ثقافت دونوں کو روزمرہ سیاست اور وقتی مصالح سے الگ کر کے ایک آزاد اور خودمختار شعبے کی حیثیت دے دی جائے۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی نے اگر ریاست کے تین شعبے (انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ) قرار دیے تھے تو اکیسویں صدی میں ایک چوتھا شعبہ ثقافت و تعلیم کا بھی قرار دینا چاہیے۔ یہ شعبہ عدلیہ کی طرح آزاد اور اسلام کے ادارۂ وقف کی طرز پر اسی طرح خودمختاری کے ساتھ چلایا جائے جس طرح ماضی میں چلایا گیا۔ بنوولنٹ فنڈ کی طرح ایک بڑا وقف بنایا جائے جہاں سے تعلیم کے تمام اخراجات پورے کیے جائیں، تعلیم کی مد میں دیے جانے والے ہر قسم کے عطیات اور میزانیے اس بڑے وقف میں اس طرح جمع ہوتے رہیں کہ ہر دینے والے کی شرائط اور خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اس کے دیے ہوئے عطیات کو انھی مصارف میں اور انھی مقاصد کی خاطر صرف کیا جائے جن کے لیے وہ عطیات دیے گئے ہوں۔ گزشتہ پندرہ سالوں کے دوران اقرا سرچارج کے نام سے جو کھربوں روپیہ وصول ہوا ہے، وہ بھی اس فنڈ کو منتقل کیا جائے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر بڑا تعلیمی ادارہ اور بالخصوص ہر یونیورسٹی مکمل طور پر خودمختار ہو، جا بہ جا ایسے تعلیمی محتسب مقرر ہوں جو عدالتی اختیارات، عالمانہ مقام، تعلیمی مہارت، معاشرتی وقار اور اخلاقی بلندی کے ہتھیاروں سے مسلح ہوں۔ یہ تعلیمی محتسب نہ صرف اس بات کو یقینی

بنائیں کہ تعلیم کے ادارے ان مقاصد کی تکمیل کر رہے ہیں جن کی خاطر وہ قائم کیے گئے ہیں، بلکہ یہ بھی دیکھیں کہ تعلیم کی آزادی اور خودمختاری کیونکر باقی رکھی جا سکتی ہے اور تعلیم و تربیت جیسے پاکیزہ اور خالص پیغمبرانہ مشن کو روزمرہ کے سیاسی مفادات اور وقتی مصلحتوں سے کیسے دور رکھا جائے۔

اسلام کی پوری تاریخ میں تعلیم ہمیشہ مکمل طور پر آزادانہ اور خودمختار رہی ہے۔ اسلام کی علمی اور فکری تاریخ کا سب سے بڑا نشان امتیاز نہ صرف علم و فکر اور تعلیم و تعلم بلکہ قانون و شریعت کا ہر قسم کے سرکاری اور حکومتی اثر و رسوخ سے آزادی اور استقلال ہے۔ خود اسلامی قانون (فقہ) جو مہذب دنیا کی معلوم و مدون تاریخ کا سب سے جامع، سب سے متوازن اور سب سے کامیاب نظام قانون ہے، بارہ سو سال تک کسی بھی نوعیت کے سرکاری اثرات سے آزاد رہتے ہوئے دنیا کی مہذب ترین سلطنتوں کے قانونی، دستوری، انتظامی اور معاشرتی تقاضے پورے کرتا رہا ہے۔ یہی حال تعلیمی اداروں اور مدارس و جامعات کا رہا۔ ان کا انتظام و انصرام علما کے ہاتھ میں، ان کی تمویل وقف کے ذریعے، ان کی علمی نگرانی اساتذہ کے ہاتھ میں اور عام فلاح و بہبود معاشرے کے مخیّر حضرات کے ذمہ ہوتی تھی۔ پاکستان کے دینی مدارس بڑی کامیابی کے ساتھ انہی روایات کا علم تھامے ہوئے ہیں۔ انہوں نے حکومتی اثرات سے آزاد رہ کر سرکاری خزانہ پر بوجھ بنے بغیر ملک کو دینی قیادتیں فراہم کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ ان گزارشات کے ضمن میں بعض تنقیدی تبصروں کا مقصد دینی مدارس کے شاندار ماضی اور روشن روایات پر پردہ ڈالنا نہیں بلکہ ان کو بہتر انداز میں مستقبل کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں تعلیم کا مقصد جمہوریت اور نیشن اسٹیٹ nation state کے تصورات کو جائز بنانا تھا۔ اس دور میں تمام اجتماعی اور انسانی علوم کی اٹھان ریاست، جمہوریت اور نیشن اسٹیٹ کے تصورات پر تھی، اس لیے اس دور میں سارا مغربی فلسفہ اور تصور تعلیم، بالخصوص وہ تصور تعلیم جس سے مشرق کی غلام اقوام کو مانوس کیا گیا، انہی تصورات کی آبیاری کے لیے وقف تھا۔ اس کے برعکس اکیسویں صدی میں مغرب میں تعلیم کے مقاصد (ان کے تصورات کے مطابق) امن، انسانی حقوق، اور جمہوریت ہوں گے۔ وہاں آج کل زور شور سے ان موضوعات پر بین

الاقوامی کانفرنسیں ہو رہی ہیں۔ اکتوبر ۱۹۹۴ء میں جنیوا میں ایک مشہور ادارے انٹرنیشنل کانفرنس آن ایجوکیشن کا اہم اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں یہ طے پایا کہ آئندہ تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعے امن، انسانی حقوق اور جمہوریت کے مقاصد کے لیے کن خطوط پر کام کیا جائے گا۔ ان کانفرنس میں غیر گریزی (زینوفوبیا) تشدد پسندی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے مظاہر وظواہر پر غور کیا گیا۔ آج ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ان بدلتے ہوئے اہداف وتصورات میں ہمیں کون کون سے نئے چیلنج پیش آسکتے ہیں اور ہمیں ان سے نمٹنے کے لیے کیا کرنا پڑے گا۔

## خلاصہ کلام

ان گزارشات کے اختتام سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسے اہم امور اور مقتضیات کی اختصار سے نشان دہی اور اعادہ کر دیا جائے جو اکیسویں صدی میں ایک مثالی، مثبت اور تعمیری نظام تعلیم کی تربیت تشکیل کے لیے ضروری ہیں۔ اگر اکیسویں صدی کا پہلا عشرہ ان بنیادی امور کی تکمیل اور فراہمی کے لیے مختص کر دیا جائے تو امید کی جاسکتی ہے کہ ہم اکیسویں صدی کے ربع اول میں اپنے تعلیمی اہداف کو مکمل طور پر حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

۱۔ مغربی تہذیب اور مغربی علوم وفنون کی تنقید وتنقیح اور مکمل جائزہ (stock taking)

۲۔ اسلامی بنیادوں پر تمام علوم وفنون کی از سرنو ترتیب وتشکیل اور تعمیر نو۔

۳۔ قدیم علوم ومعارف کی تدوین نو، بالخصوص تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اسلامی سیاسیات ودستوریات، اسلامی معاشیات، تصوف اور علم النفس کی تشکیل جدید۔

۴۔ ایک ہمہ گیر اسلامی ثقافتی انقلاب کا آغاز ۲۰۰۱ سے۔

۵۔ قرآن کی بنیاد پر ایک نئے تہذیب وتمدن کی تعمیر۔

۶۔ علاقائیت اور لسانیت کے حقیقی اور وہمی مسائل کا ادراک اور ایک یک جہت اور ملی نقطہ نظر کی تشکیل۔ حقیقی مسائل اور مشکلات کو نظر انداز کر کے محض اخوت دینی کے مواعظ سے ملی نقطہ نظر پیدا نہیں ہوسکتا۔

۷۔ یہود وہنود کے فتنے سے باخبری

۸۔ فرقہ واریت کے عفریت کا خاتمہ جو صرف تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

۹۔ اسلامی تنظیمات وتحریکات میں باہم ربط ومفاہمت

۱۰۔ ایک بھرپور ترغیبی تحریک یعنی motivational campaign جو عامۃ الناس کو نئے کردار کے لیے تیار کرے۔ آج دوبارہ تحریک پاکستان کی فضا پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ آج ایک بار پھر تحریک خلافت کے لیے جذبے کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

ان دس اقدامات کے لیے درج ذیل دس رہنما اصولوں کی پاس داری ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ ان دس اصولوں کو اکیسویں صدی میں دنیاے اسلام کی تعلیم اور اس کی آئندہ ضروریات کے دس اہم ابواب کا عنوان قرار دیا جا سکتا ہے:

۱۔ تنسیق:

ان گزارشات میں جو کچھ عرض کیا گیا، وہ بظاہر ایک بہت بڑا اور ناقابل حصول ہدف معلوم ہوتا ہے۔ اس ہدف تک پہنچنے کے لیے جن وسائل اور افراد کار کی ضرورت ہے، ان کی فراہمی کے بارے میں اندازے متفاوت ہو سکتے ہیں، لیکن اگر اس میدان میں کام کرنے والے سب نہیں تو اکثر اداروں اور افراد کے درمیان آپس میں رابطہ، تنسیق اور تقسیم کار ہو جائے تو بہت کم وسائل سے یہ سارے کام کیے جا سکتے ہیں۔ جہاں یہ طرز عمل غیر حقیقت پسندانہ ہے کہ یہ سب کام صرف حکومت کو کرنے چاہئیں اور حکومت ہی کی بنیادی ذمہ داری میں شامل ہیں، وہاں یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اس پورے عمل میں حکومت کی ذمہ داری محض جزوی یا جانبی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک معیاری اور مثالی نظام تعلیم کی تدوین من حیث القوم ہم سب کی ذمہ داری ہے اور حکومتوں، تعلیمی اداروں، دانش وروں، ماہرین تعلیم، اہل علم، سماجی تنظیموں اور علماے دین سب کو باہمی مشاورت اور تقسیم کار کے ذریعے ان اہداف کو حاصل کرنا چاہیے۔

۲۔ تدریج:

مذکورہ بالا گزارشات میں علوم وفنون کی تدوین نو اور مغربی افکار ونظریات کی تنقید وتطہیر کے

بارے میں بالخصوص جو کچھ عرض کیا گیا، وہ ایک تدریجی عمل کا متقاضی ہے۔ جب تک اس عمل کا ابتدائی مرحلہ مکمل نہ ہو، درمیانی مراحل پر عمل کرنا دشوار ہے۔ اسی طرح جب تک درمیانی مراحل تکمیل کے قریب نہ پہنچ جائیں، اس وقت تک انتہائی مراحل کی طرف قدم اٹھانا بہت مشکل ہوگا، اس لیے اس میدان میں کام کرنے کے لیے اہل علم اور ماہرین تعلیم کو تدریج کا فطری اور اسلامی اصول پیش نظر رکھنا چاہیے۔ یوں بھی اصلاحات کا عمل قوم کی سکت اور قبولیت کی سطح کو پیش نظر رکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ بہ یک وقت ہر میدان میں تبدیلی کی خواہش تو فی نفسہ اچھی بات ہے لیکن اس کے نتیجے میں ایک ایسی بدنظمی اور افراتفری جنم لے سکتی ہے جس سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو جائے گا، لہٰذا اس پورے کام کو مختلف مدارج اور مراحل میں تقسیم کرنا ناگزیر ہے۔

۳۔ توازن:

نظام تعلیم کی تشکیل نو ایک انتہائی پیچیدہ، مشکل، اہم اور ضروری امر ہے۔ تعلیم کے تقاضے اتنے ہی متنوع ہیں جتنی خود انسانی زندگی کے نمونے اور انسانی شخصیتوں، مزاجوں اور معاشروں کا تنوع۔ انسان کا مزاج اور خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اپنے ہی زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے اور ہر چیز کا فیصلہ اپنی ذات پر قیاس کر کے کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زندگی کے مختلف تقاضوں کے مابین توازن مختل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی خاص علم و فن کے ماہرین کی رائے میں ان کے میدان اختصاص کو جو اہمیت حاصل ہونی چاہیے، وہ دوسرے کسی اختصاص کو حاصل نہیں۔ اس رویے کا، جو ایک حد تک فطری ہے، یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بہت سے معاملات عدم توازن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تعلیم کے باب میں اس عدم توازن سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اجتماعی اور لسانی علوم، فنی تعلیم، دینی تعلیم و تربیت اور فنی اور سائنسی تعلیم کے مابین توازن کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ ان میں سے اگر کسی ایک اختصاص کی قیمت پر دوسرے تخصصات کو پروان چڑھایا جائے گا تو عدم توازن کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

۴۔ واقعیت پسندی:

تعلیمی اصلاحات کا حصول اور ایک معیاری مثالی نظام تعلیم کی تشکیل ایک ایسا عظیم الشان نصب

العین اور بلند آئیڈیل ہے جس کے حصول کے لیے طویل اجتماعی کاوشیں درکار ہیں۔ بعض اوقات اس نصب العین کی بلندی کی وجہ سے کچھ لوگ ہمت ہار سکتے ہیں اور کچھ اور لوگ اس نصب العین کو سرے سے نا قابل حصول بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اس صورت حال کا منفی نتیجہ ہدف کی طرف ایک موثر اور مثبت پیش رفت کے رک جانے کی شکل میں بھی نکل سکتا ہے۔ ان حالات میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ جہاں ہدف کی بلندی اور نصب العین کی رفعت کے بارے میں کوئی مصالحت نہ کی جائے، وہاں واقعیت پسندی، عملی تقاضوں اور زمینی حقائق سے بھی صرف نظر نہ کیا جائے۔ زمینی حقائق سے صرف نظر کر کے محض نظری پیش رفت کسی مثبت نتیجے تک مشکل ہی سے پہنچا سکتی ہے۔ زمینی حقائق دنیائے اسلام کے مختلف ممالک میں مختلف ہو سکتے ہیں اور ان کے لحاظ سے تفصیلات کے تعین اور مدارج و مراحل کی ترتیب میں بھی جزوی طور پر فرق ہو سکتا ہے۔

۵۔ جامعیت:

کسی بھی مثالی اور متوازن نظام تعلیم کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ وہ ان تمام پہلوؤں کا جامع ہو جو ایک متوازن انسانی شخصیت کی تشکیل کے لیے ضروری ہیں۔ خاص طور پر ایک مسلم معاشرے کی ضروریات کی تکمیل کے لیے یہ بات ناگزیر ہوگی کہ اس کے لیے تعلیم کا جو نظام بھی اختیار کیا جائے، وہ جہاں دین و دنیا کی جامعیت رکھتا ہو، وہاں اس میں سائنسی، فنی، اجتماعی اور انسانی علوم وفنون کی تمام ضروریات کو جامعیت اور توازن کے ساتھ سمویا گیا ہو۔ اگر جامعیت کے ان تقاضوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ایک نامکمل شخصیت جنم لیتی ہے اور نامکمل شخصیتوں سے جو معاشرہ وجود میں آتا ہے، وہ بھی اس عدم تکمیل کی وجہ سے بہت سے نقائص کا شکار رہتا ہے۔

۶۔ تعمق:

دور جدید بڑی حد تک مظاہر پر زور دینے اور ظاہری آب و تاب کو اہمیت دینے کا دور ہے۔ اس ظاہر پرستی کا ایک نتیجہ مشرقی ممالک میں یہ نکلا ہے کہ معاملات کو سنجیدگی اور گہرائی سے ساتھ لے کر ان پر غور کرنے یا فیصلہ کرنے یا فیصلہ کرنے کا رجحان کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام میں عموماً تعمق اور گہرائی پیدا کرنے کا ذوق اور جذبہ دن بہ دن کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ آئے

دن نصابی کتابوں میں غیر ضروری تبدیلی اور سہولت پسندی بھی ہے۔ یقیناً تسہیل اور آسانی پیدا کرنا اچھی چیز ہے، بالخصوص نو آموزوں کے لیے تسہیل ناگزیر ہے، لیکن تسہیل کے نام پر سطحیت کو فروغ دینے سے تعلیم کا معیار تیزی سے گرتا جا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تسہیل اور تعمق کے تقاضوں میں توازن پیدا کیا جائے، تسہیل کو صرف ابتدائی اور ثانوی تعلیم تک محدود رکھا جائے، اور اعلیٰ تعلیم، بالخصوص تحقیقی سطح پر کس قسم کی سطحیت کو در آنے کی اجازت نہ دی جائے۔

گزشتہ چند عشروں کے دوران ہماری جامعات میں جو تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں، ان کی بڑی تعداد تعمق سے عاری اور سطحیت کا شکار ہے۔ آج دنیا کی بیشتر یونیورسٹیوں میں دنیائے اسلام کی بہت سی ڈگریوں کو بالعموم اور پاکستانی جامعات کی ڈگریوں کو بالخصوص تسلیم کرنے میں تامل سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ ہمارے ہاں تحقیق کے نام پر سطحیت کا فروغ ہے۔

۷۔ تخصص:

اعلیٰ تعلیم کی سطح پر تعمق کے ساتھ ساتھ جس چیز کو یقینی بنانے کی ضرورت ہے، وہ تخصص ہے۔ آج کل علوم و فنون کا دائرہ اتنا پھیل گیا ہے کہ کسی ایک شخص کے بہت سے علوم تو درکنار، کسی ایک میدان میں بھی حقیقی اختصاص پیدا کرنا ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔ ہماری بیشتر جامعات اور اعلیٰ دینی علوم کے اداروں کا نصاب اس انداز کا چلا آ رہا ہے کہ اس سے عمومی انداز کے اہل علم (generalist) تو پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن متخصصین کا پیدا ہونا بڑا دشوار ہے۔ اجتماعی علوم کے میدان میں ہماری بہت سی یونیورسٹیوں کے نصابات چالیس چالیس اور پچاس پچاس سال پرانے ہیں۔ آج ان میدانوں میں بے شمار نئے اختصاصات سامنے آ گئے ہیں جن پر ابھی تک پوری توجہ نہیں دی جا سکی۔

دینی تعلیم میں عمومیت کا یہ رنگ اور بھی گہرا ہے۔ درس نظامی کسی بھی میدان میں متخصصین پیدا کرنے کے لیے مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، اس کا مقصد نچلی سطح کے منصفین، عدالتی کارکن اور نیم عدالتی انتظامی افسران پیدا کرنا تھا۔ تاہم اس نصاب میں اتنی جان تھی کہ اس کو پڑھ کر اگر کوئی از خود اپنی محنت سے کسی خاص فن میں تخصص حاصل کرنا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا تھا۔

گزشتہ چند عشروں کے دوران بعض دینی اداروں میں تخصص اور تکمیل کے شعبے قائم کیے گئے ہیں لیکن وہ ابھی تک مطلوبہ نتائج نہیں دے سکے۔ ان حالات میں متخصصین عالم کے روبروسی معاملے میں اسلام اور مسلمانوں کا نقطہ نظر واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آئندہ آنے والے عشروں میں تخصص کے تقاضوں پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے۔

۸۔توسع:

اسلام کا مزاج بین الاقوامی اور بین الانسانی ہے۔ امت مسلمہ ایک ایسی عالم گیر مسلم برادری ہے جو رنگ، نسل اور علاقائی امتیازات سے پاک ہونی چاہیے۔ مزید برآں مستقبل میں درپیش مسائل اور چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے یہ امر ناگزیر ہے کہ امت مسلمہ ایک ایسے رویے کو اختیار کرے جس کا مقصد زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچنا اور زیادہ سے زیادہ اقوام وملل تک اسلام کا پیغام پہنچانا ہو۔ مستقبل میں جن کثیر العناصر نظام کی بات کی جا رہی ہے، اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بھی توسع کا رویہ ناگزیر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عالمگیریت کے لیے توسع ناگزیر ہے۔ فرقہ وارانہ، فقہی، علاقائی اور لسانی تنگ نائیوں سے بلند ہو کر توسع اختیار کرنا ایک اعتبار سے مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے۔

۹۔توسیع:

جدید دنیائے اسلام کے بالعموم اور پاکستان کے بالخصوص تعلیمی مسائل پر نظر رکھنے والوں پر یہ امر مخفی نہیں ہے کہ تعلیم میں اس وقت ان کا درجہ کیا ہے اور فنی مہارت اور تحقیق کی دنیا میں وہ کہاں کھڑے ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، جدید سائنسی تحقیق کے بیسیوں بلکہ شاید سینکڑوں میدان ایسے ہیں جہاں دنیائے اسلام کو مہارتوں کے حصول سے روکا جا رہا ہے۔ اگر یہ صورت حال جاری رہی تو بہت جلد وہ مرحلہ آ سکتا ہے کہ ہم تحقیق ومہارت کی وہ سطح بھی برقرار نہ رکھ سکیں جو آج ہمیں حاصل ہے۔ اندریں حالات اس امر کی فوری ضرورت ہے کہ دستیاب تحقیقی وسائل اور مہارتوں کی موجودہ سطح کو وسیع کیا جائے اور دنیائے اسلام کے جس ملک میں جو تحقیقی سہولت میسر ہے، اس میں زیادہ سے زیادہ توسیع کی جائے۔ اس کام کے لیے نہ صرف دستیاب وسائل کو مجتمع کرنے کی ضرورت

ہے بلکہ موجودہ وسائل کے بہتر سے بہتر اور زیادہ استعمال کو یقینی بنانا ہے۔ یہ مقصد وسائل کے اجتماعی اور سہولتوں میں توسیع کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ تکمیل:

دنیائے اسلام کے جن علاقوں اور ممالک میں تعلیم و تحقیق کی سہولتیں کم، نایاب یا ناپید ہیں، ان کو یہ سہولتیں فراہم کرنا اور ناقص سہولتوں کو مکمل کرنا ناگزیر ہے۔ جب تک ہماری کاوشیں ایک دوسرے کی تکمیل نہیں کریں گی، اس وقت تک ان بڑے مقاصد کا حصول ناممکن رہے گا۔

ایک نئے اور مثالی اسلامی نظام تعلیم کی تشکیل و ترتیب اور تدوین و تنفیذ آسان کام نہیں۔ یہ عمل ایک طویل اور اجتماعی غور وخوض کا متقاضی ہے۔ اس عمل کے لیے ملک و ملت کے تمام ارباب بصیرت کی اجتماعی کاوشیں درکار ہیں۔ یہ ذمہ داری اہل پاکستان کے لیے فرض کفایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ نہ صرف پوری امت مسلمہ بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے جواب دہ ہیں۔ اگر اہل پاکستان نے اس معاملہ میں کوتاہی کی تو آئندہ نسلوں کی گمراہی بلکہ ارتداد کا باران کی گردنوں پر رہے گا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کام کو کرنے کے لیے چونکہ نسلیں درکار ہیں، اس لیے حوصلہ ہار دینا چاہیے۔ نہ اس کے لیے نسلیں درکار ہیں اور نہ حوصلہ ہارنے کی ضرورت ہے۔ اصل چیز طلب اور امید ہے جس کے نتیجے میں تائید الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است و لے
طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے
در طلب کوش و مدہ دامن امید ز دست
دولتے ہست کہ یابی سر راہے گاہے

ممکن ہے ان گزارشات میں سوز و غم، آہ و فغاں، اور درد و اندوہ کی آمیزش ضرورت سے زیادہ محسوس ہو۔ اگر فی الواقع ایسا ہے تو اس کی وجہ شدت احساس ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ اگر فوری طور پر اقدام نہ کیا گیا تو یہ قافلہ جس دوراہے پر کھڑا ہے اور جہاں سے وہ کعبے کے بجائے ترکستان بلکہ فرنگستان کی منزل پر پہنچنا چاہتا ہے، وہاں سے اس کی واپسی ناممکن ہو جائے گی اور پھر؟ پھر

دنیائے اسلام کے بیشتر حصے پر اسی طرح فاتحہ پڑھ لینے کی نوبت آسکتی ہے۔جس طرح اندلس اور مشرقی یورپ کے مسلمانوں پر عرصہ ہوا پڑھی جاچکی۔جس طرح جنوبی امریکا،تاتارستان اور سائبیریا میں لاکھوں مسلمانوں اور اب نئی تحقیقات کے مطابق خود ریاست ہائے متحدہ امریکا میں لاکھوں مسلمانوں کا وجود مٹ چکا۔خدانہ کرے دنیائے اسلام کے اور بہت سے علاقوں میں یہی منظر دہرایا جائے۔یہ منظر اتنا تکلیف دہ ہے کہ اس کے تصور ہی سے احساس میں شدت،تحریر میں تیزی اور اسلوب میں سوزش پیدا ہونے لگتی ہے۔

نوائے من ازاں پرسوز و بے باک وغم انگیز است
بخاشا کم شرار افتاد و باد صبح دم تیز است

-----------------

## حوالہ جات

۱۔البقرہ:۱۲۹۔آل عمران:۱۶۴۔الجمعہ:۲۔

۲۔حم السجدہ:۵۳۔

۳۔الفاطر:۲۸۔

۵۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں کئی دعائیں منقول ہیں۔

ایک دعا کے الفاظ ہیں:

اللھم انی اعوذ بك من علم لا ینفع ومن قلب لا یخشع

(نووی/الاذکار/مکتبۃ المامون،جدہ ۱۹۹۷ء/رقم ۳۶۳)

جبکہ ایک دوسری دعا یوں مروی ہے:

اللھم انی اسئلك رزقا طیبا وعلما نافعا وعملا متقبلا (ابن ماجہ/السنن/دار المعرفۃ بیروت ۱۹۹۸ء،ج ا،ص ۳۰۶/رقم ۹۲۵)

۶۔ابن ماجہ ج اص ۹۶/رقم ۲۲۲

۷۔ایضاً،ج ا،ص ۹۸/رقم ۲۲۹

۸۔علی متقی الہندی/ کنز العمال، رقم ۴۰۴۰

۹۔الانعام: ۳۸

۱۰۔النحل: ۸۹

۱۱۔النساء: ۱۶۵

۱۲۔الفتح: ۲۸

# مغرب کا فکری اور تہذیبی چیلنج

## اور علما کی ذمہ داریاں

[۲ جنوری ۲۰۰۵ء کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں ''دینی مدارس میں عمرانی علوم کی تدریس: ضرورت اور اہمیت'' کے زیر عنوان منعقد ہونے والی فکری نشست سے خطاب]

برادران محترم!

اس وقت دنیاے اسلام جس دور سے گزر رہی ہے، یہ دور اسلام کی تاریخ کا انتہائی مشکل دور ہے۔ امت مسلمہ کو جو مشکلات آج درپیش ہیں، شاید ماضی میں اتنی مشکلات کبھی درپیش نہیں ہوئیں۔ یوں تو ایک اعتبار سے امت مسلمہ کی پوری تاریخ بحرانوں کی تاریخ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت کے آغاز سے لے کر، جب آپ دار ارقم میں قیام فرماتے تھے، آج تک کوئی صدی، اور صدی کا کوئی حصہ یا کوئی عشرہ ایسا نہیں گزرا جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اس میں مسلمانوں کو کوئی مشکل درپیش نہیں تھی۔ لیکن ان ساری مشکلات میں اور آج کی مشکل بلکہ امہات المشاکل میں ایک بڑا بنیادی فرق پایا جاتا ہے جس کو اس گفتگو میں سامنے رکھنا چاہیے۔ ماضی قریب یا ماضی بعید میں دنیاے اسلام کو جو مشکلات اور پریشانیاں ہوتی تھیں، وہ عموماً زندگی کے کسی ایک گوشے تک محدود ہوتی تھیں۔ مسلمانوں کو عسکری اعتبار سے کسی دشمن کا مقابلہ کرنا پڑا، پیچھے ہٹنا پڑا، پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ یہ ایک عسکری شکست یا عسکری ہزیمت کا معاملہ تھا۔ یا کہیں مسلمانوں کی کوئی حکومت کمزور ہوئی، غیر ملکی قوتیں مضبوط ہو گئیں اور مسلمان سیاسی طور پر پس ماندگی کا شکار ہوئے، یہ سیاسی میدان میں کمزوری تھی۔ اس طرح کی کمزوریاں جو عموماً سیاسی، مالی، عسکری یا مادی ہوتی تھیں، تقریباً ہر دور میں پیش آتی رہیں، لیکن ان سب مشکلات سے مسلمان عہدہ برآ ہوتے رہے۔ ان میں سے کسی مشکل نے مسلمانوں کو ذہنی یا اعصابی شکست سے دوچار نہیں کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان سارے ادوار میں مسلمانوں کا خاندان، مسلمانوں کی تعلیم، مسلمانوں کا نظام تربیت اور مسلمانوں کی جو اندرونی ساخت اور تشکیل (Internal fabric) تھی، وہ اکثر و بیشتر بیرونی خطرات اور حملوں سے محفوظ رہی۔ تاتاریوں کے حملے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیاے اسلام پر اس نے برا وقت

کوئی نہیں آیا، اور یقیناً وہ بہت برا وقت تھا کہ افغانستان کے مشرقی علاقوں بلکہ منگولیا کی حدود سے لے کر مصر کے حدود تک اور ترکی کے جنوبی علاقوں سے لے کر جزیرۃ العرب کے وسط تک، یہ سارا علاقہ تاتاریوں کی تاخت وتاراج کی آماج گاہ تھا۔ انھوں نے ہزاروں علمائے کرام کو شہید کیا اور بڑے بڑے جید ترین اکابر اسلام ان کی تلوار کا نشانہ بنے۔ خواجہ فریدالدین عطار، جن کے بارے میں مولانا رومؒ نے فرمایا:

عطار روح بود وسنائی دو چشم او

ما از پے سنائی وعطار آمدیم

اس درجے کے انسان کہ جن کی پیروی پر مولانا روم جیسے آدمی نے فخر کا اظہار کیا ہے، ایسے اونچے اونچے لوگ تاتاریوں کی تلوار کا شکار ہوئے۔ کتب خانے انھوں نے جلا دیے، شہر برباد کر دیے، یہاں تک کہ ابن کثیرؒ نے اپنی مشہور کتاب 'البدایہ والنہایہ' میں لکھا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی شکست خوردگی اور پست ہمتی کا یہ عالم تھا کہ 'اذا قیل لک ان التتار انھزموا فلا تصدق'، یعنی اگر تمھیں یہ خبر دی جائے کہ تاتاریوں کو شکست ہوگئی ہے تو اس پر یقین نہ کرو۔ گویا تاتاریوں کی شکست ناقابل تصور سمجھی جاتی تھی اور یہ بات ضرب المثل بن گئی تھی۔ لیکن اس ساری تباہی اور بربادی کے باوجود تاتاریوں کی شکست وریخت کا دارومدار سارا کا سارا مسلمانوں کی عسکری اور سیاسی کمزوری پر تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو سیاسی اعتبار سے منتشر اور غیر متحد دیکھا تو اس سے فائدہ اٹھایا۔ عسکری اعتبار سے کمزور پا کر نقصان پہنچایا۔ اس سے زیادہ تاتاری کچھ نہ کر سکے۔ ان کے پاس کوئی دین نہیں تھا، کوئی پیغام نہیں تھا، کوئی تہذیب نہیں تھی، کوئی مذہب نہیں تھا، کوئی فکری یا تہذیبی ایجنڈا نہیں تھا، اس لیے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن، تربیت اور خاندانی نظام ان کے حملوں سے محفوظ رہا اور ان میں سے کوئی چیز متاثر نہیں ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی اندرونی قوت نے ان کو سنبھالا دیا۔ مسلمان عوام نے اہل دل اور اہل درد مصلحین کا ساتھ دیا اور بہت جلد وہ تاتاریوں کی شکست کے نتائج اور ثمرات بد سے نکلنے میں کام یاب ہوگئے۔ یہی کیفیت بقیہ بہت سے معاملات کی بھی رہی۔

آج جو صورت حال درپیش ہے، اور آج سے نہیں، پچھلے ڈیڑھ سو سال سے درپیش ہے، وہ یہ ہے کہ ہر آنے والا دن، ہر آنے والی رات بلکہ اب تو آنے والا ہر لمحہ خطرے کی یا پریشانی کی ایک نئی جہت لے کر آتا ہے۔ آج اسلامی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو خطرات سے دوچار نہ ہو۔ فرد کے ذاتی کردار اور تربیت کا معاملہ ہو، گھر کے اندر ماں اور بچوں کے درمیان کے امور ہوں، میاں بیوی کے تعلقات کا سوال ہو، گھر کی خواتین کے رویے کا معاملہ ہو، تعلیم و تربیت کا معاملہ ہو، یا مساجد کے جاری اندر سرگرمیوں اور معمولات کا سوال ہو، ان میں سے ہر چیز آج براہ راست مغربی حملے کی زد میں ہے۔ تاتاریوں نے شاید کبھی یہ نہیں پوچھا ہوگا کہ جامعہ ازہر میں کیا پڑھایا جا رہا ہے، مسلمانوں کی نصاب کی کتابوں میں کیا لکھا جا رہا ہے یا فقہ کی کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ انھوں نے کبھی یہ چیز زیر بحث لانے کی کوشش نہیں کی۔ اسی طرح انگریز جب شروع میں یہاں آئے تو انھوں نے بھی ان معاملات پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ وہ جہاں جہاں گئے، وہاں مسیحی پادریوں کی حوصلہ افزائی کی، مغربی تعلیم کے اداروں کی سرپرستی کی، مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ جانے والوں کو طرح طرح سے نوازا، لیکن اس حد سے آگے بڑھ کر مسلمانوں کی داخلی زندگی، مذہبی امور اور مذہبی تعلیم میں براہ راست مداخلت اور زبردستی نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز کے ڈیڑھ دو سو سال یہاں رہنے کے باوجود مسلمانوں کی اندرونی ساخت بڑی حد تک (by and large) مغربی اثرات سے محفوظ رہی اور ایسے لوگ ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں کروڑوں تھے جن کی زندگی کا ایک لمحہ یا ایک گوشہ بھی انگریزی اثرات سے متاثر نہیں ہوا۔

میرے خاندان کے ایک بزرگ تھے، حافظ محمد اسماعیل جو بڑے عالم اور محدث تھے۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے والد تھے اور رشتے میں میرے والد کے پھوپھا تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کسی انگریز کی شکل نہیں دیکھی، انگریزی کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا اور اپنے گھر میں کسی کو انگریزی کا لفظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ہندوستان میں پہلے شاید ٹماٹر نہیں ہوتا تھا۔ بعد میں جب یہاں ٹماٹر آیا تو یہ لفظ شاید انگریزی کے tomato کی اردو شکل تھی۔ حافظ اسماعیل صاحب ٹماٹر کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے اور اگر کوئی یہ لفظ بولتا تھا تو اس پر ناخوشی کا اظہار کرتے تھے۔ انھوں نے اس کا

نام لال بینگن رکھا ہوا تھا۔ میرے والد صاحب بتاتے تھے کہ ایک دن گھر میں انھوں نے پوچھا کہ سالن میں کیا ڈالا ہے؟ ان سے کہا گیا کہ ٹماٹر ڈالا ہے تو وہ سخت ناراض ہوئے کہ نصرانیت میرے گھر میں گھس آئی؟ اس کو لال بینگن کیوں نہیں کہتے؟

بظاہر یہ بات آج ہمیں لطیفہ معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر مسلمانوں میں کچھ لوگ اتنی شدت کے ساتھ مغربی اثرات میں رکاوٹ پیدا نہ کرتے تو مغربی اثرات آج سے سو سال پہلے اسی طرح لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے جس طرح آج ہر جگہ گھستے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔ اس طرح کی مثالیں ایک دو نہیں، ہزاروں ہیں اور سیکڑوں، لاکھوں، بلکہ کروڑوں انسان ایسے ہیں جنھوں نے مغربی اثرات کے خلاف مزاحمت کی اور مسلمانوں کو ان سے محفوظ رکھنے کی سعی کی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ انھوں نے مغرب کی مثبت چیزوں کو بھی روکا۔ یقیناً بعض باتیں مغرب میں مثبت بھی تھیں جن کے بہت سے ثمرات سے مسلمان محروم رہے، لیکن آج یہ بات کہنا اور تبصرہ کرنا تو بڑا آسان ہے کہ فلاں بزرگ نے فلاں چیز پر پابندی لگا دی تھی اور فلاں شخص نے مغربی اثرات کے ثمرات سے مسلمانوں کو محروم رکھا، لیکن آج سے دو ڈیڑھ سو سال پہلے کے ماحول میں جو انسان خود کو طوفان کے سامنے کھڑا محسوس کرتا ہے، طوفان اس کو امنڈتا ہوا دکھائی دے رہا ہے، اپنا گھر اور وطن تباہ ہوتا اس کو نظر آ رہا ہے اور اس طوفان کے نتائج وعواقب اس کے سامنے ہیں، وہ حالات کا جائزہ لے کر فوری طور پر ایک فیصلہ کرلے اور اس فیصلے کے نتیجے میں بعض منفی اور بیشتر مثبت چیزیں سامنے آئیں تو آج ہم یہ طے کرنے میں حق بجانب نہیں ہیں کہ فیصلہ کرنے والے کو کیا فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ ویسے بھی 'لو' (اے کاش) سے حضور نے منع فرمایا ہے۔ ماضی میں جس نے کوئی فیصلہ کیا، اس نے اس کی ذمہ داری بھی لی۔ بعض لوگوں نے ایک فیصلہ کیا تو بعض نے دوسرا۔ دونوں کے ثمرات ونتائج آج ہمارے سامنے ہیں۔ ہم نتائج پر تو بات کر سکتے ہیں، لیکن ماضی کو مستقبل کی طرف سے مشورہ دینا کہ ان کو کیا کرنا چاہیے تھا، یہ ایک غیر ضروری مشورہ ہے جس کا کوئی نتیجہ مستقبل میں نکلنے والا نہیں۔ البتہ ہم ماضی کے اس تجربے سے مستقبل کے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ وہ آج ہمیں کر لینا چاہیے۔

آج کی صورت حال یہ ہے کہ جن حضرات نے ڈیڑھ سو سال پہلے امت مسلمہ کو مغرب کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی، وہ سب اپنا اپنا کام کر کے دنیا سے جا چکے۔ انھوں نے جو جذبہ پیدا کیا، جس رویے کو جنم دیا، وہ جذبہ اور رویہ آج کمزور پڑ گیا ہے اور آج مغرب کے تہذیبی، ثقافتی، فکری حتیٰ کہ مذہبی اثرات کے لیے مسلمانوں کے ہر گھر کے دروازے اور ہر کمرے کی کھڑکیاں اس طرح کھلی ہیں کہ اس میں مغرب کے کسی اچھے یا برے اثرات یا نتائج کو داخل ہونے سے روکنا آسان نہیں رہا۔ ہمارے ہاں بہت سے حضرات کا یہ خیال ہے کہ مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں کو ہمیں اپنے اندر آنے کا موقع دینا چاہیے اور اس کے منفی اثرات کا راستہ روکنا چاہیے۔ اگرچہ یہ رائے رکھنے والوں میں اس پر اتفاق رائے نہیں ہے کہ مغرب کے کون سے اثرات وثمرات مثبت ہیں اور کون سے منفی، لیکن اصولی طور پر یہ ایک درست رویہ ہے اور ہر صاحب بصیرت مسلمان اس سے اتفاق کرے گا۔ یہ 'خذ ما صفا ودع ما کدر' کا اسلامی اصول ہے جس سے مسلمانوں نے ہمیشہ اتفاق کیا اور جو مسلمانوں کی فکری اور علمی تاریخ کا ہمیشہ طرۂ امتیاز رہا ہے، لیکن ہم میں سے بہت سے لوگ یہ اندازہ نہیں کر پاتے کہ کیا مغرب کا ایجنڈا بھی یہی ہے کہ ہم 'خذ ما صفا ودع ما کدر' پر عمل کریں۔ جو چیز ہمارے لیے قابل قبول ہو، وہ ہمارے سامنے پلیٹ میں رکھ کر پیش کر دیں اور جو چیز ہمارے لیے قابل قبول نہ ہو، اس کو واپس اپنی الماری میں رکھ دیں؟ حقیقت یہ ہے کہ مغرب اس انتخاب واختیار کے رویے سے اتفاق نہیں کرتا۔ وہ اپنا پورا ایجنڈا یہاں لانا چاہتا ہے اور انھوں نے ہم سے زیادہ اس مسئلے پر غور کیا ہے کہ ان کی تہذیب کا جو پورا پیکج ہے، اس کی کون سی چیزیں اس پر منفی اثرات مرتب کر سکتی ہیں۔ اس پر باقاعدہ تحقیقات کی گئی ہیں، کتابیں لکھی گئی ہیں اور صرف عام سطح پر نہیں بلکہ بڑی سے بڑی اور اعلیٰ سے اعلیٰ سطح پر اس پر غور وخوض ہوا ہے۔ حتیٰ کہ خالص سیاسی قائدین بھی ان فکری اور تہذیبی مسائل پر سوچتے اور اظہار خیال کرتے رہے ہیں۔ اگر آپ نے سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن کی کتاب 'Seize the Moment' پڑھی ہو تو آپ کو یاد ہوگا کہ اس میں اس نے پوری تفصیل سے یہ بات بیان کی ہے کہ دنیائے اسلام میں مغربی اثرات کا نفوذ کس حد تک ہے اور کس طرح ہونا چاہیے۔ یہ بات نہ صرف نکسن نے لکھی ہے،

بلکہ ان کے صف اول کے تمام دانش ور، مفکرین اور مدبرین یہ بات لکھ رہے ہیں۔

آج سے چند سال پہلے مجھے جرمنی میں ایک اجتماع میں جانے کا موقع ملا جس میں مختلف ممالک کے دانش ور اور مفکرین مدعو کیے گئے تھے جن میں واحد مسلمان شریک غالباً میں تھا۔ میرے علاوہ باقی لوگ مغربی یورپ اور خاص طور پر وسطی یورپ سے بلائے گئے تھے۔ اس اجتماع کا عنوان تھا: Is Islam a threat to Western Europe? (کیا اسلام مغربی یورپ کے لیے ایک خطرہ ہے؟) جرمنی کے ایک علمی اور تحقیقی ادارے نے مجھے بلایا تھا کہ میں بھی اس موضوع پر مسلمانوں کی طرف سے اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ یہ کوئی ایک ہفتے کی نشست تھی جس میں انھوں نے چودہ آدمیوں کو اپنے خیالات و افکار کو تفصیل سے پیش کرنے کی دعوت دی تھی۔ ایک دن میں دو آدمیوں کی گفتگو ہوتی تھی جس میں ہر شخص تفصیل سے اپنے خیالات حاضرین کے سامنے پیش کرتا تھا۔ ان خیالات پر بھرپور بحث و تمحیص اور تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ اس میں ایک دن مجھے بھی گفتگو کرنے کا موقع ملا جس میں یہ سوال سامنے آیا کہ دنیائے اسلام میں مغربی اثرات کے حوالے سے کیا رویہ رہا ہے؟ اس کے جواب میں، میں نے کہا کہ عالم اسلام میں جب سے مغربی اثرات آئے ہیں، جس کو کم و بیش دو سو سال کا عرصہ ہو چکا ہے، اس کے بارے میں دنیائے اسلام نے تین رویے اختیار کیے ہیں۔ ان میں سے دو رویے تو بتدریج کمزور ہو رہے ہیں یا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ کمزور ہو رہے ہیں، اور تیسرا رویہ بڑھتا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اس میں پچھلے پچاس، سو سالوں میں نسبتاً زیادہ قوت پیدا ہوئی ہے۔

ایک رویہ جو سمٹ رہا ہے اور سمٹتے سمٹتے یقیناً ختم ہونے کے قریب ہے، وہ ہے جس کی مثال میں نے لال بینگن اور ٹماٹر کے حوالے سے دی۔ اب شاید دنیائے اسلام میں اس طرح کی مزاحمت کرنے والے لوگ موجود نہیں بلکہ اس طرح کی مزاحمت کی افادیت کے قائل بھی میں سمجھتا ہوں کہ نہیں رہے۔ اگر ہیں تو بہت تھوڑے لوگ ہیں جن کا کوئی قابل ذکر اثر معاشرے میں نہیں ہے۔ یہ وہ رویہ تھا جو ابتدا میں بہت مضبوط تھا لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ ختم یا بہت کمزور ہوتا گیا۔

دوسرا رویہ جو شروع میں بہت قوت سے سامنے آتا محسوس ہوتا تھا، مسلمانوں کی اکثریت نے

اس سے بھی زیادہ اتفاق نہیں کیا اور یہ رویہ بھی، جس کی نمائندگی انیسویں صدی کے اواخر میں ایک طبقے نے بہت زور وشور سے کی، کمزور ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔ وہ مکمل طور پر مغرب کے رنگ میں رنگ جانے کا رویہ ہے۔ اس رویے کے علم بردار حضرات نے یہ سمجھا کہ مسلمان اگر مغرب کے ساتھ سو فیصد ہم آہنگی کر لیں تو شاید ان کے تمام مسائل حل اور تمام مشکلات دور ہو جائیں گی۔ اس رویے کے ترجمان ۱۹ ویں صدی کے اواخر اور ۲۰ ویں صدی کے آغاز میں دانشوروں میں بھی، سیاسی لیڈروں میں بھی اور عام سطح پر بھی کثرت سے پائے جاتے تھے، لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ یہ رویہ بھی کمزور ہو رہا ہے۔

تیسرا رویہ جو آغاز میں بہت کمزور اور تقریباً برائے نام تھا، اب دنیاے اسلام میں اس نے اپنی جگہ بنالی ہے اور مسلمان مفکرین اور دانش وروں کی ایک بڑی تعداد اس کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ وہی 'خذ ما صفا ودع ما کدر' کا رویہ ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ مغربی تہذیب کے مثبت پہلوؤں سے مسلمانوں کو پورا پورا استفادہ کرنا چاہیے۔ مغرب کی سائنس، مغرب کی ٹیکنالوجی، مغرب کی سہولتیں، یہ سب چیزیں مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہیں۔ ان کو سیکھنا چاہیے اور ان کو اپنانا چاہیے، البتہ اہل مغرب کے تہذیب وثقافت کے جو منفی پہلو ہیں، مثلاً اخلاقی اقدار کے متعلق ان کے خیالات ونظریات، یا سیکولرازم اور لامذہبیت، یا مرد وزن کی آزادی کا تصور جو ان کے ہاں ہے، یہ سب باتیں خلاف اسلام ہیں، یہ چیزیں دنیاے اسلام کو قبول نہیں کرنی چاہییں۔ یہ رویہ پہلے بہت محدود تھا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں وسعت پیدا ہوئی ہے اور آج دنیاے اسلام کی ایک بڑی تعداد اس رویے پر کاربند محسوس ہوتی ہے۔

۱۹۹۴ء، ۱۹۹۵ء میں مذکورہ اجتماع میں جب میں نے ایک سوال کے جواب میں مذکورہ تجزیہ تفصیل سے بیان کیا تو اس کے جواب میں اجتماع کے شرکا نے، جن میں فرانسیسی نمائندے بھی شامل تھے، جرمن اور آسٹریا کے لوگ بھی شامل تھے، تقریباً بالاتفاق مجھے controvert کیا اور کہا ٹھیک ہے، آپ اس رویے کو درست سمجھتے ہوں گے لیکن مغرب ان شرائط پر اپنی ٹیکنالوجی اور اپنی تہذیب وتمدن سے آپ کو استفادہ کرنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں ہوگا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت پہلی

مرتبہ یہ پہلو میرے سامنے آیا۔ اس سے پہلے میرا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا۔ اس سے پہلے میرے ذہن میں کبھی یہ سوال نہیں آیا تھا کہ کیا مغرب بھی اس بات پر تیار ہے یا نہیں کہ آپ کی شرائط پر اپنی ٹیکنالوجی اور تہذیب سے آپ کو استفادہ کرنے کی اجازت دے۔ کم از کم اس اجتماع کے شرکا کا جواب بالاتفاق یہی تھا کہ مغرب آپ کو اس کی اجازت نہیں دے گا۔ مغرب کی رائے میں یہ ایک پورا پیکج ہے جس کو آپ کو جوں کا توں قبول کرنا پڑے گا اور اس میں وہ آپ کو اخذ وانتخاب ( pick and choose ) کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس وقت میں نے یہ سمجھا کہ یہ دانش ور اور مفکرین شاید اپنے ہاں کی جمہور یا اکثریت کی رائے کی ترجمانی نہیں کر رہے، اور مغربی تہذیب میں جو فیصلہ کن قوتیں ہیں، ان کی زبان نہیں بول رہے۔ اس وقت میرا احساس یہ تھا کہ جس طرح ہر شخص اپنی تہذیب کے بارے میں ایک عصبیت کا رویہ رکھتا ہے، یہ حضرات بھی اپنی تہذیب کے بارے میں شدید عصبیت اور حمیت رکھتے ہیں اور اس عصبیت کی وجہ سے یہ بات ان کو پسند نہیں آئی کہ ہم ان کی تہذیب کے بعض پہلوؤں کو کمزور، غیر اخلاقی اور منفی قرار دے کر مسترد کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک کمزور اور غریب فقیر آدمی کسی دولت مند شخص سے، جس کا وہ ممنون احسان بھی رہتا ہے اور اس کے خاندان کے بہت سے افراد اس کے زلہ ربا بھی ہوں، یہ کہے کہ آپ کی کوٹھی یا محل میں فلاں فلاں چیزیں مجھے غلط اور بے محل معلوم ہوتی ہیں اور میں انھیں مسترد کرتا ہوں تو ظاہر ہے کہ یہ منفی تبصرہ، وہ بھی ایک محتاج کی زبان سے ایک دولت مند مربی کو اچھا نہیں لگے گا اور وہ اس کو بے وقوف سمجھے گا۔ میرا تاثر یہ تھا کہ شاید وہ طرح کی اس نفسیاتی کیفیت میں میری بات کی تردید کر رہے ہیں، لیکن پچھلے بارہ پندرہ سالوں میں مغرب کے بہت سے لوگوں سے ملنے، ان کی باتیں سننے اور ان کی تحریریں پڑھنے کا اتفاق ہوا، اور اب مجھے یہ لگتا ہے کہ یہ ان کی طے شدہ پالیسی ہے جو انھوں نے سوچ سمجھ کر اختیار کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ دنیاے اسلام اپنے آپ کو مکمل طور پر مغرب کے رنگ میں رنگے اور مکمل طور پر مغربی ایجنڈے کو اختیار کرے تو مشرق و مغرب میں پرامن بقاے باہمی ممکن ہے، اور اگر دنیاے اسلام اس شرط کے ساتھ بقاے باہمی کے لیے تیار نہ ہو تو مغربی تہذیب کے فوائد یا مثبت اثرات سے مسلمانوں کو یک طرفہ طور پر متمتع ہونے کی اجازت نہ دی جائے۔ یہ بات

جو ۱۹۹۴-۱۹۹۵ء سے پہلے میرے علم میں نہیں تھی، اب وقت کے ساتھ ساتھ روز روشن کی طرح یوں واضح ہے کہ مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ پوری دنیاے مغرب کا ایک طے شدہ فیصلہ ہے کہ دنیاے اسلام پر مغرب کے ایجنڈے کو سو فی صد نافذ کیا جائے اور عالمگیریت کے نئے نظریات اور تصورات سے کام لے کر اہل مشرق کو بالعموم اور دنیاے اسلام کو بالخصوص مغرب کا تابع مہمل اور نقل مطابق اصل بنایا جائے۔

مغرب کا ایجنڈا ایک ہمہ گیر ایجنڈا ہے اور اس میں سیاست ومعیشت، تجارت و مالیات اور تعلم وثقافت سے لے کر فرد اور خاندان تک ہر چیز شامل ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہاں جو بہت سے کام ہو رہے ہیں، وہ محض اتفاق سے یا مسلمانوں کی کمزوری کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ یقیناً مسلمانوں میں کمزوریاں بھی ہیں اور ان کی دینی حمیت میں کمی بھی آئی ہے، ان کے آپس کے اختلافات اور شخصی اور گروہی مفادات کے ٹکراؤ نے ان کے لیے ان گنت مسائل پیدا کیے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ بالا دست قوتیں بھی ہیں جو طے شدہ پروگرام کے تحت آگے بڑھ رہی ہیں اور دنیاے اسلام کو ایک خاص رخ پر چلانا چاہتی ہیں۔ اب مسلمان کس حد تک اس میں ساتھ جانے کو تیار ہیں، اس کے بارے میں مختلف طبقوں کے ردعمل مختلف اور رویے متفاوت ہیں۔ حکمرانوں کے مفادات یہاں عامۃ الناس کے احساسات ارتصورات سے متعارض ہیں۔ مسلمان دانش جو سمجھتے ہیں کہ مغرب کی مثبت چیزوں سے اتفاق کریں اور منفی چیزوں کو مسترد کر دیں، وہ کس حد تک اس میں کام یاب ہوں گے، اور مستقبل کیا خبر لائے گا، یہ اللہ ہی کو بہتر معلوم ہے، لیکن اس رویے کی کامیابی کا سارا دارومدار مسلمانوں کے فہم صحیح پر، مسلمانوں کی بصیرت اور ان کے عزم وارادے پر ہے، اور اس فہم صحیح کے لیے جو چیز سب سے پہلے درکار ہے، وہ خود دنیاے اسلام میں اسلامی تہذیب، اسلامی علوم وفنون اور معارف اسلامی سے گہری اور ماہرانہ واقفیت ہے۔ جب تک شریعت اور شریعت کے پیغام اور تعلیم میں یہ گہری بصیرت اور ماہرانہ واقفیت پیدا نہیں ہوگی، اس وقت تک کوئی ایسی بنیاد فراہم نہیں ہو سکتی جس پر آگے چل کر عمارت کھڑی کی جا سکے۔

ایک زمانہ تھا کہ دنیاے اسلام میں علوم وفنون کی اساس قرآن مجید تھا۔ قرآن مجید وہ جز فراہم

کرتا تھا جس سے علوم وفنون کا سدا بہار گلستان پیدا ہوا جس نے ایک ہزار سال تک دنیا کو علم وتحقیق کے ثمرات سے بہرہ مند کیا۔ یہی وہ درخت تھا جس کے برگ وبار اور ثمرات مسلمانوں کے بقیہ علوم وفنون کی صورت میں سامنے آئے۔ آج سے کم وبیش ایک ہزار سال پہلے قاضی ابوبکر بن العربی نے، جو ایک مشہور مفسر اور مالکی فقیہ ہیں، لکھا تھا کہ مسلمانوں کے جملہ علوم وفنون کی تعداد سات سو ہے۔ ان سات سو علوم وفنون کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ سنت سے ہے اور یہ سب کے سب سنت کی شرح کی حیثیت رکھتے ہیں، اور سنت رسول قرآن مجید کی تشریح وتفسیر ہے۔ اس لیے قرآن مجید کی حیثیت اس بنیاد اور جڑ کی ہے جس پر مسلمانوں کی ساری تعلیمی، فکری اور تہذیبی سرگرمی کا دارومدار ہے۔ یہی بات ایک جگہ قبل ازیں امام شافعی نے فرمائی تھی۔ ان کا ارشاد تھا کہ مسلمانوں کے تمام اقوال ونظریات سنت رسول کی شرح ہیں اور سنت رسول قرآن مجید کی شرح ہے۔ یہ کیفیت کم وبیش گیارہ، بارہ سو سال قائم رہی اور ایک منفرد تعلیمی روایت نے اس کیفیت کو برقرار رکھا۔ ایسے نظام تعلیم نے جس کی اساس قرآن مجید، سنت رسول اور ان دونوں سے پیدا ہونے والے علوم وفنون پر تھی، امت مسلمہ کی تمام ضروریات کو پورا کیا۔ امت مسلمہ میں بڑی بڑی ریاستیں بھی قائم ہوئیں، دنیائے اسلام میں بڑی بڑی تہذیبیں سامنے آئیں، اور یورپ کے کم وبیش آدھے حصے پر مسلمانوں کی حکومت رہی۔ مسلمانوں کی فوجیں آسٹریا کے حدود تک پہنچیں اور ویانا کا محاصرہ کیا۔ مشرقی اور جنوبی یورپ میں مسلمانوں کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ اسی طرح اسپین میں آج بھی مسلمانوں کی سات سو سالہ حکومت کے آثار موجود ہیں۔ جہاں بانی کے اس پورے سلسلے میں اسلامی علوم وفنون اور وحدت پر مبنی نظام تعلیم نے مسلمانوں کے خالص دینی تقاضے بھی پورے کیے اور خالص دنیوی تقاضے بھی۔

یہ تاثر کہ دینی اور دنیوی علوم جدا جدا اور الگ الگ بہنے والی مختلف نہریں ہیں، اسلامی تاثر نہیں، بلکہ یہ مغرب کا تحفہ اور مغربی سیکولرازم کے باقیات سیئات واثرات بد میں سے ہے۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں اور میں بغیر کسی تردد کے یہ بات عرض کرتا ہوں کہ جب تک مذہبی اور دنیاوی تعلیم کے یہ دو نظام الگ الگ برقرار رہیں گے، دنیائے اسلام میں سیکولرازم کو فروغ ملتا رہے گا۔ جو علمائے کرام دینی اور دنیاوی تعلیم کو الگ الگ رکھنے پر مصر ہیں، وہ اپنے اس رویے سے

سیکولرازم کو فروغ دے رہے ہیں، وہ سیکولرازم جس کو مغرب کا سب سے بڑا فکری اور نظریاتی فتنہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ سیکولرازم کیا ہے؟ سیکولرازم یہ ہے کہ دنیا کے معاملات دین اور مذہبی کی راہنمائی سے آزاد رہیں۔ دونوں کے دائرے الگ الگ ہوں۔ جو چیز مذہبی ہے، وہ مذہبی دائرے میں رہے اور جو غیر مذہبی ہے، وہ غیر مذہبی دائرے میں رہے اور ان دونوں کے درمیان کوئی ہم آہنگی اور اتفاق پیدا نہ ہو۔ یہ دونوں ایک نہر یا ایک دریا کے دو کنارے ہیں جو کبھی آپس میں نہیں ملتے اور ایک دوسرے کے متوازی چلتے رہتے ہیں۔ زندگی کو دو متوازی (بلکہ متحارب) نظاموں اور دو متوازی حصوں میں تقسیم کرنا، اسی کو سیکولرازم کہتے ہیں۔ یہی لامذہبیت اور لادینیت ہے۔ لادینیت کسی اور چیز کا نام نہیں ہے۔

انگریز کے زمانے میں جب مسلم معاشرے کی اصل قیادت مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن گئی تو اس وقت مسلمانوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ وہ اسلامی علوم وفنون کے تحفظ کے لیے ایک خالص دینی نظام تعلیم کے قیام پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ یہ ایک دفاعی حکمت عملی تھی اور امت مسلمہ میں مذہب کی باقیات کو بچانے کا واحد طریقہ کار یہی تھا کہ مذہبی تعلیم کے نام پر جو کچھ کیا جا سکتا ہے، وہ کیا جائے اور جس حد تک مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو برقرار رکھا جا سکتا ہے، رکھا جائے۔ اس سے پہلے کبھی بھی ایسا نہیں تھا کہ دینی تعلیم اور دنیاوی تعلیم کے دو الگ الگ نظام موجود رہے ہوں۔ چنانچہ مغلیہ دور میں جس نظام تعلیم اور جن درس گاہوں نے، جس نصاب تعلیم اور جس تعلیمی روایت نے مجدد الف ثانی جیسا شخص پیدا کیا، جس کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم کا یہ تعارفی جملہ میں ہمیشہ دہرایا کرتا ہوں کہ The greatest religious genius produced by Muslim India، (مسلم ہندوستان نے سب سے بڑا جو مذہبی عبقری پیدا کیا، وہ شیخ احمد سرہندی تھے)، اسی نظام میں نواب سعد اللہ خان بھی تیار ہوا تھا جو مجدد صاحب کی طرح اس نظام کی پیداوار تھا اور جو سلطنت مغلیہ کا وزیر اعظم بنا، وہ سلطنت مغلیہ جو موجودہ افغانستان، پاکستان، ہندوستان، نیپال، بنگلہ دیش، سری لنکا، بھوٹان، سکم، برما جیسی بڑی بڑی ریاستوں کے بیشتر حصے پر مشتمل تھی۔ اس وسیع سلطنت کے نظام کو اس نے شاہ جہان کے زمانے میں کامیابی سے چلایا تھا۔ پھر استاد احمد معمار جس

نے تاج محل بنایا، یہ بھی اسی نظام کی پیداوار تھا۔ یہ تینوں ایک ہی نظام تعلیم کے ثمرات تھے اور ایک ہی نصاب کے پڑھے ہوئے تھے۔ اب دیکھیے کہ ایک وہ شخص جس نے دنیا کی متمدن ترین سلطنت کو اس کے کامیاب ترین ادوار میں قیادت فراہم کی اور اس کا نظام چلا کر دکھایا، دوسرا وہ شخص جو ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بڑا مذہبی عبقری ہے، جس کی فکری گہرائی اور روحانی عظمت کو بیان کرنا بھی دشوار ہے اور جس نے برصغیر کی دینی تحریکات پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ بعد کی کوئی دینی تحریک اور کوئی دینی سرگرمی اس کے اثر اور شخصیت کے احترام سے خالی نہیں ہے، اور تیسرا وہ شخص جس نے دنیا کے سات عجائب میں سے ایک عجوبہ بنایا، یہ تینوں افراد یہ ایک ہی نصاب کے پڑھے ہوئے اور ایک ہی تعلیمی نظام کی پیداوار تھے۔ یہی اسلام کا آئیڈیل اور یہی اسلام کا معیار ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ پاکستان بننے کے فوراً بعد ہم اس پر از سر نو غور کرتے اور یہ طے کرتے کہ آزاد مسلم مملکت پاکستان میں تعلیمی ضروریات کیا ہوں گی، پاکستانی معاشرے کو دینی راہنمائی فراہم کرنے کے لیے کس انداز کے اہل علم درکار ہوں گے، پاکستان کی اسلامی خطوط پر تعمیر نو کے لیے کیسے ماہرین کی ضرورت ہوگی، لیکن غور وفکر کا یہ کام نہ حکومتوں نے کیا اور نہ ہی اہل علم نے اس پر ابھی تک کوئی توجہ دی ہے۔ یہ ایک بہت اہم مسئلہ ہے جس پر ملک وملت کی آئندہ تعمیر کا دارومدار ہے۔ اس پر جتنی جلدی غور کر کے اس کو حتمی طور پر طے کر لیا جائے، اتنا ہی اچھا ہوگا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ کام پوری امت مسلمہ کی تاریخ کے ایک مرحلہ کی تشکیل نو کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک نئے دور کی بنیاد رکھنے کے مترادف ہے اور میں اس کو اس سے کہیں زیادہ اہم سمجھتا ہوں جتنی اہمیت دارالعلوم دیوبند کے قیام کی تھی۔ میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا اور اسے ہرگز غیر اہم نہیں سمجھتا۔ برصغیر اور پورے جنوبی ایشیا میں پچھلے ڈیڑھ سو سال میں مسلمانوں کی پوری مذہبی تاریخ دارالعلوم دیوبند اور اس کے موسسین کی مرہون منت ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک وقتی اور دفاعی حکمت عملی تھی۔ اب ضرورت دائمی اور اقدامی حکمت عملی کی ہے۔ یہ کام جس کا آغاز آج مولانا زاہد الراشدی اور ان کے ہم خیال اہل علم نے کیا ہے یا کر رہے ہیں، اگر یہ نتیجہ خیز ثابت ہو تو اس کے اثرات دیوبند کے اثرات سے کہیں زیادہ دیرپا اور دور رس ہوں گے، اس لیے کہ یہ اس

روایت کا احیا کرنے کے مترادف ہے جو اصل اسلامی روایت ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی کاوش یا مہم ایک بدلی ہوئی صورت حال میں دفاعی اور وقتی کوشش تھی۔ وہ آئیڈیل صورت نہیں تھی اور نہ ہی وہ آئیڈیل حالات تھے۔ نہ وسائل دست یاب تھے، نہ حکومتی سرپرستی دست یاب تھی، اور نہ وہاں کے فارغ شدہ حضرات کے لیے قیادت کے مناصب موجود تھے، نہ معاشرہ ان کی قیادت کو ماننے اور ان سے رہنمائی لینے کے لیے تیار تھا۔ ان کی رہنمائی مسجد اور مدرسے کے خاص دائرے تک محدود تھی۔ اس کے لیے انھوں نے جو کچھ کیا، وہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے کیا اور بہت دردمندی اور اخلاص وقربانی کے جذبے سے کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے گا اور آج جتنا دین موجود ہے، وہ اکثر وبیشتر انھی کی کاوش کی وجہ سے موجود ہے۔ لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ جو دین موجود ہے، اس کو زندگی کے روزمرہ معاملات سے Relate کیا جائے اور اس کو دوبارہ معاشرے میں فعال قائدانہ کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں لایا جائے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ اہل دین کے پاس دینی علوم کا تخصص بھی موجود ہو اور جس دنیا اور جس معاشرے میں انھیں قیادت فراہم کرنی ہے، اس کے بارے میں بھی قائدانہ اور ناقدانہ واقفیت انھیں حاصل ہو۔

جب میں یہ بات عرض کرتا ہوں تو بعض علمائے کرام یہ سمجھتے ہیں اور مجھ سے انھوں نے اس کا اظہار بھی فرمایا کہ میں دینی تخصصات کو غیر اہم سمجھتا ہوں اور ان کی جگہ دوسرے دنیاوی تخصصات کو فروغ دینا چاہتا ہوں۔ ان حضرات کے خیال میں گویا میں اس بات کا داعی ہوں کہ دینی مدارس کو میڈیکل کالجز میں تبدیل کر دیا جائے یا مغربی تعلیم اور فنی تخصصات کے ادارے بنا دیا جائے۔ ایک بڑے محترم اور بزرگ عالم نے مجھ سے غصے سے پوچھا کہ کیا انجینئرنگ کالج میں مولوی تیار ہوتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر دینی مدارس میں انجینئر کیوں تیار ہوں؟ لیکن یہ ایک خلط مبحث ہے۔ نہ یہ مقصد ہے اور نہ یہ اعتراض درست ہے۔ اس لیے کہ نہ انجینئر تیار کرنا مقصد ہے اور نہ میڈیکل ڈاکٹر تیار کرنا بلکہ علمائے کرام ہی تیار کرنا مقصد ہے، لیکن قاضی ابو یوسف، امام محمد یا کم از کم ملا محب اللہ بہاری، میر زاہد ہروی اور نواب سعد اللہ کی طرح کے علما۔

اصل بات یہ ہے کہ ہر دور کا ایک محاورہ اور ایک زبان ہوتی ہے۔ قرآن مجید اور سنت تو ایسے

سرچشمے ہیں جو ہمیشہ کے لیے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ان کا محاورہ ہر دور کے لیے ہے اور ہر دور کے لیے رہے گا۔ان کے محاورے میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔وہ ہمیشہ وہی رہے گا،اوران کو ہمیشہ انھی کے محاورے اور انھی کی اصطلاح میں سمجھا جائے گا،لیکن فقہاء کرام،شارحین حدیث اور مفسرین نے شریعت کے نصوص کو اپنے اپنے زمانے سے Relate کیا اور اپنے زمانے کے محاورے میں اس کی تعلیم کو مرتب کیا ہے۔یہ محاورہ حالات کے بدلنے سے بدل سکتا ہے۔ماضی میں بھی بدلتا رہا ہے اور آئندہ بھی بدلتا رہے گا۔اس کی چھوٹی سی مثال میں آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں کہ وہ علماے کرام جن کے پاس ٹھوس دینی علوم موجود ہیں،ان کے پاس گویا بجلی کا پاور ہاؤس اور اس میں قوت کا ذخیرہ موجود ہے۔اس ذخیرے سے استفادے کے لیے ضروری ہے کہ استفادہ کرنے والوں اور پاور ہاؤس کے درمیان کنکشن ممکن بھی ہو اور موجود بھی۔دونوں ایک ہی وولٹیج پر کام کرتے ہوں۔اب یہ پاور ہاؤس تو دائمی ہے،وولٹیج اس آلے کے بدلنے سے بدلتا رہے گا جس کو بجلی سے چلانا مقصود ہے۔یہی حال علماے کرام کے وولٹیج یا محاورے کا ہے۔چونکہ ان کا محاورہ آج کے محاورے سے مختلف ہے، اس لیے دور جدید کا آدمی ان کے علم سے استفادہ نہیں کرتا۔

آج سے کم وبیش ۲۵ سال پہلے وفاقی شرعی عدالت قائم ہوئی۔جسٹس صلاح الدین مرحوم اس کے پہلے چیف جسٹس تھے۔بہت نفیس انسان تھے۔میرے مشورے سے انھوں نے بعض علماء کرام کو وفاقی شرعی عدالت کا مشیر مقرر کیا۔میں نے ان سے کہا کہ جن حضرات کو آپ نے مشیر مقرر کیا ہے،جن کی تعداد ۳۰،۳۵ کے قریب تھی،ان سب کو آپ کھانے کی دعوت دیں۔چنانچہ انھوں نے پورے پاکستان سے ان جید علماء کرام کو کھانے کی دعوت دی۔ایک بزرگ جو بہت ٹھوس عالم تھے، انتہائی گہرا علم رکھتے تھے،وہ ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔چیف جسٹس صاحب نے ان سے پوچھا کہ حضرت! Islamic State کی Minimum requirement کیا ہے؟ بالکل یہی الفاظ تھے،یعنی کسی ریاست کے اسلامی ریاست ہونے کے کم سے کم تقاضے کیا ہیں؟ اس کا وہ بزرگ کوئی صحیح جواب نہیں دے پائے۔شاید سمجھے نہ ہوں۔جسٹس صاحب نے دوبارہ اردو میں پوچھا کہ اسلامی ریاست کے کم سے کم تقاضے کیا ہیں؟ تو اس پر بھی وہ بزرگ کوئی صحیح جواب نہیں دے پائے۔میں

تھوڑے فاصلے پر تھا۔ مجھے خیال ہوا کہ یہ صف اول کے عالم ہیں، اگر یہی چیف جسٹس کے اس سوال کا جواب نہ دے سکے تو ہو سکتا ہے کہ علما کے بارے میں ایک منفی تاثر جسٹس صاحب کے دل میں بیٹھ جائے۔ میں نے درمیان میں مداخلت کی گستاخی کرتے ہوئے کہا کہ شاید چیف جسٹس صاحب یہ پوچھنا چاہ رہے ہیں کہ 'دارالاسلام' کی تعریف کیا ہے؟ اب انھوں نے فوراً جواب دیا اور بڑے مدلل انداز میں جواب دے کر چیف جسٹس کو بڑی حد تک مطمئن کر دیا۔ اس وقت یہ بات مجھ پر واضح ہوئی کہ علمائے کرام کے پاس علم تو ہے، لیکن اس کو آج کل کے انسانوں کے لیے دستیاب کرنے کے لیے جس محاورے کی ضرورت ہے، وہ محاورہ کم یاب ہے۔

محاورہ ہر زمانے کا مختلف ہوتا ہے اور ہر زمانے کے علوم سے متاثر ہوتا ہے۔ جس زمانے میں مسلمانوں میں منطق اور یونانی علوم وعقلیات کا رواج نہیں تھا، آپ اس زمانے کی اصول فقہ کی کتابیں دیکھیں کہ ان کا انداز کیا تھا؟ امام شافعی کی کتاب 'الرسالہ' پڑھیں۔ اس کے بعد آپ خود شافعی فقیہ امام غزالی کی 'المستصفی' پڑھیں۔ دونوں کے محاورے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے اسرار حدیث پر کتاب لکھی ہے۔ اسرار حدیث پر 'معالم السنۃ' میں امام خطابیؒ نے بھی لکھا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں معالم السنۃ سے استفادے کا اعتراف بھی کیا ہے۔ آپ ان دونوں کتابوں کو پڑھیں تو دونوں کے محاورے میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوگا۔ شاہ ولی اللہ کا محاورہ سارے کا سارا یونانی فلسفے اور عقلیات پر مبنی ہے اور یونانی فلسفہ جیسا کہ برصغیر میں پڑھایا جاتا تھا، میبذی اور شرح ہدایۃ الحکمۃ اور فلسفے کے بارے میں جو جو کتابیں اس وقت رائج تھیں، ان سب کے اثرات اور مصطلحات شاہ صاحب کی 'حجۃ اللہ البالغہ' میں موجود ہیں۔ غور فرمائیے کہ علم حدیث کی بات ہو رہی ہے اور شاہ صاحب علم اسرار حدیث پر گفتگو فرما رہے ہیں، لیکن منطق اور فلسفے کے محاورے میں۔ جو بات خطابی نے کی ہے، وہی بات شاہ صاحب کہہ رہے ہیں اور اسی کو آگے بڑھا رہے ہیں، لیکن ایک دوسرے اسلوب اور ایک نئے لہجے اور انداز بیان میں۔ اگر خطابی شاہ صاحب کے زمانے میں زندہ ہوتے تو شاہ صاحب کے بہت سے مباحث کا شاید ایک لفظ نہ سمجھتے اور ان کو شاید یہ پتہ نہ چلتا کہ شاہ صاحب کیا کہہ رہے ہیں، جیسا کہ چیف جسٹس صاحب کی بات وہ بزرگ عالم نہیں سمجھ

پائے۔

اگر آپ کے پاس ریڈیو سیٹ تو ہو، لیکن ریڈیو اسٹیشن سے جس فریکونسی پر پیغام نشر ہو رہا ہے، آپ کا ریڈیو سیٹ اس فریکونسی پر کام نہ کرتا ہو تو آپ کے لیے وہ ریڈیو سیٹ بھی بے کار ہے۔ جب تک آپ اپنے ریڈیو سیٹ کو مطلوبہ فریکونسی پر نہیں لائیں گے، آپ ریڈیو اسٹیشن کی نشریات سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح یہ ضروری ہے کہ علمائے کرام کے پاس جو علم دین کا پاور ہاؤس ہے، اور ایک عام آدمی جو دین کی راہنمائی چاہتا ہے اور جس کو آپ راہنمائی دینا چاہتے ہیں، ان دونوں کی فریکونسی ایک ہو۔ اس فریکونسی کو موافق بنانے کے لیے ایک تو تخصص ضروری ہے جس پر میں ابھی مزید بات کروں گا، اور دوسرا دورِ جدید کا محاورہ درکار ہے۔ یہ خلطِ مبحث اور غلط فہمی ہے کہ علما کو انجینئر یا ڈاکٹر بنانا مقصود ہے۔ نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ وہ علوم وفنون جنھوں نے آج کل کی تہذیب کی تشکیل کر رکھی ہے اور جن کی بنیاد پر آج ساری دنیا کا نظام چل رہا ہے، حتیٰ کہ پاکستان، سعودی عرب اور ایران میں بھی چل رہا ہے، ان علوم وفنون سے علما بھی مناسب طور پر واقف اور مانوس ہوں۔

مسلمانوں نے اپنے دور میں علوم وفنون کی ایک الگ تقسیم کی تھی۔ کچھ علوم مقاصد یا علوم حقیقی ہیں اور کچھ علوم وسائل یا علوم آلیہ ہیں۔ اسی طرح کچھ علوم ہیں، کچھ صنائع ہیں اور کچھ فنون ہیں۔ یہ مسلمانوں کی اختیار کردہ تقسیم تھی۔ آج عملاً یہ تقسیم موجود نہیں ہے۔ آج تعلیم کا نظام عملاً اس تقسیم پر نہیں چل رہا۔ آج دنیا میں ایک نئے انداز سے علوم کی مختلف تقسیمیں کی جاتی ہیں۔ ان میں ایک اہم تقسیم علوم عمرانی (Social sciences) اور علوم انسانی (Humanities) کی ہے۔ سوشل سائنسز میں وہ ان علوم وفنون کو شامل کرتے ہیں جو انسانی معاشرے کی تشکیل اور معاشرتی زندگی سے بحث کرتے ہیں۔ ان میں تاریخ، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات اور کسی حد تک قانون شامل ہیں۔ یہ عمرانی علوم ہیں جن سے اجتماعی رویوں کی تشکیل ہو رہی ہے۔ انسانیات یعنی Humanities وہ علوم ہیں جو انسان کے مطالعے پر مبنی ہیں، یعنی فرد کے خیالات، فرد کے افکار، فرد کی نفسیات، فرد کے احساسات وجذبات، یہ سب کے سب ہیومینیٹیز کہلاتے ہیں۔ اس میں فلسفہ، نفسیات اور بشریات شامل ہیں۔

علوم وافکار کے میدانوں میں یہ میدان ہیں جن سے دور جدید میں تہذیب کی تشکیل ہوئی ہے۔ آج ہمارا ایک پڑھا لکھا انسان، چاہے وہ پاکستان کا ہو یا سعودی عرب کا یا مصر کا یا کسی بھی اسلامی ملک کا، جب وہ بات کرتا ہے تو اسلامی علوم اور تصورات کے تناظر (perspective) میں بات نہیں کرتا۔ وہ اسلامی اصطلاحات یا فقہی سیاق وسباق یا فقہی محاورے میں بات نہیں کرتا، بلکہ وہ مغربی سوشل سائنسز کے محاورے میں بات کرتا ہے۔ عمرانی علوم اور انسانی علوم کے علاوہ مختلف قسم کے طبیعی علوم بھی ہیں جن کی حیثیت وسائل اور آلات کی ہے جن سے لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانا مقصود ہے۔ ان کا دینی علوم سے براہ راست کوئی تعلق یا تصادم نہیں۔ بالواسطہ طور پر اگرچہ ان وسائل کا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے اور اس غلط استعمال کے نتائج بھی منفی ہو سکتے ہیں، لیکن رویوں کی تشکیل میں ان علوم آلیہ کا براہ راست حصہ بہت کم ہے۔ رویوں اور نظریوں کی تشکیل میں اصل کردار عمرانی اور انسانی علوم ہی کا ہے۔ آج جس چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ علمائے کرام بقدر ضرورت سوشل سائنسز اور ہیومینیٹیز سے واقفیت رکھتے ہوں۔ اسی طرح کی واقفیت رکھتے ہوں جیسے آج سے ایک ہزار سال پہلے یعنی تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں یانونی عقلیات، فلسفہ اور منطق سے واقفیت کی ضرورت پیش آئی تھی۔

اگر آپ اس دور یعنی تیسری چوتھی صدی کے مباحث پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ جب یونانی منطق اور فلسفے کی کتابیں ترجمہ ہونا شروع ہوئیں تو مسلمانوں میں اسی طرح کے تین رویے پائے جاتے تھے جو آج مغربی تہذیب کے بارے میں نظر آتے ہیں۔ علمائے کرام، محدثین اور مفسرین کا ایک بہت بڑا طبقہ وہ تھا جو ان سب چیزوں کو فضول، بے کار بلکہ ناپاک اور گردن زدنی سمجھتے تھے، جو یونانی منطق اور فلسفے سے اعتنا رکھنے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج یا اس کی حدود پر سمجھتے تھے اور فلاسفہ بلکہ بہت سے متکلمین کو بھی مسلمانوں کا نمائندہ اور اسلامی فکر کا ترجمان سمجھتے تھے۔ یہ بحثیں تک دینی حلقوں میں موجود تھیں کہ منطق کی کتابوں سے استنجا جائز ہے یا نہیں۔ یہ جزئیات آپ کو فقہ کی کتابوں میں مل جائیں گی، یعنی یہاں تک ناپسندیدگی اور نفرت کی کیفیت تھی۔ یہ شعر آپ نے اکثر پڑھا ہوگا کہ

واعجبا لمنطق اليونان

كم فيه من افك ومن بهتان

مخبط لجيد الاذهان

ایک لمبی نظم ہے، پتہ نہیں کس بزرگ کی ہے۔ آغاز میں عقلیات اور منطق کے بارے میں یہ کیفیت تھی ۔ اس کے بعد یہ رویہ محدود ہوتا گیا، جیسا وہ ثمانر والا رویہ محدود ہوگیا۔ پھر یہ کیفیت آئی کہ خالص اسلامی علوم میں منطق وفلسفہ شامل ہوگیا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کی ''حجۃ اللہ البالغہ'' علم اسرار حدیث پر بہترین کتاب ہے۔ میری محدود دانست اور ناچیز رائے میں اس سے بہتر اسلامی علوم کی نمائندہ کتاب برصغیر میں نہیں لکھی گئی اور میں شاہ صاحب کو برصغیر میں مسلمانوں کا امیر المومنین فی الحدیث سمجھتا ہوں۔ لیکن جب تک آپ منطق اور فلسفے کی اصطلاحات سے واقف نہ ہوں، انھی یونانیوں کی منطق جو بت پرست اور مشرک تھے، بدکار تھے، اخلاقی اعتبار سے بھی کچھ اونچے لوگ نہ تھے، تو آپ علم کلام اور اصول فقہ کی بہت سی کتابوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ حتیٰ کہ یونانی بت پرستوں کی کتابوں کو سمجھے اور ان کے افکار کو جانے بغیر آپ علم اسرار حدیث پر اسلامی لٹریچر کی بہترین کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' کو نہیں سمجھ سکتے۔ شاہ ولی اللہ تو خیر بعد کے ہیں۔ امام غزالی جیسے حجۃ الاسلام کی کتاب 'المستصفیٰ'، جو اصول فقہ جیسے خالص اسلامی علم پر ہے، اگر آپ منطق میں اچھی بصیرت نہیں رکھتے تو آپ اس کتاب کو نہیں سمجھ سکتے، بلکہ اس کتاب میں منطق اتنی گھسی ہوئی ہے کہ اگر 'المستصفیٰ' کو ہی سمجھ کر پڑھ لیں تو منطق بھی آپ کو بخوبی آ جائے گی۔ انھوں نے منطق کو اس کتاب میں اتنا سمو دیا ہے کہ منطق اور اصول فقہ کو الگ الگ کرنا بہت مشکل ہے۔ امام شاطبی کی کتاب 'الموافقات' آپ نے پڑھی ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ حکمت تشریع پر انسانی تاریخ کی بہترین کتاب ہے۔ انسانی تاریخ میں اصول قانون کے اس پہلو پر اس سے بہتر کتاب موجود نہیں ہے۔ لیکن جب تک آپ منطق وفلسفہ نہ جانتے ہوں، اس کتاب کے مضامین کو بھی نہیں سمجھ سکتے حالانکہ وہ ایسے علاقے، شمالی افریقہ اور اسپین وغیرہ میں لکھی گئی جہاں منطق وفلسفہ کا رواج ایران اور دیگر مشرقی ممالک کے مقابلے میں نسبتاً کم تھا۔ لیکن اس کے باوجود ساری کتاب کی اٹھان، اس کا استدلال، اس کی ترتیب،

س کا اسلوب اس دور کے عقلیات کے معیارات کے مطابق خالص عقلی ہے۔

یہ ایک ایسی تہذیب یا ایک ایسے علاقے کی نمائندہ تہذیب کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ تھا جس سے مسلمانوں کو کوئی سیاسی، عسکری یا تہذیبی خطرہ درپیش نہیں تھا، نہ سیاسی طور پر ان کی مسلمانوں کے ساتھ کوئی کشمکش تھی، نہ عسکری طور پر وہ مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچا سکتے تھے، نہ وہ اس پوزیشن میں تھے کہ اگر مسلمان ان کے نقطۂ نظر کا مطالعہ نہ کریں تو وہ اسے زبردستی دنیاے اسلام پر مسلط کر دیں۔ مسلمانوں نے تو خود ہی اپنے علمی ذوق کی وجہ سے ان کے علوم وفنون کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب اگر یونانیوں کے علوم وفنون کو جو نہ مسلمانوں پر حاکم تھے، نہ بالادست تھے، نہ ان کے پاس اقتدار تھا، نہ وہ مسلمانوں کے لیے خطرہ تھے، مسلمانوں نے محض علمی دلچسپی کی خاطر انھیں اختیار کیا اور ان سے استفادہ کیا تو وہ علوم وافکار جو ایک بالادست طاقت نے آپ پر مسلط کر دیے ہیں اور جن کے تصورات اور اسلوب استدلال کے مضر اثرات مسلمانوں کے گھروں اور دماغوں بلکہ اب دلوں میں داخل ہو رہے ہیں، انھیں سیکھنا اور ان سے واقفیت پیدا کرنا کیونکر مسلمانوں کی ذمہ داری نہیں ہے؟ آج اس کی ضرورت اس سے کئی ہزار گنا بلکہ کئی لاکھ گنا زیادہ ہے جتنی ضرورت یونانی علوم وفنون کے مطالعے کی تھی۔

یہ کہنا درست ہے کہ یونانی منطق اور فلسفے سے اشتغال رکھنے والے بہت سے لوگوں نے ایسے خیالات کا اظہار بھی کیا جو اسلام کی ترجمانی نہیں کرتے تھے۔ آپ فارابی کی کوئی کتاب پڑھیں، مثلاً اس کی کتاب ہے 'آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ' جس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلم سیاسی فکر کی پہلی کتاب ہے۔ اس میں بہت سے خیالات وافکار ایسے ہیں جو اسلامی تعلیم وعقائد سے کلی طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں، لیکن ایک اعتبار سے وہ بڑی اہم اور غیر معمولی کتاب ہے کہ اس نے یونانی علوم وفنون پڑھے اور ارسطو کی Politica یعنی 'سیاسیات' کا ترجمہ اس نے پڑھا، شاید افلاطون کی Republic کا بھی ترجمہ دیکھا ہو، لیکن بظاہر اس کے شواہد کم ہیں۔ سیاسیات پر وہ ارسطو کے نقطۂ نظر سے متاثر ہوا۔ اس کے بعد اس نے یہ کتاب لکھی اور کوشش کی کہ ارسطو کے ان خیالات کو اسلام سے ہم آہنگ کر کے بیان کرے۔ میرے خیال میں یہ Islamization of Knowledge کی پہلی کوشش تھی۔ یہ داعیہ

اس کے دل میں کیوں پیدا ہوا کہ وہ یونانیوں کے خیالات کو اسلام کے مطابق بنائے؟ اس کے دل میں کوئی اسلامی حمیت تھی اور کوئی اسلامی جذبہ تھا تو اس کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا۔ فارابی کی دینی حمیت اور اسلامی جذبے نے اس کو ارسطو کے خیالات کو جوں کا توں مسلمانوں میں پیش کرنے سے باز رکھا۔ اس حد تک اس کا اسلامی فہم اور دینی حمیت قابل ستائش ہے۔ اس دینی حمیت اور اسلامی جذبے کے مطابق اس نے ایک ایسی چیز کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر لوگوں کی رہنما بنی۔ اس رجحان کی دوسرے بہت سے مفکرین اسلام نے پیروی کی۔ یوں جلد ہی انھوں نے اسلام کی سیاسی فکر کو ایک نئی جہت دے دی اور اس کے دستوری تصورات کو اس طرح مرتب کر دیا کہ وہ نقل کے معیار کے ساتھ ساتھ عقل کے معیار پر بھی پورا اترے۔ اسی وجہ سے میں ابن سینا اور فارابی کا بڑا احترام کرتا ہوں اور میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے، اس کے باوجود کہ ان کے بہت سے خیالات اسلامی عقائد سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

آج بھی اسی بات کی ضرورت ہے کہ وہ حضرات جو یہ صلاحیت رکھتے ہوں یا ارادہ اور خواہش رکھتے ہوں کہ آگے چل کر امت مسلمہ کی فکری قیادت کی ذمہ داری انجام دیں، ان کو بہ قدر ضرورت مغربی علوم سے ناقدانہ اور قائدانہ واقفیت ہونی چاہیے۔ ان کے لیے یہ ضروری نہیں کہ مثلاً وہ اصول قانون کے اسی طرح ماہر ہوں جس طرح کوئی ماہر مغرب میں پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی فقیہ مغربی اصول قانون کا بھی ماہر ہونا چاہتا ہے تو ضرور ہو جائے، لیکن فقہی معاملات و مسائل کو دور جدید کے محاورے میں بیان کرنے کے لیے اتنی مہارت کی ضرورت نہیں۔ اس غرض کے لیے صرف یہ جاننا کافی ہے کہ اصول قانون، جیسا کہ مغرب میں ہے، اس کے اساسی مسلمات، اصول موضوعہ، اس کے بنیادی عقائد، اس کے بنیادی concerns and issues جس سے وہ بحث کرتا ہے، وہ کیا ہیں، کیوں پیدا ہوئے ہیں اور ان کے جو بنیادی تصورات اور اصول موضوعہ ہیں، وہ گرفت میں آ جائیں۔ اس کے بعد ان پر ایک تنقیدی نظر ڈال کر ایک صاحب علم فقیہ یہ دیکھے کہ اس میں کیا چیز علمی حیثیت سے کمزور ہے اور کیا چیز مضبوط عقلی بنیادوں پر قائم ہے، اور کیا چیز یا کیا اسلوب استدلال ہے جس سے کام لے کر اصول فقہ کے تصورات و مبادی کو بہتر انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام ایک ناقدانہ

انداز کا متقاضی ہے۔

آپ دیکھیں کہ اصول فقہ کو جس طرح امام شافعی نے مرتب فرمایا تھا اور جس طرح امام سرخسیؒ نے اس پر 'اصول السرخسی' لکھی تھی جو فقہ حنفی میں اصول فقہ کی پہلی جامع کتاب ہے، اس انداز کی کتابیں بعد میں شاذ و نادر ہی لکھی گئیں۔ امام رازی اور امام غزالی کی کتابیں اس انداز کی نہیں ہیں۔ ان میں منطق اور فلسفہ بہت بھرپور انداز میں شامل ہو گیا ہے۔ ان حضرات کے ہاں اصول فقہ کے مباحث میں فلسفہ، کلام، منطق، عقلیات، لسانیات اور لغویات سب شامل ہیں۔ امام غزالی نے اصول فقہ کے ہر مسئلے کو منطق کے دلائل سے اس طرح ثابت کر کے دکھایا کہ یونانی فلسفہ و منطق کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر امام غزالی کے استدلال سے اختلاف نہیں کر سکتا۔ اس طرح انھوں نے اصول فقہ کو یونانی منطق کے ماہرین کے فہم کے قریب کر کے ان کے لیے قابل قبول بنا دیا۔ منطق یوں سے متاثر لوگ اصول فقہ سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اصول فقہ کے بارے میں یہ تسلیم کر لیا کہ یہ فن عقل و نقل دونوں کی میزان پر پورا اترتا ہے۔ یہی کام آج ہمیں کرنا پڑے گا۔ جب تک آپ غزالی اور رازی کی اس سنت کو زندہ نہیں کریں گے، بات آگے نہیں بڑھے گی۔

آج قانون دان ماہرین کا جو قابل احترام طبقہ ہمارا اور آپ کا نظام چلا رہا ہے، یہ اصول فقہ اور فقہ کی گہرائیوں اور نزاکتوں سے واقف نہیں ہے۔ یہ انگریزی قانون اور اصول قانون سے واقف ہے۔ اینگلو سیکسن لا، اس کے تصورات و استدلالات اور عقائد، سب ان حضرات کے رگ وپے اور گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اب یا تو آپ انھیں مجبور کریں کہ وہ اپنا سب کام چھوڑ کر فقہ اور اصول فقہ پڑھیں اور ضروری مہارت فراہم کریں تو یہ عملاً ممکن نہیں ہوگا۔ اگر آپ سے کوئی کہے کہ آپ اپنی ملازمت، تدریس، نوکری یا حالیہ مشاغل و مصروفیات کو چھوڑ کر پانچ سال یا دس سال انگریزی قانون یا اصول قانون پڑھنے پر لگائیں تو آپ اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ آپ کے پاس وقت نہیں ہے، آپ کے وسائل اس کی اجازت نہیں دیتے۔ آپ کے مشاغل اس کے متحمل نہیں ہوں گے۔ اسی طرح ان لوگوں کے مشاغل بھی اس کے متحمل نہیں ہوتے کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر قدیم محاورے میں لکھے ہوئے اسلامی علوم و فنون میں مہارت حاصل کریں۔ اس مہارت کو حاصل

کرنے کے لیے ایک وکیل کو اپنی وکالت چھوڑنا پڑے گی۔ ایک وکیل اپنی وکالت کیوں چھوڑے؟ اگر چھوڑ دے تو کھائے کہاں سے اور وہ کیوں پانچ سال اصول فقہ یا فقہ پڑھنے پر لگائے؟ پانچ سال میں بھی اتنی واقفیت پیدا نہیں ہوگی جتنی ہونی چاہیے۔ اس لیے مطالبے کرنے سے، جلوس نکالنے سے، بینر لگانے سے کوئی جج یا وکیل خود بخود فقہ کا ماہر نہیں ہو جائے گا۔ وہ فقہ کا ماہر تب بنے گا جب وہ اسلامی علوم اور فقہ کو براہ راست بنیادی مآخذ سے پڑھے گا، اور وہ تب پڑھے گا جب آپ اسے پڑھانا چاہیں گے، اور جب پڑھانا چاہیں گے تو اس کے لیے اس کے ذہنی پس منظر اور اس کے مزاج کے مطابق آپ کو تیاری کرنی پڑے گی۔ اس مقصد کے لیے طویل عمل درکار ہے۔ اس عمل میں شارٹ کٹ کوئی نہیں ہے۔ یہ نہ ممکن ہے اور نہ ہوا ہے اور نہ آئندہ ممکن ہوگا کہ آج کوئی اسلامی تحریک یا دینی جماعت دھرنا دے دے اور کل اس کے نتیجے میں جتنے جج صاحبان اور وکلا ہیں، جن کی تعداد بالترتیب پانچ ہزار اور ستر اسی ہزار کے قریب ہے، سب کے سب فقہا ہو جائیں۔ دھرنوں اور مطالبوں سے کوئی غیر فقیہ، فقیہ نہیں بن سکتا۔ محض فتوے جاری کرنے سے کوئی معاشرہ اسلامی نہیں ہو سکتا۔ موجودہ صورت سو سال بھی جاری رہی، جب بھی صورت حال یہی رہے گی جو آج ہے۔ اس کے لیے بہت طویل اور مسلسل کام کرنا پڑے گا۔ یہ صورت حال جو آج ہمیں درپیش ہے، یہ دو ایک سالوں میں نہیں، دو سو سال میں پیدا ہوئی ہے۔ یہ دو صدیوں کی کمزوری اور بے عملی کا نتیجہ ہے۔ دو سو سال کے ان ثمرات بد کو دور کرنے کے لیے کم از کم دو سو نہیں تو پچاس سال تو کام کرنا پڑے گا۔ پچاس سال کم از کم تبدیلی کے لیے درکار ہیں، اس وقت سے جب تبدیلی کے لیے کام شروع ہوگا۔ اگر پچاس سال پہلے شروع ہو چکا ہوتا تو آج تبدیلی آ چکی ہوتی۔ چنانچہ نہ صرف اصول فقہ کو بلکہ دوسرے متعدد اسلامی علوم کو اس انداز سے مرتب کرنا پڑے گا کہ وہ ایک زندہ اور موثر فکری قوت بن سکیں۔ دور جدید کا انسان جو قانون تو جانتا ہے اور مغربی اصول قانون سے مانوس ہے، وہ فقہی تصورات کو سمجھ سکے اور ان تصورات کو اپنے فہم کے قریب لا سکے۔ مسلمان علما اور فقہا کو عمرانی اور انسانی علوم میں اتنی واقفیت لازماً پیدا کرنی ہوگی کہ ان کے اسلوب استدلال کے ذریعے سے اسلامی عقائد اور اسلامی تعلیم کو پیش کر سکیں، جس طرح امام غزالی نے منطق سے کام لے کر اصول فقہ کے

اصولوں کو پیش کیا تھا۔اس لیے ضروری ہے کہ ایسے لوگ معاشرے میں موجود ہوں۔

اس تبدیلی کو یقینی بنانے کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ان دوصورتوں یا شکلوں کے علاوہ تیسری کوئی شکل قابل عمل معلوم نہیں ہوتی۔ایک شکل تو یہ ہے کہ جو لوگ اصول قانون کے ماہر ہوں، انھیں اصول فقہ کا ماہر بھی بنا دیا جائے۔دوسری شکل یہ ہے کہ جو اصول فقہ کا ماہر ہو، اسے بہ قدر ضرورت اصول قانون کا ماہر بنا دیا جائے۔دوسری صورت زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے۔میں نے یہ ایک مثال صرف اصول قانون کی دی ہے۔یہ مثال علم سیاسیات،سوشیالوجی اور دیگر علوم پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ان علوم وفنون سے ایک گہری ناقدانہ واقفیت درکار ہے،لیکن اس ناقدانہ واقفیت کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی علوم میں گہرا اور ماہرانہ تخصص حاصل ہو چکا ہو، ورنہ مغربی علوم وفنون کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا آسان نہ ہوگا کہ وہاں کیا چیز درست ہے اور کیا غلط ہے،ان کے عقائد اور اصول موضوعہ میں سے کون سا اصول اور کون سا عقیدہ ٹھیک ہے، اسلام کے مطابق ہے اور کون سا عقیدہ غلط اور اسلام کے خلاف ہے۔کمزور اسلامی بنیاد رکھنے والوں کو اس کا پتہ نہیں چلے گا۔ایک کچا علم رکھنے والا ان کی گمراہیوں سے بھی متاثر ہو جائے گا جیسا کہ آج تک ہوتا رہا ہے۔علماے کرام جو متامل ہیں، شاید اسی وجہ سے ہیں کہ ایسی مثالیں سامنے آئیں کہ ادھ کچرا علم رکھنے والوں نے مغربی علوم وفنون اپنائے اور اسلام کی وہ وہ تعبیریں کیں جو اسلام کی روایت کے مطابق نہیں تھیں۔ان تعبیرات میں انھوں نے اسلام کی علمی روایت کے تسلسل کو محفوظ نہیں رکھا تھا۔اس لیے جب تک خود دینی علم اور اسلامی روایت میں پختگی نہ ہو، اس وقت تک ناقدانہ تصور نہیں پیدا ہو سکتا۔دینی تخصصات میں گہرائی اور پختگی پیدا کرنے کے لیے بھی ابھی تک ہمارے ہاں کوئی انتظام نہیں ہے۔

آج جو دینی تعلیم ہم دے رہے ہیں، اس کے مقاصد کیا ہیں؟ وہ ہمارے سامنے ہونے چاہییں۔میں ذرا بے تکلف بات کروں گا۔آپ برا نہ مانیے گا۔میرا تعلق آپ ہی کے طبقے سے ہے۔اس لیے دو ایک تلخ باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی

اس لیے گفتگو میں تھوڑی سی تلخ نوائی کا عنصر آنے کی اجازت دیجیے۔ جب دارالعلوم دیوبند قائم ہوا، اس وقت مسلمانوں کو مسئلہ کیا درپیش تھا؟ اس وقت مسلمانوں کو مسئلہ یہ درپیش تھا کہ انگریز نے پورے برصغیر پر قبضہ کرلیا تھا، مسلمانوں کے مذہبی اور دینی ادارے سب ختم کر دیے گئے تھے، اوقاف ایک ایک کر کے ضبط کر لیے گئے تھے، تعلیمی ادارے سب بند کر دیے گئے تھے۔ علماے کرام جو سارے نظام کو چلا رہے تھے، ان کو ملازمتوں سے الگ کر دیا گیا۔ عدالتوں کا نظام کسی نہ کسی حد تک شریعت کے مطابق تھا، اس کو ختم کر کے انگریزی عدالتیں قائم کر دی گئیں، انگریزی قانون شریعت کی جگہ نافذ کر دیا گیا۔ فارسی جو نظام حکومت کی زبان تھی، اس کو ختم کر کے انگریزی جاری کر دی گئی۔ جہاں جہاں مسلمان کارندے مقرر تھے، ان کی جگہ ہندو کارندوں کو مقرر کر دیا گیا۔ بڑے بڑے تمام مناصب پر انگریز آ گئے اور مسلمان منصب قیادت سے معزول ہو کر معاشرے کا ناپسندیدہ عنصر بنا دیے گئے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی عزت کا ذریعہ تھیں، وہ مسلمانوں کی ذلت کا ذریعہ بنا دی گئیں۔ مسلمانوں کا لباس، مسلمانوں کے عہدے، مسلمانوں کے مناصب، مسلمانوں کے القاب، ہر چیز جو اونچے درجے کی تھی اور قابل عزت سمجھی جاتی تھی، اس کو انگریز نے ذلت کی علامت بنا دیا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں مخلص اہل علم ودین نے یہ محسوس کیا کہ وہ نصاب یا وہ نظام جو آسانی سے اس وقت اپنایا جا سکتا ہے، وہ ماضی کا درس نظامی ہے، لہٰذا اس کو اپنا لیا جائے۔

اس وقت درس نظامی برصغیر کے بیشتر علاقوں میں رائج تھا۔ درس نظامی کیا ہے؟ یہ بھی میں ذرا وضاحت اور صراحت سے عرض کر دوں۔ درس نظامی نہ کوئی آسمانی چیز ہے، نہ اس کو اختیار کرنا شریعت کا کوئی حکم ہے، نہ خیر القرون میں، اسلام کے سنہری دور میں اس نام کی کوئی چیز پائی جاتی تھی۔ اس درس کا تذکرہ نہ قرآن میں آیا ہے نہ حدیث میں، نہ اس کا اسلام کے مستقبل یا ماضی سے کوئی تعلق ہے۔ یہ چند ماہرین تعلیم اور علما کے اپنے تجربے پر مبنی ایک نصاب ہے جو اپنے زمانے میں ایک اچھی مفید چیز تھی۔ آج بھی اس میں ایک حد تک افادیت پائی جاتی ہے۔ اس کی افادیت سے انکار نہیں۔

انگریز کی حکومت جب برصغیر میں قائم ہوئی تو اس وقت ہندوستان میں چار پانچ قسم کے درس

رائج تھے۔ ایک درس مشرقی ہندوستان، جون پور وغیرہ میں رائج تھا جو شیراز ہند کہلاتا تھا۔ شیراز ہند اس لیے کہلاتا تھا کہ جون پور اور مشرقی علاقوں میں عقلیات اور فلسفے پر زور زیادہ تھا اور وہاں کے فارغ التحصیل حضرات منطق اور فلسفے کے ماہر ہوتے تھے۔ مسلمانوں میں عقلیات پر جتنی کتابیں برصغیر میں لکھی گئیں، وہ اکثر و بیشتر جون پوریوں نے لکھیں۔ کئی اور اور اچھی کتابیں خیر آبادی سکول کی طرف سے لکھی گئیں۔ فضل حق خیر آبادی اور فضل امام خیر آبادی اس اسکول کے معروف نام ہیں۔ جون پور اور اس کے اطراف کے علما کی لکھی ہوئی کتابیں 'ہدیہ سعیدیہ' اور 'شمس بازغہ' وغیرہ مشہور ہیں جن سے آپ واقف ہیں۔

ایک دوسرا درس تھا جو افغانستان کے اثرات سے آیا تھا اور موجودہ صوبہ سرحد، افغانستان اور موجودہ پنجاب وغیرہ میں رائج تھا۔ اس میں صرف ونحو اور نحوی بحثوں پر زور دیا جاتا تھا۔ کافیہ اور اس کی شرحیں پڑھنے پر لوگ دس دس سال لگا دیا کرتے تھے۔ کافیہ میں نحو کے قواعد کے بارے میں کیا لکھا ہے، اس سے پڑھنے پڑھانے والوں کو زیادہ بحث نہیں ہوتی تھی، لیکن مفرد امرفوع ہے یا منصوب یا مجرور، اس پر تین تین دن بحث ہوتی رہتی تھی۔ پھر کافیہ کی شرح، شرح جامی پڑھائی جاتی تھی۔ پھر شرح جامی کی شرح، پھر اس کے حواشی سوال باسولی، سوال کابلی، تحریر سنبٹ وغیرہ کا مرحلہ آتا تھا۔ یوں دس دس سال اس میں لگ جاتے تھے۔ بہرحال، یہ تخصص کا ایک میدان تھا۔ اساتذہ اور طلبہ کی ایک تعداد کو اس سے دلچسپی تھی۔ اس سرگرمی کی علمی افادیت کیا تھی، اس پر ہر ایک کو رائے دینے کا حق حاصل ہے۔ جو حضرات اس سرگرمی کو پسند کرتے تھے، وہ ان کی رائے تھی جس پر ہمیں اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں۔

تیسرا نصاب وہ تھا جو مغربی ہندوستان اور سندھ میں رائج تھا جس میں علوم حدیث پر نسبتاً زیادہ زور تھا۔ کنز العمال کے مصنف شیخ علی المتقی، عبدالوہاب المتقی، ہمارے سندھ کے علمائے کرام شیخ محمد حیات سندھی، شیخ محمد عابد سندھی اور شیخ ابوالحسن سندھی وغیرہ حضرات اس نظام سے وابستہ تھے۔ ان حضرات کا اعتنا علوم حدیث سے زیادہ تھا۔

یہ تین بڑے بڑے اور اہم نصاب ہندوستان میں رائج تھے۔ ان کے علاوہ چند اور بھی

نصابات تھوڑی تھوڑی تبدیلیوں کے ساتھ ان سے مختلف بھی رائج تھے، لیکن بڑے انداز یہی تین تھے۔ اس کی مزید تفصیل اگر آپ دیکھنا چاہیں تو مولانا مناظر احسن گیلانی کی ضخیم کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' میں دیکھ لیجیے۔ جب انگریز ہندوستان میں آئے، ایسٹ انڈیا کمپنی آئی تو اس نے سب سے پہلے بعض ساحلی علاقوں بمبئی، مدراس اور کلکتہ وغیرہ پر قبضہ کیا۔ کلکتہ پر قبضہ کرنے کے بعد انھوں نے تجارتی کوٹھیاں بنائیں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی پولیس اور فوج رکھنا شروع کی جس کی ایک لمبی اور عبرت ناک داستان ہے۔ آج کل اس کے parallels اور اس کی مشابہتیں ہمارے ملک میں بہت واضح اور نمایاں طور پر نظر آ رہی ہیں۔ انھوں نے اچھے اور معیاری تعلیمی ادارے بنائے اور مسلمانوں کے پہلے سے قائم شدہ اداروں میں کام کرنے والوں کو بہتر تنخواہوں اور مراعات پر اپنے ہاں جگہ دی۔ یوں اہل علم کی بہت بڑی تعداد کے مفادات اپنے نظام سے وابستہ کر لیے۔ انھوں نے بہتر تنظیم سے کام لے کر یہاں کی تجارت اور صنعت پر منفی اثر ڈالا۔ پھر چوری اور ڈاکے کے بعض واقعات کو بنیاد بنا کر اپنی پولیس الگ قائم کر لی۔ پھر ایک مرحلے پر اپنی عدالتیں الگ بنائیں۔ پھر انھوں نے کہا کہ آپ کے ملک میں بدامنی ہے، آپ کے ہاں راستوں میں ڈکیتیاں بہت ہوتی ہے، اس لیے ہم اپنی جان و مال اور راستوں کو محفوظ بنانے کے لیے اپنی فوج الگ رکھیں گے۔ وقتی معاشی مفادات اور مالی فوائد کی توقع بلکہ لالچ میں ان کو فوج رکھنے کی اجازت بھی دے دی گئی اور یوں انھوں نے عام راستوں پر سپاہی رکھنے شروع کر دیے۔ ہوتے ہوتے انھوں نے پورے بنگال پر قبضہ کر لیا اور بالآخر نواب سراج الدولہ کے خلاف فوج کشی کر کے اس کو بے دخل کر دیا گیا۔

بنگال پر قبضہ کرنے کے بعد جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے کانوں پر کوئی جوں نہیں رینگی تو انھوں نے مزید پیش قدمی کی اور چند سال کے اندر اندر انھوں نے بہار اور اڑیسہ پر بھی قبضہ کر لیا اور الہ آباد پہنچ گئے جو مشرقی یوپی کا سب سے بڑا شہر تھا۔ جب تین صوبوں بنگال، بہار اور اڑیسہ پر ان کا قبضہ ہو چکا تو ہندوستان میں مسلمانوں کو بھی ہوش آنا شروع ہوا اور یہاں کا حکمران، غالباً شاہ عالم ثانی، نیم دلی سے ان کے مقابلے کے لیے اپنی فوج لے کر نکلا۔ اس کو ناکامی ہوئی۔ اس

ناکامی کے نتیجے میں الٰہ آباد میں ایک معاہدہ ہوا جو معاہدۂ دیوانی کہلاتا ہے۔ یہ معاہدہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے انتقال کے کوئی ایک آدھ سال بعد ہوا۔ اس معاہدے میں شاہ عالم ثانی نے قابض ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کو ان تینوں صوبوں کا انتظام سپرد کر دیا یعنی اس کو قانونی طور پر ایک جائز قبضہ تسلیم کر لیا اور کہا کہ میری طرف سے آپ ان تینوں صوبوں کا نظام چلائیں گے، لیکن اس کی یہ اور یہ شرائط ہوں گی۔ (انگریز بلکہ اہل مغرب ہمیشہ شروع میں وہ سب شرائط مان لیتے ہیں جو ان کو سوٹ کرتی ہیں۔ پیروی اور پابندی وہ کتنی کرتے ہیں، یہ ہم سب کے سامنے ہے)۔

ان شرائط میں ایک بات یہ تھی کہ مسلمانوں کے سارے معاملات شریعت حقہ محمدیہ کے مطابق ہوں گے۔ یہ معاملات مسلمان قاضی اور مفتی نبٹائیں گے اور وہی یہ طے کریں گے کہ شریعت کیا ہے اور اس کو کیسے نافذ کیا جائے۔ یہ ان شرائط میں ایک اہم اور بنیادی شرط تھی۔ جب انگریزوں نے یہ شرائط مان لیں تو اب ان پر عمل درآمد کا مرحلہ آیا۔ انگریزوں میں یہ خوبی ضرور ہے، ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ ہر کام بڑے سلیقے اور methodical طریقے سے کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ہر کام کا ایک نظام اور ایک سسٹم ہوتا ہے۔ پہلے قانون بنتا ہے، اس کے مطابق نظام چلتا ہے۔ چنانچہ ان شرائط پر عمل کرنے کی غرض سے انگریزوں نے یہ معلوم کیا کہ مسلمانوں میں کسی کو جج مقرر کرنے کے لیے کیا کیا امور پیش نظر رکھے جاتے ہیں اور اس کا فیصلہ کیسے کیا جائے کہ کوئی شخص عالم یا فقیہ ہے؟ انھوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں تین چار قسم کے نصاب رائج ہیں اور ہر نصاب کے فارغ التحصیل کو عالم کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کوئی ایسا نصاب ہونا چاہیے جو ان تینوں چاروں رائج الوقت نصابا کے خصائص کا جامع ہو۔ اب ان تینوں خصائص کا جامع نظام وہ تھا جو فرنگی محل میں رائج تھا۔

فرنگی محل ایک بہت بڑے مکان کا نام تھا جو جہانگیر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا تھا۔ جہانگیر اس زمانے میں بیمار ہوا۔ کئی مقامی طبیبوں، ویدوں اور دوسرے لوگوں نے اس کا علاج کیا لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ ایک انگریز ڈاکٹر نے کامیاب علاج کر کے اس کی شکایت کو دور کر دیا۔ اس پر جہانگیر نے خوش ہو کر پوچھا کہ کیا چاہیے؟ انگریز ہمیشہ اپنی قوم کا وفادار ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ میری قوم کے کچھ لوگ یہاں لکھنو میں تجارت کے لیے آئے ہیں، ان کو بعض اوقات مشکل پیش

آتی ہے، اس لیے آپ ان کو تجارت کی اجازت دے دیں اور ان کو مناسب مراعات عطا کر دیں۔ اس پر جہانگیر نے فرمان جاری کر دیا اور لکھنو میں ایک بہت بڑا محل یا کوٹھی ان کو دے دی۔ انگریزوں کی وجہ سے وہ کوٹھی 'فرنگی محل' کہلاتی تھی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں کسی حوالے سے اس کو خبر ملی کہ انگریزوں نے اس فرمان میں دی گئی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے جو جہانگیر نے طے کی تھیں اور بعض ایسے کام کیے ہیں جو حکومت کی پالیسیوں کے خلاف ہیں۔ اس پر اورنگ زیب نے وہ کوٹھی ضبط کر لی اور انگریز ساہوکاروں کو نکال کر وہ کوٹھی ملا نظام الدین سہالوی کو دے دی۔

ملا نظام الدین سہالوی اپنے وقت کے جید علما میں سے تھے۔ انھوں نے فتاویٰ عالم گیری کی تدوین کے کام کی نگرانی بھی کی تھی اور فقہ میں گہرا ادراک رکھتے تھے۔ اورنگ زیب کے مشورے پر انھوں نے اس عمارت میں ایک دینی درس گاہ قائم کی جہاں فقہ کی تدریس پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ یہ درس گاہ مدرسہ فرنگی محل کے نام سے مشہور ہوئی، چنانچہ اس درس گاہ کے فارغ التحصیل علما فرنگی محلی کہلانے لگے۔ مولانا جمال میاں فرنگی محلی، عبدالوہاب فرنگی محلی، عبدالباری فرنگی محلی، یہ نام آپ نے سنے ہوں گے۔ یہ سب حضرات فرنگی محل کی اسی درس گاہ کے فارغ التحصیل تھے۔ فرنگی محل میں ملا نظام الدین سہالوی کا مرتب کردہ جو نصاب تعلیم تھا، اس میں انھوں نے منطق، فلسفہ، نحو اور حدیث کے ساتھ ساتھ اصول فقہ اور فقہ کی بنیادی کتابیں بھی خصوصیت سے شامل کر دیں، اس لیے کہ وہ خود فقہ کے متخصص تھے، مفتی اور محتسب رہے تھے اور فتاویٰ عالم گیری کی ترتیب و تدوین میں بھی شریک رہے تھے۔

جب انگریزوں کو پتہ چلا کہ فرنگی محل کا جو نصاب تعلیم ہے، اس میں فقہ کی اچھی بنیاد موجود ہے اور وہاں کے فارغ التحصیل حضرات فقہ کے ماہر ہوتے ہیں تو انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسی درس نظامی کے فارغ التحصیل حضرات کو قاضی و مفتی مقرر کیا جائے گا۔ چنانچہ بڑے پیمانے پر اس درس گاہ کے فضلا کی مانگ ہونے لگی۔ چونکہ یہ حضرات بڑی بڑی تنخواہوں پر قاضی و مفتی مقرر ہونے لگے، اس لیے درس نظامی کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ درس نظامی کے فارغ التحصیل حضرات کو ایک اچھا دنیاوی موقع ملا، ان کی تنخواہیں اچھی تھیں، ان کے وسائل اچھے تھے، معیارات اچھے تھے، اس لیے بڑے پیمانے پر مدارس

نے اسی نصاب کو اپنانا شروع کر دیا۔ ہوتے ہوتے اس نصاب کے فارغ التحصیل حضرات بڑی تعداد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمتوں میں آ گئے۔ آپ ۱۸۵۷ء سے پہلے کی تاریخ میں بیسیوں علماے کرام کے نام سنیں گے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کے طور پر کام کرتے تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ وہ اسی درس نظامی کے پڑھے ہوئے تھے اور انگریزوں کے نظام میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ 'صدر الصدور' تھے یعنی دہلی اور اس کے قرب وجوار کے مذہبی امور کے جتنے قاضی تھے، ان کی سربراہی ان کے پاس تھی۔ آپ انھیں اس علاقے کا چیف جسٹس کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

یہ نصاب تھا جس سے لوگ مانوس تھے اور گزشتہ کم وبیش سو برس یا ۸۰ برس سے لوگ اس نصاب کو پڑھتے پڑھاتے چلے آ رہے تھے۔ جب مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ اور ان کے رفقا حاجی عابد حسین وغیرہ نے دار العلوم کے قیام کا فیصلہ کیا تو انھوں نے بھی اسی نصاب کو اپنا لیا۔ اس کی ایک بڑی اور اہم وجہ یہ تھی کہ دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ وہ بھی اسی نصاب کے پڑھے ہوئے تھے۔ ان کے استاذ، ان کے ساتھی، دوسرے علماے کرام، مثلاً مولانا محمد یعقوب نانوتوی جو دار العلوم کے پہلے صدر مدرس بھی منتخب ہوئے، ان کے والد مولانا مملوک العلی، سب اسی نظام کے پڑھے ہوئے تھے۔ مولانا مملوک علی ۱۸۵۷ء کے واقعہ سے قبل دہلی کالج میں، جسے ایسٹ انڈیا کمپنی چلاتی تھی، عربی کے پروفیسر تھے۔ شاید ان حضرات کے پاس اس نصاب کو اپنانے کے علاوہ ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ دینی تعلیم بہ قدر ضرورت اس میں شامل تھی۔ اس میں عربی زبان بھی تھی، فقہ بھی تھی، اصول فقہ بھی تھی، حدیث بھی تھی، تفسیر کی ایک دو کتابیں بھی انھوں نے شامل کر دیں۔ حدیث کی کم تھی، اس لیے حدیث کی مزید کتابیں شامل کر دیں۔ اس سے پہلے تک حدیث کی صرف ایک کتاب مشکوٰۃ اور ایک آدھ اور کتاب ہوتی تھی۔ ان حضرات نے مزید کتابیں شامل کر دیں اور ایک نیا نصاب انھوں نے بنا دیا جس نے ہندوستان کے دینی تقاضوں کو وقتی طور پر پورا کیا۔

کیا پاکستان بننے کے بعد بھی دینی مدارس کے تقاضے یہی تھے؟ میرے خیال میں ایک آزاد اسلامی مملکت میں دینی تعلیم کے تقاضے محض یہ نہیں تھے۔ پاکستان بننے کے بعد اب دینی مدارس اور

دینی تعلیم کے کم از کم تین قسم کے تقاضے اور مقاصد ہیں۔ان تینوں تقاضوں یا مقاصد کی ضروریات الگ الگ ہیں۔ایک تقاضا تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو مساجد ہیں، ان میں ہمیں تربیت یافتہ امام درکار ہیں۔یہ سب سے پہلا تقاضا ہے جو مسلمانوں کی دینی زندگی کا سب سے لازمی مطالبہ ہے جسے پورا ہونا چاہیے۔میرا خیال ہے کہ ایک امام مسجد کو درس نظامی جوں کا توں پڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔اگر وہ 'ہدیہ سعیدیہ' اور 'سوال کابلی' اور 'سوال باسولی' اور 'تحریر سنبٹ' وغیرہ نہیں پڑھے گا تو بھی وہ ایک اچھا امام ہوسکتا ہے۔اور اگر وہ یہ کتابیں پڑھ لے گا تو اس کے اچھا امام بننے میں ان کتابوں سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔اچھا امام بننے یا نہ بننے میں ان علوم وفنون کا سرے کوئی دخل نہیں ہے۔اس لیے ایک امام مسجد کو یہ کتابیں پڑھانا تحصیل حاصل ہے اور وقت کا بھی ضیاع ہے اور وسائل کا بھی۔ آپ نے ہزاروں ایسے لوگوں کو دیکھا ہوگا اور آگے چل کر مزید ہزاروں ایسے لوگوں کو دیکھیں گے جنھوں نے آٹھ دس سال لگا کر یہ ساری چیزیں یاد کیں، پھر پچاس سال امامت کی اور پچاس سالہ امامت کے طویل دور میں کسی نے ان سے 'ہدایۃ الحکمۃ' کا کوئی سوال نہیں پوچھا۔ان کو کبھی 'تحریر سنبٹ' کا کوئی مسئلہ وہاں بیان کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جو مسائل لوگ پوچھتے ہیں اور جو روزانہ دین کی راہنمائی میں درکار ہوتے ہیں، وہ عموماً امام صاحب کے علم میں نہیں ہوتے۔ جو مباحث روزانہ دینی راہنمائی کے لیے درکار ہوتے ہیں، ان سے امام صاحب سرے سے ناواقف ہوتے ہیں، وہ تو ان کو پڑھائے ہی نہیں جاتے۔لوگ پوچھتے ہیں کہ شیئرز مارکیٹ میں پیسہ لگانا جائز ہے یا نہیں۔اکثر ائمہ کرام ان سوالات کا جواب نہیں دے پاتے۔ائمہ کرام سے اکثر کو یہی پتہ نہیں ہوتا کہ شیئر کہتے کس کو ہیں۔ یہی حال بیشتر اہم مسائل کے بارے میں امام صاحب کا ہوتا ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ دینی تعلیم کا یہ نظام اچھا امام تیار نہیں کر سکتا۔اب ایک اچھے امام کی حقیقی ضروریات کیا ہیں، اس پر غور وفکر ہونا چاہیے۔میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایک کم از کم تعلیمی معیار کے بعد، جو میٹرک ہوسکتا ہے، آپ دینی مدارس میں طلبہ کو داخلہ دیں۔میٹرک کے بعد حفظ قرآن لازمی ہونا چاہیے۔میں ذاتی طور پر اس بات کا قائل ہوں کہ دینی مدارس میں حافظ کے علاوہ کسی کو داخلہ نہیں دینا چاہیے۔اس وقت جامعہ ازہر کے تحت جو ادارے کام کر رہے ہیں، ان میں طلبہ کی تعداد کم وبیش

پندرہ لاکھ ہے جو پاکستان کے دینی مدارس کے طلبہ کی تعداد سے زیادہ ہے۔ان کی آبادی ہم سے آدھی بلکہ اس سے بھی کم ہے،لیکن وہاں جامعہ ازہر اور اس کے اداروں میں حفظ قرآن لازمی ہے۔ گویا پندرہ لاکھ حافظ طلبہ اس وقت جامعہ ازہر کے زیرانتظام اداروں میں پڑھ رہے ہیں۔اگر وہ حفظ کی شرط پر عمل درآمد کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے؟

غرض حفظ قرآن اور میٹرک کے بعد تین چار سال کا ایک نظام اور نصاب ایسا ہو جس میں بقدر ضرورت عربی زبان پڑھائی جائے۔اتنی کہ طالب علم تفسیر اور حدیث کی کتابیں اور فقہ کی عام کتابیں پڑھ سکے۔عربی زبان کے علاوہ حدیث اور علوم حدیث پر کوئی ایک آدھ جامع کتاب مثلاً مشکوٰۃ کا انتخاب یا التاج الجامع للاصول، ترجمان السنۃ، معارف الحدیث یا کوئی اور اچھی کتاب پڑھادی جائے۔اسی طرح اردو کی کوئی تفسیر، مثلاً تفسیر عثمانی یا تفسیر ماجدی اور کوئی ایک عربی کی مختصر تفسیر پڑھائی جائے۔ایک دو فقہ کی کتابیں ہوں اور کوئی ایک آدھ کتاب جدید معاشیات اور سیاسیات پر۔اس طرح کا ایک تین سالہ یا چار سالہ نصاب ہو جس میں تقریر کی مشق بھی ہو اور تجوید بھی اس میں شامل ہو۔جو طالب علم یہ نصاب مکمل کر لے، وہ امام بننے کا اہل ہو اور اس کو پھر امام بننے کا موقع دینا چاہیے تاکہ وہ اپنا اور ادارے کا مزید وقت اور وسائل ضائع نہ کرے، اس لیے کہ اس کو اس سطح سے آگے کام نہیں کرنا۔

اب یہ ایک تقاضا ہے جس کے لیے آپ جب تک کوئی نظام نہیں بنائیں گے، وہی کچھ ہوتا رہے گا جو آج ہو رہا ہے۔آپ ایک اور تلخی کی بات کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔یہ ایک حقیقت ہے اور جب تک آپ حقائق کا سامنا نہیں کریں گے، مستقبل کی تشکیل نہیں کر سکتے۔آج ہمارا امام جب سوسائٹی میں جا کر اپنی ذمہ داریاں سنبھالتا ہے تو اکثر صورتوں میں وہ ذہنی، فکری اور تہذیبی طور پر اپنے کو وہاں اجنبی محسوس کرتا ہے۔وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میں نے جو کچھ پڑھا ہے، وہ سب اس معاشرے میں irrelevant ہے اور یہاں لوگ جو سوال کر رہے ہیں، اس کا میرے پاس جواب نہیں ہے۔اس صورت حال میں وہ اپنی پڑھی ہوئی ازکاررفتہ یا فروعی اور غیر اہم چیزوں کو relevant بنانے کے لیے وہاں وہ مسائل پیدا کرتا ہے جن پر وہ ذرا طلاقت لسانی اور روانی سے گفتگو کر سکے اور

اپنی علمیت کی دھاک بٹھا سکے۔اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو اس کے اپنے مسائل ہیں، وہ لوگوں کے بھی مسائل بن جائیں۔ جب وہ ان کے مسائل بن جائیں گے اور وہ پوچھیں گے تو میں ان کا جواب دوں گا۔وہ مسائل کیا ہوتے ہیں؟ وہ فرقہ وارانہ فروعی مباحث ہوتے ہیں۔اب عامۃ الناس اور سادہ لوح مخلص نمازیوں میں جن بے چاروں کو ان لایعنی اور فروعی مباحث کا کچھ پتہ نہیں ہوتا اور نہ کبھی ان کے ذہن میں یہ خیال آیا ہوتا ہے کہ حضور نور تھے یا بشر تھے،ان کے لیے امام یہ مسئلہ پیدا کر دیتا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم واجب التعمیل ہے، یہ کوئی نہیں بتاتا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت اور صراط مستقیم کیا تقاضا کرتی ہے،اس سے امام کو بحث نہیں ہوتی۔لوگوں کی زندگیاں کیسے تبدیل ہوں، لادینیت اور مغربیت کے منفی اثرات کو کیونکر روکا جائے، اس سے نہ نوریوں کو بحث ہوتی ہے نہ بشریوں کو۔اس کے برعکس ایک اس پر زور دینا شروع کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے اور دوسرا اس پر کہ آپ نور تھے۔ یہ نور کا ایک محدود مفہوم بیان کرتا ہے، وہ بشر کا ایک محدود مفہوم بیان کرتا ہے اور جب علم کی کمی کی وجہ سے لوگوں کا ایک گروہ ان امور کو دین کے سب سے اہم اور بنیادی مسائل مان کر امام صاحب کی قیادت کو قبول کر لے گا اور اس کام میں ان کے بپا کردہ معرکوں میں دامے، درمے، سخنے بلکہ دستے وچوبے (اور اب تو بندوقے وکلاشنکوفے) حصہ لینے کے لیے تیار ہو جائے گا تو اب امام صاحب کی نوکری پکی ہو جائے گی اور انھیں کوئی وہاں سے نہیں ہٹائے گا۔ یہ ایک افسوس ناک اور تلخ حقیقت ہے جس پر غور کرنا چاہیے۔اس کو محض تنقید کے مفہوم میں نہ لیں۔ جب تک مرض کی آپ تشخیص نہیں کریں گے،اس وقت تک اس کا علاج نہیں کر سکیں گے۔لہٰذا ان خرابیوں کو دور کرنے کا راستہ یہی ہے کہ امام کو اس کام کے لیے تیار کریں جو شریعت نے اس کے سپرد کیا ہے۔اس کو وہ علم دیں جس کی معاشرے کو ضرورت ہے۔ جب اسے معاشرے کے زندہ مسائل معلوم ہوں گے تو وہ غیر متعلق مسائل پیدا نہیں کرے گا۔

اس کے بعد تعلیم کا دوسرا درجہ ان لوگوں کے لیے ہے جو دینی علوم کے مدرس یا معلم بننا چاہتے ہیں۔آج پاکستان کے ہر اسکول اور کالج میں ایف اے تک اسلامیات لازمی ہے۔ بہت سے لوگ بی اے میں بھی اسلامیات کے مضامین پڑھتے ہیں۔ ہر کالج اور ہر اسکول میں اسلامیات کے ٹیچر

ہوتے ہیں۔ یہ دو طرح کے لوگ ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو سرکاری اداروں سے ایم اے کر کے آئے ہیں جن کا علم عموماً بڑا کمزور، سطحی اور ناپختہ ہوتا ہے۔ وہ اردو میں درسی کتابیں اور خلاصے پڑھ کر امتحان پاس کر لیتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ قرآن پاک ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ میں نے اسلامیات کے ایسے اساتذہ دیکھے ہیں کہ جن سے نماز پڑھانے کے لیے کہا جائے تو نماز نہیں پڑھا سکتے۔ قرآن پاک کی شاید چار سورتیں بھی ان کو حفظ نہ ہوں، اس لیے کہ قرآن پاک انھوں نے پڑھا ہی نہیں ہوتا۔ اردو میں چند کتابیں پڑھ کر امتحان پاس کر لیتے ہیں۔ یوں ایم اے اسلامیات کی ڈگری ان کو مل جاتی ہے اور وہ اسلام کے مجتہد اور مفتی بھی بن جاتے ہیں۔ یہ ایک دوسری خطرناک بات ہے جو ہو رہی ہے۔ اسلامیات کے مدرسین میں دوسرے وہ لوگ ہیں جو مدرسوں کی لائن سے آئے ہیں۔ مدرسوں میں میبذی، شرح عقائد اور خیالی قسم کی جو اسلامیات پڑھائی جاتی ہے، وہ نئے ماحول اور نئے اداروں میں زیادہ کام نہیں آتی۔ فقہی اور کلامی نوعیت کے اختلافی مباحث بھی اسکولوں اور کالجوں کے ماحول میں زیادہ مقبول نہیں ہوتے۔ یہاں جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لیے ہم نے ان لوگوں کو تیار نہیں کیا۔ تدریسی ضروریات کے اس مقصد کے لیے ابتدائی تین چار سال کے بعد مزید تین سال کا ایک نصاب ہونا چاہیے جس کا مقصد یہی ہو کہ آپ کو اسکولوں اور کالجوں کے لیے اسلامیات کے معلم تیار کرنے ہیں۔ اس سطح پر عربی ادب کی چند کتابیں، تاریخ اسلام، سیرت، اسلامی معاشیات، فقہ، عقائد کے ساتھ ساتھ حدیث اور تفسیر کا بقدر ضرورت حصہ شامل ہونا چاہیے۔ مزید برآں تاریخ پاکستان اور جدید دنیائے اسلام سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

اس کے بعد تیسری ضرورت یہ ہے کہ ہمیں ایسے لوگ درکار ہیں جو خود ان دینی مدارس میں پڑھائے جانے والے علوم کے اعلیٰ درجے کے متخصص ہوں، اونچے درجہ کے مضامین اور اعلیٰ سطح کی کتابیں پڑھا سکیں اور اعلیٰ درجے کے علوم وفنون کی تدریس کر سکیں۔ ہمیں فقہا درکار ہیں، محدثین درکار ہیں، مفسرین درکار ہیں، مفتی درکار ہیں جو اپنے اپنے علوم کے متخصص ہوں۔ اس کے لیے الگ سے چار پانچ سال کی تیاری درکار ہے۔ جب تک وہ تیاری نہیں ہوگی، مطلوبہ افراد تیار نہیں ہوں گے۔

اس وقت درس نظامی میں کیا ہوتا ہے؟ درس نظامی میں اس وقت ان اسلامی علوم میں سے کسی

میں تخصص کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا۔ درس نظامی میں سب سے neglected چیز قرآن پاک ہے، جس پر سب سے کم توجہ دی جاتی ہے۔ اب بعض مدارس میں ترجمہ قرآن شروع ہو گیا ہے۔ اول سے آخر تک لفظی ترجمہ پڑھا دیتے ہیں جس کی نوعیت اس عوامی درس قرآن سے مختلف نہیں ہوتی جو بہت سی مسجدوں میں ہوتا ہے، جس میں بیٹھ کر لوگ ثواب کی خاطر درس سن لیتے ہیں۔ ایک عالم صاحب نے درس دے دیا، لوگوں نے عقیدت سے سن لیا۔ کچھ یاد رہا، کچھ یاد نہیں رہا۔ اسی طرح سے مدرسوں میں جو درس ہوتا ہے، وہ اکثر لوگوں کو یاد نہیں رہتا۔ اس درس میں علوم قرآن، علم تفسیر، مضامین قرآن، مشکلات قرآن جیسے مباحث کو تو جانے دیجیے، قرآن کی تعلیم، قرآن کی دی ہوئی ہدایت اور دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلے میں قرآن کا امتیاز، یہ مضامین بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ تفسیر کے عنوان سے مدرسوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے، وہ بیضاوی کی سورۂ بقرہ ہے۔ میرے خیال میں بیضاوی کوئی اچھی تفسیر نہیں ہے۔ میں امام بیضاوی کے پورے احترام کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں۔ نہ ان کی یہ کتاب تفسیر کا اچھا نمونہ ہے، نہ کسی اور چیز کا۔ تفسیر بیضاوی انھوں نے کیوں لکھی؟ وہ اصل میں متکلم تھے اور اصول فقہ کے آدمی تھے۔ انھوں نے بطور متکلم یہ دیکھا کہ زمخشری کی تفسیر بہت مقبول ہو رہی ہے۔ زمخشری کے ہاں قرآن پاک کے بلاغی نکتوں کے پہلو بہ پہلو معتزلی عقائد بھی بہ کثرت آ گئے ہیں۔ اس پر انھوں نے سوچا کہ زمخشری کی تفسیر سے بلاغت کے نکتے تو لے لیے جائیں، لیکن معتزلی عقائد کو نکال کر اشعری عقائد بیان کر دیے جائیں اور اس طرح سے ایک نئی تفسیر مرتب کر دی جائے۔ اب جن جن باتوں میں انھوں نے زمخشری کی تردید کی ضرورت سمجھی، وہ ساری سورہ بقرہ میں آ گئیں، اس لیے وہ تو بڑی لمبی ہو گئی اور باقی تفسیر میں بس مختصر حواشی ہیں جنھیں کوئی پڑھتا نہیں۔ بیضاوی پر اکتفا کرنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عملاً تفسیر قرآن تو طلبہ کو پڑھائی نہیں جاتی۔ میں نے جید علما میں سے بھی بہت سوں کو دیکھا کہ نہ علم تفسیر سے واقف ہیں، نہ علوم قرآن میں جو مسلمانوں کے کارنامے ہیں، ان سے آشنا ہیں نہ از خود ان کو قرآن مجید پر تدبر کا موقع ملا۔ اکثر لوگوں کو بڑی تفسیروں کے نام بھی پتہ نہیں ہوتے۔ آپ چاہیں تو بیضاوی کے کسی استاد سے پوچھ کر دیکھ لیں کہ دس بہترین تفسیروں کے نام بتا دیں تو شاید طبری اور ایک آدھ کے علاوہ وہ کوئی قابل ذکر نام بھی نہ بتا سکیں۔ یہ اکثر صورتوں

میں واقفیت کا عالم ہوتا ہے۔ بعض صورتیں بلاشبہ مستثنیٰ ہیں۔

اب اگر قرآن پاک ہمارے علوم وفنون، ہماری فکر، ہماری تہذیب اور پوری زندگی کی اساس ہے تو پھر اس کو فی الواقع تعلیم کی بھی اساس ہونا چاہیے۔ یہ بات کہ آپ نے پہلے طالب علم کو ساری چیزیں پڑھا کر اس کے ذہن کا ایک سانچہ بنایا، اس کے بعد اس سانچے کے مطابق آپ اسے قرآن پڑھا رہے ہیں، یہ میرے خیال میں قرآن مجید کی توہین ہے۔ قرآن اصل سانچہ ہے۔ قرآن کے سانچے سے باقی علوم کو جانچنا چاہیے۔ باقی علوم کے سانچے سے قرآن کو نہیں جانچنا چاہیے۔ کسی کو اچھا لگے یا برا لگے، میں اس کو غلط سمجھتا ہوں اور بابانگ دہل غلط کہتا ہوں۔ قرآن معیار ہے، قرآن اصل کسوٹی ہے، قرآن کے معیار اور کسوٹی پر فقہ اور اصول فقہ اور عقائد اور ہر چیز کو جانچنا چاہیے۔ ہم پہلے متاخرین کے مرتب کردہ عقائد اور فتاویٰ اور فروعی وذیلی مباحث پڑھا کر طالب علم کا ایک ذہن بناتے ہیں، پھر اس سے کہتے ہیں کہ اب اس ذہن سے قرآن کو پڑھو۔ جہاں قرآن پاک کے الفاظ تمھارے ذہن کا ساتھ نہ دیں، وہاں اللہ کی کتاب کے الفاظ کو توڑو اور مروڑو اور توڑ مروڑ اپنے گروہ کے خیالات کے مطابق ایڈجسٹ کرو۔ یہ میرے خیال میں قرآن کا صحیح استعمال نہیں ہے۔ اس لیے میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ علوم قرآن کی تعلیم کا ایک نیا نظام ہونا چاہیے۔ کیا ہونا چاہیے؟ یہ سوال ایک تفصیلی گفتگو کا متقاضی ہے۔ اس پر کبھی بات ہوگی تو اس پر میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہوں۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ علوم قرآن میں تخصص موجودہ درس نظامی سے حاصل نہیں ہوتا۔ کچھ لوگ اپنی ذاتی دلچسپی یا ذوق سے پیدا کر لیں تو کر لیں، نظام میں اس کا بندوبست نہیں ہے۔ کوئی inherent mechanism نظام میں نہیں ہے کہ قرآن کے متخصصین پیدا ہوں۔

یہی حال علم حدیث کا ہے۔ علم حدیث کا متخصص از خود کوئی پیدا ہو جائے، اللہ تعالیٰ انور شاہ کشمیری کی طرح کے کسی آدمی کو پیدا کر دے تو کر دے، لیکن اس نصاب کو پڑھ کر جو لوگ تیار ہوتے ہیں، ان میں کوئی حدیث اور علوم حدیث کا متخصص نہیں ہوتا۔ ان کو محض چند فقہی اور کلامی موضوعات سے متعلق وہ حدیثیں یاد ہوتی ہیں جن میں فقہاے احناف کا کوئی کلام یا فقہاے شوافع کا کوئی مستدل ہے۔ مدارس میں تین تین ماہ تک اس پر بحث ہوتی رہتی ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے یا نہیں

ہوتی۔ یہاں لوگوں کے ایمان ضائع ہو رہے ہیں۔ لوگ ایمان ہی کو نہیں مان رہے کہ ایمان بھی کوئی چیز ہے۔ آپ اس کو چھوڑ کر تین مہینے اس پر بحث کرتے رہتے ہیں کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے کسی کو بحث نہیں۔ آپ نے ایمان کے بارے میں کیا فرمایا، وہ کسی کا concern نہیں۔ لوگوں کا مسئلہ صرف یہ ہے کہ اپنے کسی مقتدا یا پیشوا کے نقطہ نظر کو کسی نہ کسی تاویل یا عقلی احتمالات کے بل بوتے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت کر دیں۔ اس کے بعد اگلے چھ مہینے ان احادیث پر خرچ ہو جاتے ہیں جن میں فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین کی طرح کے اختلافی موضوعات بیان ہوئے ہیں۔ اس کے بعد جو طالب علم سب سے تیز پڑھنے والا ہوتا ہے، اس کو حکم ہوتا ہے کہ تم حدیث کی کتابوں کے صفحات پڑھو اور روزانہ چالیس صفحے پڑھو۔ اس تیز خوانی میں نہ استاد کو اس سے کوئی بحث ہوتی ہے اور نہ شاگردوں کو ہی کچھ پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی، جو ساری شریعتوں کا ناسخ اور ہر چیز کا معیار ہے اور جس کے بعد ہر بات کالعدم ہے، اس میں کیا بات کہی گئی ہے۔ شروع کے چند اختلافی مباحث کے علاوہ مضامین حدیث اور جواہر نبوت سے طلبہ جوں کے توں ناواقف رہتے ہیں۔

یہی حال کتب حدیث کی شرحوں کا ہے۔ کتب حدیث کی شروح کو دیکھ لیجیے۔ جو شروع کی بحثیں ہیں، ان میں ایک باب تین جلدوں میں آیا ہے تو دوسرا باب چار جلدوں میں، جبکہ آخر میں تین تین چار چار سطروں کے حاشیے ہیں کہ کذا قال فلان یاقد سبق البحث عنه یاانظر الکتاب الفلانی ۔ یہ شرحوں کی کیفیت ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ حدیث میں بھی کوئی تخصص مدارس کے موجودہ نصاب اور طرز تدریس کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوتا۔ فقہ میں تخصص کی صورت حال بھی یہی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان اہم اسلامی تخصصات کے لیے متخصصین کی تیاری کا ایک نیا نصاب ہونا چاہیے جس میں درس نظامی کی ساری کتابیں شامل ہوں۔ درس نظامی کی کسی کتاب کو میں متخصصین کے لیے غیر ضروری نہیں سمجھتا، لیکن درس نظامی کی ان کتابوں کے ساتھ مزید بہت کچھ شامل کرنا ضروری ہے تاکہ واقعی ایسے متخصص پیدا ہوں جو اس فن یا علم کو آگے چل کر پڑھا سکیں۔ تفسیر، حدیث اور فقہ میں تخصص کے نصابات تیار کرنے کی ذمہ داری ایک اجتماعی ذمہ داری ہے۔

اس پر جب بھی کوئی سنجیدہ گفتگو ہوگی تو میں بھی اپنی گزارشات پیش کروں گا۔ ان اہم اسلامی علوم کے متخصصین کی تیاری ایک فوری اور انتہائی اہمیت کا کام ہے۔ وطن عزیز میں علوم اسلامیہ کے مستقبل کو یقینی بنانے کے لیے یہ قدم ایک بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔

دینی تعلیم کے یہ تین درجے تو عام ہیں جن کی ملک وملت کو ہر وقت ضرورت ہے۔ ان کے بعد ایک درجہ اور ہے جس کے لیے مزید محنت درکار ہے۔ یہ درجہ ایسے جید ماہرین ومفکرین کی تیاری اور تربیت کا درجہ ہے کہ جو مغربی علوم وفنون کی تنقیح کا فریضہ انجام دے سکیں اور ناقدانہ جائزہ لے کر یہ بتا سکیں کہ ان میں کیا چیز کمزور ہے اور کیا چیز مضبوط ہے، کون سی بات اسلام کے مطابق ہے اور کون سی اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ ان ماہرین میں جو فقہ کا متخصص ہو، وہ مغربی قانون کا تنقیدی جائزہ لے۔ جو فقہ المعاملات کا متخصص ہو، وہ ان کی معاشیات کا جائزہ لے۔ جو اصول فقہ کا متخصص ہو، وہ ان کے اصول قانون کا جائزہ لے۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ اس میں کتنا وقت لگے گا، کتنے وسائل درکار ہوں گے، آخر کار کتنے لوگ تیار ہوں گے، وہ کیا کیا کام کر سکیں گے؟ یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن جب تک یہ سارے کام نہیں ہوں گے، اس وقت تک امت مسلمہ کا مستقبل اس طرح بن نہیں سکتا جس طرح ہم بنانا چاہتے ہیں۔ ماہرین اور مستقبل کے فکری اور تہذیبی معماروں کی تیاری کا یہ کام دنیا کی بہت سی قومیں کرتی ہیں۔ مغربی اقوام میں تو اس غرض کے لیے بیسیوں ادارے بنائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی گوکھلے نے انیسویں صدی کے آخر میں اسی غرض کے لیے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ بنایا تھا۔ علامہ اقبال کے ذہن میں بھی ایسے ہی ایک ادارے کا نقشہ تھا۔

آج صورت یہ ہے کہ ملک وملت کا اجتماعی نظام ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو اسلام سے براہ راست واقف نہیں ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی تو ہے اور ان میں بہت سے اچھے مسلمان بھی ہیں، لیکن جذباتی وابستگی کی بنیاد پر عمارت بنانے کی مثال ایسے ہی ہے جیسے آپ ریت پر بیس منزلہ عمارت بنانا چاہیں۔ جیسے وہ قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح یہ عمارت بھی لازماً گر جائے گی۔ چنانچہ جب کبھی بھی تھوڑی سی ایسی کوئی بات آتی ہے جو اس طبقے کے خیالات سے مختلف ہو تو وہ فوراً اس کی دور از کار تاویلیں میں عافیت سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کا پیراڈائم اور intellectual

framework اسلامی نہیں ہے۔ ان کے ہاں فہم اسلام کی کوئی مضبوط علمی اور فکری بنیاد نہیں ہے۔ اس لیے یہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس فکری بنیاد کی فراہمی کے لیے وقت درکار ہے۔ یہ کام ایک دو دن میں نہیں ہوگا۔ کسی وعظ یا مطالبے یا بینر یا دھرنے سے نہیں بنے گا۔ اس کے لیے لگ کر کام کرنا پڑے گا۔

حاضرین محترم! یہ وہ چند باتیں تھیں جو میں اسلامی علوم وفنون کے طلبہ سے کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ آپ بھی اسی میدان کے شہسوار ہیں اور اس ضرورت کی تکمیل کی ذمہ داری آپ کے کندھوں پر بھی ہے، اس لیے میری گفتگو میں تھوڑی سی تلخی آ گئی جو میں نے جان بوجھ کر شامل کی ہے تاکہ اس تلخی کا احساس آپ کو یہ سوچنے پر مجبور کرے کہ ہم جو بات کر رہے ہیں، اس کا تعلق کسی ذہنی عیاشی یا محض کسی عام تفریحی فکری سرگرمی سے نہیں ہے، بلکہ وہ واقعی بڑی اہم بات اور مسلمانوں کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ میں علامہ اقبال کے ایک شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ زبور عجم کا شعر ہے:

نوائے من ازاں پرسوز و بے باک وغم انگیز است
بحاشاکم شرار افتاد وباد صبح دم تیز است

یعنی میں اس لیے تلخ باتیں کر رہا ہوں کہ میرے آشیانے کو آگ لگ گئی ہے اور ہوا تیز ہے۔ آشیانہ کو ابھی اور فوراً بچانے کی ضرورت ہے۔ امر واقعہ یہی ہے کہ ہمارے ملی اور تہذیبی آشیانے کو آگ لگ چکی ہے، ور باد صبح دم تیز ہے۔ آشیانہ جل جانے کا خطرہ ہے اور بہت جلد اس کو بچانے کی ضرورت ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

---

# دینی مدارس میں تخصص اور اعلیٰ تعلیم و تحقیق

دینی مدارس میں درجات تخصص کا قیام اور اسلامی علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق کا بندوبست وقت کی ایک ایسی اہم اور فوری ضرورت ہے جس کی اہمیت اور فوری نوعیت کے بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بہت سے مدارس میں درس نظامی کے بعد تخصص اور تکمیل کے شعبے گزشتہ چند عشروں کے دوران کثرت سے قائم ہوئے ہیں۔ تخصص اور تکمیل کے یہ شعبے عموماً تفسیر، فقہ، فتویٰ اور تجوید وقراءت کے میدانوں سے متعلق ہیں۔ بلاشبہ یہ شعبے مفید کام کررہے ہیں اور ان کی موجودگی سے اسلامی تخصصات کی اہمیت کا احساس بڑھا ہے، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی شعبے سے تخصص کے وہ مقاصد اب تک کماحقہ پورے نہیں ہوسکے جس کی آج ملک وملت کو شدید ضرورت ہے۔

تخصص کے شعبے کا مقصد درج ذیل قسم کے اصحاب کی تیاری ہونا چاہیے:

۱۔ نمایاں اسلامی علوم (تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، اسلامی معاشیات) کے اعلیٰ مضامین کی تدریس کے لیے ایسے اساتذہ کی تیاری جو ان مضامین کی اعلیٰ سطح پر کماحقہ تعلیم دے سکیں اور دینی مدارس کے طلبہ کو آنے والے چیلنجوں اور خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرسکیں۔

۲۔ ایسے علمائے کرام کی تیاری جو ملکی جامعات اور عصری تعلیمی اداروں میں اعلیٰ سطح پر اسلامی علوم کی تدریس کی ذمہ داریاں کامیابی سے انجام دے سکیں اور وطن عزیز میں نفاذ اسلام کے عمل کی موثر رہنمائی کرسکیں۔

۳۔ ایسے اہل علم اور اصحاب تخصص کی تیاری جو اسلامی علوم کے بارے میں پیدا کی جانے والی بدگمانیوں اور اسلامی عقائد واحکام کے بارے میں کیے جانے والے اعتراضات کا مدلل اور تسلی بخش جواب دے سکیں۔

۴۔ ایسے اہل علم کی تیاری جو اپنی عمیق دینی مہارت کی بنیاد پر مغربی علوم وفنون کا ناقدانہ جائزہ لے سکیں اور مغربی افکار وتصورات کا اسلامی شریعت کی روشنی میں تنقیدی مطالعہ کر کے ان کے رطب ویابس کو الگ الگ کر سکیں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ دینی مدارس کے نظام اور نصاب میں ان میں سے کسی بھی ضرورت کی تکمیل کا کوئی بندوبست نہیں۔ تفسیر میں تخصص کے شعبے متعدد مدارس میں قائم ہیں، لیکن وہ چند ماہ میں پورا قرآن حکیم کسی ایک استاد یا مفسر کے طرز تفسیر کے مطابق سرسری طور پر پڑھا دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان تفسیری پروگراموں کے فارغ التحصیل اصحاب زیادہ سے زیادہ اپنے شیخ کے طرز پر عوامی یا مناظرانہ انداز کا درس قرآن دینے کے قابل تو ہو سکتے ہیں لیکن ان پروگراموں کے نتیجے میں وہ علوم قرآن، ذخائر تفسیر، تفسیر کے مہتم بالشان مسائل، مناہج مفسرین، دور جدید میں قرآن پاک پر کیے جانے والے اعتراضات اور شبہات، تاریخ تدوین قرآن اور ان جیسے امہات مسائل سے اکثر ناواقف ہی رہتے ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ آج قرآن پر از سر نو اعتراضات اور شبہات کی لہریں زور و شور کے ساتھ مشرق ومغرب میں پھیل رہی ہیں۔ قرآن مجید کی تفسیر وتشریح کے بارے میں طرح طرح کے شبہات عقلی وعلمی انداز میں مشرق ومغرب میں اٹھائے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کی طرف سے ان روز افزوں اعتراضات اور شبہات کا مدلل اور سنجیدہ جواب دینے کے لیے جس طرح کے متخصص اہل علم درکار ہیں، وہ ناپید ہیں یہاں تک کہ خود مسلمانوں کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں یہ نئے گمراہ کن اسالیب جگہ پا رہے ہیں اور مسلمان طلبہ کے ذہنوں کو پراگندہ اور پریشان کر رہے ہیں۔

یہی حال حدیث اور فقہ کے تخصص کا ہے۔ علم حدیث کے وسیع ذخائر، علوم حدیث کے لامتناہی دفاتر اور معارف حدیث کے عمیق مباحث عموماً تخصص حدیث کے شعبوں میں بار نہیں پاتے۔ حدیث میں تخصص اور دو دو سال میں دورۂ حدیث کرنے والے طلبہ علوم حدیث کے امہات مسائل بلکہ اہم کتابوں کے ناموں تک سے ناواقف رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں تخصص حدیث دراصل احادیث احکام کے مسلکی مطالعے سے عبارت بن کر رہ گیا ہے۔ مختلف مسالک کے اہل علم نے اپنے

اپنے مسلک کی تائید کے نقطۂ نظر سے منتخب احادیث کے مطالعے کو تخصص کا نام دے دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طلبہ کو اپنے اپنے فقہی اور کلامی موقف کے بارے میں چندگنی چنی احادیث اور روایات کے بارے میں تو واقفیت خوب ہو جاتی ہے، لیکن علوم حدیث کے اعلیٰ مباحث، ہدایت نبوی کے حقائق و معارف اور محدثین اسلام کی غیر معمولی کاوشیں طلبہ کی پہنچ سے باہر رہتی ہیں۔ یہی بلکہ اس سے بھی گیا گزرا حال فقہ کے تخصص کا ہے۔

اس صورت حال میں اب تک کیے جانے والے تجربہ پر از سر نو غور کر کے تخصصات کے ایسے نئے نصاب اور نظام کی تیاری کی فوری ضرورت ہے جہاں دینی مدارس کے فارغ التحصیل اصحاب سے ذی استعداد نوجوان اہل علم کو منتخب کر کے متعلقہ اسلامی علوم وفنون میں ٹھوس تربیت دی جائے۔ لیکن تخصص کا کوئی بھی نظام یا نصاب اس وقت تک موثر اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتا جب تک تعلیم کے ابتدائی مراحل پر بھی بھرپور اور تفصیلی نظر ثانی نہ کی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تخصص کے لیے جس صلاحیت اور سطح کے رجال کار اور طلبہ درکار ہوں گے، جب تک وہ بنیادی اسلامی علوم میں گہری استعداد اور علوم آلیہ سے اچھی طرح واقفیت نہ رکھتے ہوں، ان کے لیے تخصص کی سطح پر اعلیٰ تعلیم کا حصول ممکن نہ ہوگا۔ اس لیے تخصص پر گفتگو کرنے سے پہلے چند ضروری اشارات قبل از تخصص مراحل کے بارے میں بھی پیش کرنا ضروری ہے۔

اس وقت امر واقعہ یہ ہے کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کی بہت بڑی تعداد مساجد کی امامت اور خطابت کے فرائض سرانجام دی رہی ہے۔ بلاشبہ مساجد کی امامت اور خطابت مسلم معاشرے میں ایک انتہائی اور بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ معاشرے کی دینی تشکیل اور رائے عامہ کی اسلامی تربیت میں ائمہ اور خطبا کے کام کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن مجھے یہ عرض کرنے میں کوئی باک نہیں کہ درس نظامی کا موجودہ نظام اور نصاب پاکستان کے لیے مطلوبہ صلاحیت اور صفات کے ائمہ اور خطبا تیار نہیں کرتا۔ امامت وخطابت کے لیے بہت سی ضروری صلاحیتوں کی تیاری بندوبست درس نظامی میں موجود نہیں۔ اسی طرح مستقبل کا امام بہت سی ایسی چیزیں پڑھنے پر خود کو مجبور پاتا ہے جو اس کے لیے امامت اور خطابت میں کسی بھی حیثیت سے کارآمد نہیں۔ منطق اور قدیم یونانی فلسفے

کے اعلیٰ مسائل سے پاکستان میں کسی بھی امام کو کوئی واسطہ نہیں پڑتا۔ اس لیے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدارس کے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح کے تین بلکہ چار سالوں کا نصاب اس طرح تیار کیا جائے کہ اس کے فارغ التحصیل حضرات اچھے امام، اچھے خطیب یا ابتدائی مدرس اور سرکاری سکولوں کے اچھے مدرس بن سکیں۔ اس سطح پر درس نظامی کی عام کتابوں کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشیات، اسلام کے سیاسی افکار، سیرۃ النبی، صدر اسلام کی تاریخ، تاریخ پاکستان، برصغیر میں اسلامی تحریکات کی تاریخ جیسے موضوعات کے علاوہ تجوید و قراءت کے مضامین کو لازمی طور پر شامل کیا جائے۔ اس سطح پر اردو و عربی کی ایک آسان تفسیر اور حدیث کی دو یا تین کتب ضرور شامل ہوں۔ ابتدائی سالوں میں جب طلبہ کی عربی کی استعداد زیادہ نہ ہو تو اردو میں دستیاب احادیث کے مجموعوں میں سے کوئی ایک مجموعہ منتخب کیا جا سکتا ہے۔ میری ناچیز رائے میں سال اول و دوم میں معارف الحدیث اور سال سوم اور چہارم میں ترجمان السنۃ شامل کی جا سکتی ہیں۔ مزید برآں فقہ اور اصول فقہ کی متداول درسی کتب کے ساتھ ساتھ ایک یا دو کتابیں اردو اور آسان عربی میں شامل ہونی چاہییں۔ علمائے ندوہ نے اور مولانا محمد انور بدخشانی نے یہ کام بہت آسان کر دیا ہے۔

جو طلبہ نصاب کا یہ مرحلہ مکمل کر لیں، ان کو مناسب سند دے کر ادارے سے فارغ التحصیل کر دیا جائے۔ میری ذاتی رائے میں طلبہ کا تقریباً پچاس فی صد حصہ اس مرحلے پر فارغ ہو کر چلا جائے۔ اگلے مرحلے کے لیے صرف ذی استعداد طلبہ قبول کیے جائیں جن کا اصل مقصد امامت، خطابت، ابتدائی اداروں کی تدریس یا سرکاری اسکولوں کی ملازمت نہیں بلکہ ذرا اعلیٰ سطح کی تدریس ہو۔ یہ مرحلہ بھی تین سے چار سال تک مشتمل ہو سکتا ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ اس مرحلے میں تخصص کے پہلے قدم کے طور پر طلبہ کو دو یا زائد گروپوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ کچھ طلبہ جو فقہ اور علوم فقہ میں تخصص کرنا چاہیں، ان کے نصاب کی تفصیلات میں فقہی کتابوں اور مضامین اور فقہی موضوعات میں مہارت اور تخصص پر زیادہ زور دیا جائے۔ جو طلبہ مثلاً علوم قرآن و تفسیر اور علوم حدیث میں تخصص کرنا چاہیں، ان کے تجویز کردہ نصاب میں فقہی کتب کی تعداد کو نسبتاً کم کر کے حدیث و تفسیر کی کتب شامل کی جائیں۔ لیکن درس نظامی کی موجودہ کتب چند ایک کے اضافے کے ساتھ دونوں گروپوں کے لیے

رہنی چاہییں۔ اس سطح پر طلبہ کو اسلامی معاشیات، اسلامی بنکاری، اسلامی بیمہ کاری کے ساتھ ساتھ مغربی افکار اور نظریات کے بارے میں بھی ایک دو کتب لازمی طور پر پڑھائی جائیں۔ مناسب یہ ہوگا کہ اس مرحلے میں جو طلبہ داخل کیے جائیں، وہ انگریزی زبان سے کسی حد تک واقفیت رکھتے ہوں۔ مغربی افکار سے واقفیت کا بندوبست باقاعدہ نصابی کتب کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے اور ماہرین کے توسیعی خطبات کے ذریعے بھی۔

مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلے کو بھی دو ذیلی مرحلوں میں تقسیم کیا جائے۔ پہلا ذیلی مرحلہ جو دو سال پر مشتمل ہو تو وہ تمام طلبہ کے لیے مشترک ہو اور کوشش یہ کی جائے کہ ان دو سالوں کے دوران موقوف علیہ تک کی بنیادی اور اساسی کتب اور مضامین ختم ہو جائیں۔ دوسرا ذیلی مرحلہ حدیث اور تفسیر کے طلبہ کے لیے الگ اور فقہ اور اصول فقہ کے طلبہ کے لیے الگ ہو۔ کچھ مضامین میں دونوں طلبہ شریک ہوں۔ مثال کے طور پر جامع ترمذی کے درس میں دونوں گروپوں کے طلبہ شریک ہوں۔ اسی طرح آیات احکام یا فقہی تفسیر کے متعلق مضامین بھی دونوں گروپوں کے لیے لازمی ہوں۔ ان دونوں کے علاوہ چند اور مضامین بھی مشترک ہو سکتے ہیں۔

امید کی جانی چاہیے کہ ہدایہ کے چاروں حصے ابتدائی دو سالوں تک مکمل ہو جائیں گے۔ اب اگلے دو سالوں کے نصابات میں جو طلبہ آگے چل کر فقہ میں تخصص کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے کل مضامین کا آدھا حصہ فقہی مضامین پر مشتمل ہو اور باقی مضامین مشترک ہوں۔ اسی طرح جو طلبہ آگے چل کر حدیث اور تفسیر میں تخصص کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے کل مضامین کا کم از کم پچاس فیصد حدیث اور تفسیر پر مشتمل ہونا چاہیے۔ ان دو سالوں میں فقہ اور اصول فقہ میں آگے چل کر تخصص کرنے والے طلبہ کے لیے نصاب کا خاکہ اس طرح کا ہو سکتا ہے:

## سال اول کی پہلی شش ماہی

۱۔ عقود رسم المفتی

۲۔ بدائع الصنائع کے منتخب ابواب، مثلاً کتاب الزکوۃ، کتاب النکاح، کتاب الطلاق۔

۳۔ البحر الرائق کے منتخب ابواب

۴۔ بدایۃ المجتہد (حصہ اول)

۵۔ مجلۃ الاحکام العدلیہ (باب اول)

۶۔ مشترک مضامین

۷۔ مشترک مضامین

۸۔ درس نظامی کی بقیہ کتب

## سال اول کی دوسری شش ماہی

۱۔ ردالمحتار کے منتخب ابواب

۲۔ اصول السرخسی

۳۔ بدایۃ المجتہد، حصہ اول

۴۔ المغنی لابن قدامہ (منتخب ابواب)

۵۔ المہذب فی اصول الفقہ المقارن۔ جلد اول

۶۔ مشترک مضامین

۷۔ مشترک مضامین

۸۔ درس نظامی کی بقیہ کتب

## سال دوم کی دوسری شش ماہی

۱۔ نیل الاوطار، منتخب ابواب

۲۔ شرح معانی الآثار

۳۔ احکام القرآن للجصاص

۴۔ المہذب فی اصول الفقہ المقارن، جلد دوم

۵۔ المستصفی للغزالی (از آغاز تا نہایت قطب ثانی)

۶۔ مشترک مضامین

۷۔ مشترک مضامین

۸۔ درس نظامی کی بقیہ کتب

ان دو مرحلوں کی کامیاب تکمیل کے بعد طلبہ کی بڑی تعداد فارغ التحصیل ہو جائے گی۔ وہ متداول درس نظامی کی تمام اہم کتابیں اور بنیادی مضامین پڑھ چکی ہوگی۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد مضامین سے ضروری واقفیت حاصل کر چکی ہوگی۔ اب صرف وہ ذی استعداد طلبہ رہ جائیں گے جو اس مرحلہ پر بھی بہت ممتاز اور نمایاں رہے ہوں۔ ان کو تخصص کی سطح کی تعلیم کے لیے منتخب کیا جائے۔ گویا اگر ادارے میں ابتدائی مرحلے میں ایک سو طلبہ داخل ہوئے ہوں تو ان میں سے پہلے مرحلے میں یعنی ثانوی تعلیم کے چار سال کی تکمیل پر کم از کم پچاس طلبہ کو فارغ کر دیا جائے۔ بقیہ پچاس طلبہ میں سے کم از کم نصف یعنی پچیس اگلے مرحلے یعنی مزید چار سال کی تکمیل پر فارغ کر دیے جائیں اور تخصص کے مرحلے پر صرف ایک چوتھائی طلبہ کو قبول کیا جائے۔ یہ بات کہ ہر طالب عالم کو آخر تک ہر چیز پڑھائی جائے، نہ مناسب ہے اور نہ قابل عمل۔ نہ ہر طالب علم کی یہ استعداد ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ اس کو آخری سطح تک ادارے سے وابستہ رکھنے پر اصرار کیا جائے۔

یوں تو تخصص کی ضرورت مختلف میدانوں میں ہے لیکن خاص طور پر درج ذیل شعبوں میں تخصص کی ضرورت آج انتہائی شدید ہے:

۱۔ تفسیر اور علوم قرآن

۲۔ حدیث اور علوم حدیث

۳۔ فقہ اور اصول فقہ

۴۔ افتا اور قضا

۵۔ عقیدہ اور کلام

۶۔ اسلامی معیشت و تجارت

۷۔ تقابل ادیان

۸۔ فکر جدید اور مطالعہ مغرب

۹۔اسلام اور اسلامی تہذیب عصر جدید میں

۱۰۔عربی زبان وادب

تخصص کا پروگرام کسی صورت میں بھی تین سال سے کم نہیں ہونا چاہیے۔ان تین سالوں میں ابتدائی دوسال با قاعدہ نصابات اور مقررہ کتب کی تدریس کے لیے وقف ہوں،اور تیسرا سال تحقیق مقالے اور اپنے موضوع سے متعلق چند مضامین کی،جن کی تعداد دو یا تین سے زیادہ نہ ہو،تدریس پر مشتمل ہونا چاہیے۔

تخصص کی سطح پر متعلقہ میدان میں مغربی مفکرین نے جو کچھ لکھا ہے،اس سے طلبہ کو گہری واقفیت ہونی چاہیے۔امید کی جانی چاہیے کہ تخصص تک پہنچنے والے تمام طلبہ انگریزی کتب اور تحریروں سے بسہولت استفادہ کرنے کے اہل ہوں گے۔

تخصص کی سطح پر مضامین،موضوعات اور کتب کا تعین کرنے کے لیے تین معیارات کو پیش نظر رکھنا چاہیے:

۱۔متعلقہ میدان تخصص کے بارے میں اکابر اسلام کی نمایاں خدمات اور ان کے اساسی کام سے طلبہ براہ راست واقف ہو جائیں۔

۲۔متعلقہ میدان تخصص میں جو جو توسیعات اور ترقیاں ہوئی ہیں،ان سے طلبہ براہ راست مانوس ہو جائیں۔

۳۔متعلقہ میدان تخصص کی موجودہ صورت حال پورے طور پر طلبہ کو گرفت میں ہو،یعنی بیسویں صدی میں اس موضوع پر مسلمان اہل علم کا نمایاں کام کیا ہے،مغربی مستشرقین نے اس بارے میں کیا کہا ہے اور مستشرقین کے اثرات کے تحت دنیائے اسلام میں جو رجحانات پیدا ہوئے ہیں،ان سے کس طرح عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر فقہ اور اصول فقہ میں تخصص کے لیے ضروری ہوگا کہ ابتدائی دوسالوں میں جو نصاب پڑھایا جائے،وہ متقدمین کی کتابوں سے لے کر متاخرین تک ہر دور کی نمائندہ کاوشوں پر مشتمل ہو۔اس سطح پر فقہ اسلامی کا تقابلی مطالعہ ناگزیر ہونا چاہیے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ آج دنیائے

اسلام میں مختلف فقہی مسالک کا ایک دوسرے سے ارتباط اور اختلاک ہو رہا ہے۔ دنیا کے ہر بڑے شہر میں تقریباً ہر فقہی مسلک سے وابستہ مسلمان بڑی تعداد میں موجود ہیں جن کا ایک دوسرے سے روزانہ کوئی نہ کوئی فقہی واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ ان حالات میں فقہ کے متخصصین کو اپنے فقہی مسلک کے علاوہ دوسرے مسالک سے کسی قدر واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کام کے لیے ابن رشد کی بدایۃ المجتہد کے علاوہ دوسرے فقہی مسالک کی بعض منتخب کتب کے ابواب طلبہ کو پڑھانے چاہییں۔ اسی طرح اصول فقہ کا تقابلی مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ ایک معاصر سعودی عالم نے ''المہذب فی اصول الفقہ المقارن'' کے نام سے تقابلی اصول فقہ پر ایک جامع کتاب پانچ جلدوں میں تیار کی ہے۔ وہ اس مرحلے پر بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

فقہ میں تخصص کے طلبہ کے لیے انگریزی اصول فقہ، ضابطہ فوجداری و دیوانی، تعزیرات پاکستان اور پاکستان کے آئین اور دو ایک منتخب قوانین کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ان قوانین کے مطالعے کا مقصد طلبہ کو وکیل یا انگریزی قانون کا ماہر بنانا نہیں بلکہ اس طرز فکر سے واقف کرانا ہے جس کی بنیاد پر انگریزی قوانین مرتب ہوئے ہیں۔ اگر تخصص فی الفقہ کا مقصد اور ہدف ملک میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے عمل میں حصہ لینا اور اس مقصد کو آگے بڑھانا ہے تو ملک کے قانون، عدالتی نظام اور دستوری نظام سے واقفیت ضروری ہے۔

تخصص کی سطح پر امید کی جانی چاہیے کہ طلبہ اعلیٰ استعداد کے حامل ہوں گے اور ان کو کوئی کتاب سبقاً سبقاً اول سے لے کر آخر تک پڑھانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس سطح پر استاد کا کام رہنمائی کرنا اور طلبہ کا کام از خود مطالعہ ہونا چاہیے۔ تعلیم کے دو سالوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے۔ یہ چاروں حصے پانچ پانچ مہینوں پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔ پانچ مہینوں کی اس مدت میں ایک طالب علم پانچ سے سات موضوعات تک بآسانی مطالعہ کر سکتا ہے۔ اس مرحلے پر پوری پوری کتابیں سبقاً سبقاً پڑھانے کے بجائے امہات الکتب کے منتخب ابواب پڑھائے جائیں۔ ایک مضمون کا استاذ ہفتے میں تین یا چار مرتبہ طلبہ کو درس یا رہنمائی کے لیے دستیاب ہو اور بقیہ اوقات میں طلبہ از خود مطالعہ کریں اور مطالعے کے نتائج کو تحریری طور پر مرتب کریں۔ یہ اسلوب انگریزی اور ملکی قانون کے مطالعے میں

بہت آسانی سے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

یہاں مختلف موضوعات اور میدانوں میں تخصص کی مکمل اسکیم کی نشان دہی قبل از وقت ہوگی۔ اگر ان گزارشات سے فی الجملہ اتفاق ہو تو آغاز سے انتہا تک ایک مکمل نقشہ تجویز کرنا ہوگا۔ بنیاد اور ڈھانچے کی تعمیر سے قبل اونچی منزلوں کی تعمیر کا کام اور اس کی تجاویز غیر مناسب ہیں۔ ان صفحات میں تخصص کے لیے دس میدان تجویز کیے گئے ہیں۔ کسی ایک ادارے کے لیے ان سب میں بہ یک وقت تخصص کا پروگرام شروع کرنا نہ قابل عمل ہے اور نہ مناسب۔ بہتر یہی ہوگا کہ پہلے قدم کے طور پر بڑے بڑے دینی ادارے ایک ایک یا زیادہ سے زیادہ دو دو میدانوں میں تخصص کا پروگرام شروع کریں اور آہستہ آہستہ دوسرے شعبوں کی طرف قدم بڑھائیں۔

وفاق المدارس کی طرف سے ایک مستقل نظامت اعلیٰ برائے تخصصات شرعیہ قائم کی جانی چاہیے جو تخصص کا نصاب اور نظام وضع کرے۔ وفاق کی اجازت اور منظوری کے بغیر کسی ادارے کو تخصص کا شعبہ قائم کرنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔ جہاں ایسے شعبے قائم ہوں، ان کی نگرانی مذکورہ نظامت اعلیٰ کرے اور معیار کی پابندی کو یقینی بنائے۔

ان صفحات میں اگرچہ گفتگو تخصص کے بارے میں کی گئی ہے، لیکن دو اہم باتوں کی نشاندہی کی اجازت چاہتا ہوں۔ ان دونوں باتوں کا تخصص کے پروگراموں کی کامیابی سے بھی اگر براہ راست نہیں تو بالواسطہ تعلق ضرور ہے۔ میری مراد عربی اور فارسی زبان کی تدریس سے ہے۔

## عربی زبان کی تدریس

مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجیے کہ بیشتر دینی مدارس میں عربی زبان کی تدریس کا موجودہ نظام، نصاب اور انداز انتہائی ناقص، غیر تسلی بخش اور ناقابل قبول ہے۔ عربی فارسی سے نابلد طلبہ فارسی کے ذریعے عربی صرف ونحو کے ضروری قواعد حفظ کرتے ہیں، پھر عربی کی از کار رفتہ اور فضول کتابوں کے ذریعے عربی صرف ونحو میں ''مہارت'' حاصل کرتے ہیں اور اس نامکمل اور انتہائی ناقص علم کے چند صفحات کو رٹ کر عربی زبان ''... کے ماہرین بن جاتے ہیں۔ میں اپنے ذاتی

تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر عرض کرتا ہوں کہ مدارس میں عربی ادب کی ان کتابوں کی سالہا سال تدریس کرنے والے اساتذہ میں سے بیشتر ان کتابوں کے درسی اجزا کے علاوہ عربی زبان وادب کے پورے ذخیرے سے ناواقف رہتے ہیں۔

عربی زبان، جو دنیا کی سب سے زیادہ دقیق اور سائنٹفک زبان ہے، عربی ذخیرۂ الفاظ جو دنیا کی زبانوں کا سب سے وسیع ذخیرہ الفاظ ہے، عربی صرف ونحو جس کا مقابلہ شاید ہی کسی زبان کی صرف ونحو کر سکے، دینی مدارس کے علما کی بڑی تعداد کے لیے ایک بند دروازہ ہی رہتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان کی تدریس میں ندوۃ العلما کا تجربہ بہت کامیاب اور شاندار رہا ہے۔ اس تجربے نے گزشتہ نصف صدی سے زائد کے عرصے میں اپنی افادیت اور خوبی کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے، لہٰذا عربی زبان کی تدریس کے پورے نصاب ونظام پر ندوہ کے تجربے کی روشنی میں نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ ندوہ کی مرتب کردہ ابتدائی کتابیں وسطانی مدارس میں پڑھائی جانی چاہییں۔ مزید برآں عربی نثر کی عمدہ کتابوں کے منتخب حصے نصاب میں شامل ہونے چاہییں۔ عربی شعر میں بھی متعدد مجموعے ایسے دستیاب ہیں جو حماسہ اور سبعہ معلقہ سے پہلے پڑھا دیے جائیں تو زبان کا اچھا ذوق پیدا ہو سکتا ہے۔

عربی نثر میں سیرت ابن ہشام، البدایہ والنہایہ اور مقدمہ ابن خلدون کے منتخبات پر مشتمل ایک ترتیب دے دی جائے اور نفحۃ العرب کے بعد پڑھائی جائے تو عربی نثر کی اچھی بنیاد بن سکتی ہے۔ میری ذاتی رائے میں مقامات حریری کی تدریس محض وقت کا ضیاع ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو تین مقامے نمونے کے طور پر پڑھا دینا کافی ہے۔

## فارسی زبان کا اہتمام

برصغیر میں ایک طویل عرصے تک دینی علوم وفنون کی تدریس فارسی زبان میں ہوتی رہی ہے۔ فارسی ہی جنوبی ایشیا اور افغانستان کی علمی اور ثقافتی زبان رہی ہے۔ ہندو پاکستان کے دینی مدارس میں ابتدائی تعلیم بھی فارسی ہی میں ہوتی تھی۔ اگرچہ فارسی کو ذریعہ تعلیم بنانا اور دینی وعربی علوم کے

لیے فارسی زبان کو استعمال کرنا اردو کے رواج پا جانے کے بعد غیر موزوں اور غیر مفید تھا، لیکن فی نفسہ فارسی زبان وادب کی ضروری تعلیم میں بہت افادیت تھی۔ طلبہ برصغیر کے دینی ورثے سے واقف ہو جاتے تھے۔ برصغیر کے دینی اکابر کی تحریروں تک ان کو رسائی حاصل ہو جاتی تھی۔ لیکن گزشتہ تیس چالیس سال سے فارسی کو مکمل طور پر ختم کر دینے کے رجحان سے بہت نقصان ہوا ہے۔ آج بہت سے علما کے لیے مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسے اکابر کی کتابیں نا قابل فہم ہوگئی ہیں۔ فارسی زبان کے ذریعے اخلاق، تہذیب اور روحانیت کا جو عنصر نصاب تعلیم کی بنیادوں میں شامل ہو جاتا تھا، اس سے طلبہ قریب قریب محروم ہو گئے ہیں۔

ان حالات میں فارسی زبان کی (بطور ایک مضمون کے) تدریس کا احیا کرنا ضروری ہے۔ اگر ابتدائی دینی مدارس میں حفظ قرآن کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی، حساب اور معاشرتی علوم کے مضامین شامل کر دیے جائیں تو پانچ سال کی مدت میں طالب علم قرآن مجید کا حافظ ہونے کے ساتھ ساتھ نہ صرف اردو اور فارسی کی ضروری استعداد کا حامل ہو سکتا ہے بلکہ ضروری حساب اور ابتدائی ریاضی سے بھی واقف ہو سکتا ہے۔

وسطانی مدارس میں فارسی کو ایک لازمی مضمون کی حیثیت دی جانی چاہیے۔ اگر طالب علم ابتدائی مدارس میں آمدنامہ، گلزار دبستان، کریما، پندنامہ، گلستان اور بوستان پڑھ چکا ہو (جو ایک گھنٹہ روزانہ کے حساب سے چار سال میں بہت آسان ہے) تو وسطانی مدارس میں مثنوی مولانا روم کے منتخبات، بہارستان جامی، کشف المحجوب، امام غزالی کی کیمیائے سعادت کے منتخب ابواب پڑھانا مشکل نہ ہوگا۔ پھر ثانویہ عامہ اور عالیہ میں حضرت مجدد الف ثانی کے بعض منتخب مکتوبات اور مولانا اسماعیل شہید کی منصب امامت کو شامل کرنا آسان ہوگا۔ حضرت مجدد کے بعض طویل مکتوبات عقائد اور تصوف کے بنیادی اور مہتم بالشان مسائل کے بارے میں انتہائی عالمانہ اور وقیع مباحث پر مشتمل ہیں اور اچھی خاصی کتاب کی ضخامت کے برابر ہیں۔ ایسے چند مکتوبات کو نصابی کتاب کے طور پر پڑھایا جا سکتا ہے۔

# ضمیمہ

## موجودہ حالات میں علماء کرام کی ذمہ داریاں

## مسلکی اختلاف اور اس کی حدود

# موجودہ حالات میں علماء کرام کی ذمہ داریاں

[دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام
تربیت ائمہ کورس کی افتتاحی تقریب سے خطاب]

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ غالباً وہ پہلے انسان ہیں جو امیر المومنین فی الحدیث کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کا مشہور شعر ہے:

وهل افسد الدين الا الملوك
واحبار سوء ورهبانها

یعنی دینی معاملات کو کس نے خراب کیا اور فاسد کیا ہے سوائے حکمرانوں اور علمائے سوء کے۔ گویا وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلم معاشرے میں بالخصوص اور انسانی معاشرے میں بالعموم جب کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے تو دو طبقوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ایک اس طبقہ کی وجہ سے جو کسی ملک میں کسی نہ کسی حیثیت سے حکمرانی یا ذمہ داری کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔ دوسرا علمائے کرام کا طبقہ جس سے مراد یہاں صرف علماء دین نہیں، بلکہ اس سے مراد معاشرے کے وہ تمام لوگ ہیں جو کسی بھی اعتبار سے اپنے معاشرے کی علمی وفکری رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہوں۔ گویا امت یا قوم کے سیاسی، فکری اور دینی قائدین اگر اچھے ہوں اور درست راستے پر گامزن ہوں تو پھر امت درست راستے پر گامزن رہتی ہے اور اگر یہ طبقے راہ راست سے ہٹ جائیں تو بالآخر امت بھی راستے سے ہٹ جاتی ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

خیار ائمتکم الذین تحبونھم ویحبونکم و تصلون علیھم ویصلون علیکم و شرار ائمتکم الذین تلعنونھم ویلعنونکم و یبغضونکم و تبغضونھم

''تمھارے بہترین ائمہ وہ لوگ ہیں جن سے تم محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت کرتے ہوں۔ تم ان کے لیے دعاے خیر کرتے ہو اور وہ تمھارے لیے دعاے خیر کرتے ہوں۔ اور بدترین ائمہ وہ ہیں کہ تم ان پر لعنتیں بھیجو، وہ تم پر لعنتیں بھیجیں۔ وہ تم سے نفرت کریں، تم ان سے نفرت کرو''۔

یہاں ائمہ کا لفظ کسی خاص شعبے کے قائدین کے لیے استعمال نہیں ہوا، بلکہ ہر اس فرد کے لیے استعمال ہوا ہے جو امت میں قیادت اور امامت کا مقام رکھتا ہے۔ وہ تعلیم میں قیادت کی امامت ہو، مسجد کی امامت ہو، فکر کی امامت ہو، سیاست کی امامت ہو، کسی بھی طرح کی امامت ہو، اگر تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ وہ بہترین لوگ ہیں جو امت سے اخلاص رکھتے ہیں، امت ان کے اخلاص کی قدر کرتی ہے، اس کی وجہ سے ان کے لیے دعا گو ہے، ان سے محبت کرتی ہے اور وہ امت سے محبت کرتے ہیں تو پھر وہ بہترین قیادت ہے۔

ان دونوں اقوال جن میں سے ایک حدیث پاک ہے اور دوسرا ایک عظیم محدث اور امام کا قول ہے، کی روشنی میں دیکھا جائے تو ائمہ کرام خصوصاً دینی ائمہ کرام کی ذمہ داری نہایت ہی نازک اور بھاری ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر دور جدید میں یہ ذمہ داری بہت نازک ہوگئی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو مغرب کی طرف سے بڑھتا ہوا سیکولرازم ہے جو ایک طوفان کی طرح دنیائے اسلام کو اپنے گھیرے میں لے رہا ہے۔ مغرب نے اپنے تاریک ادوار کے ایک ہزار سال کے ناگفتہ بہ تجربات کے بعد سیکولرازم کو اپنے لیے پناہ گاہ سمجھا اور یہ محسوس کیا کہ ان کے مصائب اور مشکلات کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مذہب اور سیاست یکجا تھے۔ ان کا مذہب اور ان کی سیاست چونکہ اپنی داخلی کمزوریوں کی وجہ سے یکجا نہیں چل سکتے تھے، اس لیے انھوں نے ان دونوں کو الگ الگ کر دیا۔ اس علیحدگی کے بعد وہ بڑی حد تک ان مصائب سے آزاد ہو گئے جن کا وہ ایک ہزار سال شکار رہے، لیکن کچھ نئے مصائب کا

شکار ہو گئے۔ مشکل یہ ہوئی کہ اگر یہ چیز مغرب تک محدود رہتی تو ہمارے لیے شاید زیادہ قابل اعتراض نہ ہوتی۔

یہاں ایک علمی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی تاریخ میں ایسا کیوں ہوا؟ چونکہ ان کے مذہب اور سیاست میں تفریق اور دوری پیدا ہوئی تو جب تک ہم مغرب کے ان فکری اور مذہبی رجحانات اور مسائل سے واقف نہیں ہوں گے جن کی وجہ سے وہاں دین ودولت میں جدائی عمل میں آئی، ہم سیکولرازم کے مسئلے سے کماحقہ نہیں نبٹ سکیں گے۔ ہمارے ہاں اصل خرابی اس لیے پیدا ہورہی ہے کہ وہ نتائج جو مغرب میں مسیحیت کی خاص تاریخ اور یورپ کے خاص ماحول کی پیداوار تھے، وہ دنیائے اسلام میں بغیر سوچے سمجھے بڑے پیمانے پر درآمد کیے جارہے ہیں، بلکہ مغرب کے موجودہ سیاسی اثر ورسوخ، اس کی عسکری طاقت، اس کی اقتصادی خوشحالی اور دنیوی معاملات میں ان کی بالادستی کی وجہ سے وہ نتائج بد اور اثرات شر دنیائے اسلام میں برآمد بلکہ مسلط کیے جارہے ہیں۔ نہ دنیائے اسلام کی تاریخ اس نوعیت کی تاریخ رہی ہے جس سے دنیائے مغرب کو گزرنا پڑا، نہ دنیائے اسلام میں ریاست اور مذہب میں کبھی کشمکش پیدا ہوئی جو یورپ میں ایک ہزار سال موجود رہی، نہ وہ قباحتیں دنیائے اسلام میں پیدا ہوئیں جن سے مغرب کو واسطہ پڑا، نہ یہاں مذہب نے ترقی وتہذیب کے راستے میں رکاوٹ پیدا کی جو مغرب میں پیدا ہوئی، نہ یہاں مذہبی محاسبہ کا وہ احتسابی عدالتی نظام تھا جس سے سینکڑوں ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں انسانوں کو مذہب کے نام پر موت کے گھاٹ اتارا گیا، نہ یہاں عقل وشعور کی ہر کاوش کا یہ کہہ کر انکار کیا گیا کہ فلاں مذہبی پیشوا اور فلاں مذہبی ادارہ اس سے اتفاق نہیں کرتا، نہ لوگوں کو اس لیے سزائے موت دے دی گئی کہ انھوں نے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر کوئی سائنسی نتیجہ بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ سارے معاملات دنیائے اسلام میں نہیں تھے۔

دنیائے اسلام میں تو پہلے دن سے عقل اور وحی کے درمیان اتنی ہم آہنگی، یکسانیت اور قرب تھا کہ دنیائے اسلام کی تاریخ میں کوئی لمحہ ایسا نہیں آیا کہ عقل اور وحی یا دین اور دنیا یا مذہب اور غیر

مذہب دو متعارض اور متحارب کیمپوں میں تقسیم ہوئے ہوں اور ان کی آپس میں کشمکش رہی ہو۔ ہمارے ہاں تو وہ لوگ بھی جو مذہبی فکر کے ترجمان نہیں سمجھے جاتے، ان کے ہاں بھی دین اور دنیا، عقل ودحی میں جو امتزاج پایا جاتا ہے، وہ اہل مغرب کے بڑے بڑے مذہبی علما سے کہیں بڑھ کر ہے۔ خالص فلسفی، ابن سینا اور فارابی جیسے لوگوں کی مثال دیکھیے جن کو عموماً اسلامی فکر کا معتمد اور معتبر نمائندہ قرار نہیں دیا جاتا، بلکہ ان کو یونانی افکار کا ہی ترجمان سمجھا جاتا رہا، اگر یہ کہا جائے کہ مغرب کی تاریخ میں مذہب کے جو بہترین علمبردار تھے، یہ لوگ ان سے کہیں زیادہ مذہبی تھے تو غلط نہ ہوگا۔ یورپ کی تاریخ میں مذہب کے جو بہترین نمائندے رہے ہیں، مثلاً سینٹ ٹامس اکوی ناس جن کو مسیحیت میں حضرت عیسیٰ اور سینٹ پال کے بعد تیسرا بڑا مجدد مانا جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ یہ لوگ مذہبی اور دینی خیالات سے قریب تر تھے۔ انھوں نے جس طرح عقل اور دین کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور جس طرح سے دینی عقائد اور دینی تصورات کو عقلیات کی زبان میں کامیابی سے بیان کیا، ان کی مثالیں یورپ کی مذہبی تاریخ میں خال خال ہی ملیں گی۔

ہمارا بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارے دانشوروں نے نہ اپنی تاریخ کا مطالعہ کیا نہ مغربی تاریخ کا، نہ یہ دیکھا کہ ہمارے ہاں کیا خرابیاں تھیں اور کیا نہ تھیں اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ دوسروں کے ہاں جو خرابیاں اور کمزوریاں پیدا ہوئیں، وہ کیوں پیدا ہوئیں۔ اس ناواقفیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسروں کی کمزوریوں کو زبردستی مسلمانوں کی کمزوریاں قرار دیا جانے لگا۔ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے ہاں خرابیاں نہ تھیں، لیکن جو خرابیاں تھیں، ان کو کسی نے دیکھا نہیں اور جو خرابیاں نہیں تھیں، ان کو زبردستی اپنے اندر موجود مان لیا گیا۔ ان خرابیوں کو ماننے کے بعد وہ نتائج بھی خود تسلیم کر لیے گئے جو یورپ میں ان خرابیوں کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ اس سے دنیائے اسلام میں سیکولرازم کا فروغ شروع ہو گیا۔ سیکولرازم کے فروغ کے نتیجے میں فکری کشمکش کی ایک ایسی صورت حال انڈونیشیا سے مراکش تک پیدا ہوگئی ہے جو بین الاقوامی قوتوں کے مفاد کی وجہ سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ آج مغرب کی بالادست قوتوں کی کوشش یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے مذہب کے دائرے کو زیادہ سے زیادہ محدود کر

دیا جائے اور ریاستی اور سرکاری، اجتماعی، قانونی، اقتصادی اور تہذیبی معاملات سے دین و مذہب کو نکال کر مذہب اور اخلاق کا دائرہ مسجد اور عبادت گاہ تک محدود کر دیا جائے۔

یہ وہ چیلنج ہے جو دنیائے اسلام کو آج درپیش ہے۔ بظاہر یہ ایک خالص فکری اور علمی مسئلہ ہے جس کا روزمرہ کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن آج دنیائے اسلام کو جو مسائل درپیش ہیں، ان کا گہرائی سے جائزہ لیں اور فکری سطح پر دیکھیں کہ ان کے اسباب کیا ہیں تو یہی سیکولر رجحان اور لادینی طرز فکر ہی بنیادی سبب نظر آئے گا۔ آج دنیائے اسلام کے اہل علم و دانش کے خاصے قابل ذکر حصے میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ جس طرح سے مغرب ایک خاص انداز میں مذہب اور ریاست کو الگ الگ کرنے پر مجبور ہوا، دنیائے اسلام کو بھی آج اس نتیجے پر پہنچنا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں شرعی قوانین بنیادی حقوق سے متعارض ہیں، کبھی کہا جاتا ہے کہ فلاں قسم کے نظام سے معاشرے میں تفریق پیدا ہو رہی ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ فلاں قسم کا نظام اگر آیا تو ریاست کے فلاں مفاد کو زد پہنچے گی۔ ریاست کے مفاد کو زک پہنچے، امتیازی قوانین اور بنیادی حقوق کی یہ باتیں بظاہر خوبصورت عنوانات ہیں، لیکن ان عنوانات کے پردے میں جو گفتگو کی جا رہی ہے، اس پر غور کریں تو بالآخر جو بنیاد نکلے گی اور لنگر جہاں پڑا ہوا ہے، وہ یہی ہے کہ ریاست یا مذہب کو اور مذہب یا زندگی کے بقیہ معاملات کو ایک دوسرے سے الگ الگ ہونا چاہیے۔ میرا مذہب کیا ہے، اس کو آپ کو سروکار نہیں اور آپ کا مذہب کیا ہے، مجھے اس سے سروکار نہیں۔

یہ طرز اسلام کے بنیادی تصور سے متعارض ہے۔ ہماری ساری شناخت ہی مذہب ہے۔ مسلمان کے ہاں ہر اچھائی و برائی کا تعین مذہبی حوالے سے ہوتا ہے۔ اخلاق اور قانون کا تعلق مذہب سے ہے، تہذیب کا تعلق مذہب سے ہے، قانون اور تمدن کی اساس مذہبی عقائد پر ہے، نظام حکومت اور معاشرت کے بارے میں ہدایات مذہبی ذرائع سے ملتی ہیں، معیشت اور تجارت کے اصول و قواعد کے بارے میں رہنمائی مذہب کی بارگاہ سے فراہم ہوتی ہے، غرض کوئی چیز مذہب کے اس جامع اور بھرپور دائرے سے باہر نہیں جو قرآن مجید اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور اعمال کی

صورت میں موجود ہے۔ یہاں تو قانون کا بھی بنیادی حوالہ بالآخر مذہبی کتاب ہے اور دستور کا آخری اور حتمی حوالہ بھی کتاب ہے، جب کہ وہاں یہ چیز ناقابل تصور ہے کہ ایک مذہبی کتاب کا دور جدید کے قانونی، دستوری، سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی معاملات سے کوئی تعلق ہو۔

ہمارے دینی قائدین جزئیات پر تو بہت زور دیتے ہیں، لیکن اس مسئلے کی اصل جڑ پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ علمائے کرام، دینی قائدین اور دینی فکر کے لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ سب سے پہلے یہ اسلوب ذہن نشین کروائیں کہ حق ایک ہے اور اس میں کوئی تفریق دین و دنیا کی بنیاد پر نہیں ہو سکتی۔ جب یہ تفریق ہوگی تو ہوس کی بنیاد پر ہوگی:

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی

ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری

جب معاملات دنیا، دین کی راہنمائی سے آزاد ہوں گے تو پھر انسانی خواہشات اور انسانی شہوات ہی کی بالا دستی ہوگی۔ جب یہ بالا دست طاقت کے احکامات چلیں گے، جیسا کہ آج دنیا میں چل رہے ہیں تو پھر جو کمزور اور مجبور ہے، وہ بتدریج مزید کمزور اور مزید مجبور ہوتا جائے گا۔ روزانہ کمزور سے ایک نیا مطالبہ کیا جائے گا اور بالا دست روزانہ ایک ایک قدم آگے بڑھتا جائے گا تا آنکہ وہ تسلیم کروا لے کہ دین و مذہب الگ الگ چیزیں ہیں اور مذہب کا اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب تک یہ اصول مسلمان تسلیم نہیں کریں گا، اس وقت تک ان کے مطالبات جاری رہیں گے۔ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ، جس نے اکثر و بیشتر مغربی ماحول میں تعلیم پائی ہے اور مغربی یونیورسٹیوں کا پڑھا ہوا ہے، اس میں بڑے ماہر، بڑے اچھے، بڑے مخلص اور محب وطن لوگ ہیں، لیکن مخلص اور محب وطن ہونا کافی نہیں ہوتا جب تک ذہن کی بنیاد درست نہ ہو۔ جب تعمیر میں بنیاد ہی کج ہو جائے تو ساری عمارت کج ہی رہتی ہے:

خشت اول چوں نہد معمار کج

تا ثریا می رود دیوار کج

اس بنیاد کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات کہ قرآن مجید ہر سچائی اور ہر صداقت کا سرچشمہ ہے، اگر تسلیم ہے تو اس کے بعد سب حوالے ختم ہونے چاہییں۔ کسی بڑے سے بڑے انسان کی عقل، تجربہ حتیٰ کہ کسی بڑی سے بڑی تہذیب کی کوئی تہذیبی سچائی یا کلیہ اگر قرآن مجید سے متعارض ہے تو وہ ناقابل قبول ہے۔ جب تک یہ معیار لوگوں کے ذہن نشین نہیں ہوگا، اس وقت تک یہ جزوی مسائل اٹھتے رہیں گے اور لامتناہی سوالات کا سلسلہ جاری رہے گا۔ علمائے کرام کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس بنیادی سوال، جو ایک رویے کا سوال ہے، کے جواب کو پہلے واضح کر دیں اور لوگوں کا ذہن اس معاملے میں صاف کریں۔

دوسری بڑی ذمہ داری جو دور جدید میں علمائے کرام پر خاص طور پر آ گئی ہے، وہ یہ ہے کہ پچھلے چودہ سو سال سے مسلم معاشرے میں ان کا ایک خاص کردار ہے اور وہ کردار اس معاشرے میں متعین ہوا جہاں اسلامی قوانین، اسلامی احکام، اسلامی اخلاق، اسلامی کردار قائم اور جاری وساری تھا۔ اگر ایک چیز اسلامی خطوط پر قائم ہے، معاشرہ اسلامی اساس پر کارفرما ہے، اسلامی قوانین عدالتوں میں نافذ ہیں، لوگوں کی زندگیاں اسلامی ہیں، لوگوں کے علوم وفنون اسلامی ہیں، درس گاہ کا ماحول اسلام کے مطابق ہے، بازار میں کام اسلام کے مطابق ہو رہا ہے، وہاں علمائے کرام کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ جزئیات کا جواب دیں۔ جزوی مسائل اگر کوئی پوچھے تو آپ بتا دیں کہ یہ چیز خریدنا حلال ہے اور وہ چیز خریدنا حرام ہے، یہ کاروبار جائز ہے اور وہ کاروبار ناجائز ہے، فلاں قسم کا لباس مکروہ ہے یا غیر مکروہ ہے۔ جزئیات کے یہ سوال اٹھتے رہتے ہیں اور علمائے کرام جزئیات کا جواب دیتے رہتے ہیں۔ آپ فتاویٰ کی ساری کتابیں دیکھیں، سب جزئیات پر مبنی ہیں۔

آج ہم جس دور میں جی رہے ہیں، اس میں اسلامی معاشرہ بڑی حد تک موجود نہیں ہے۔ اس نظام میں قوانین اسلام کے مطابق نہیں ہیں، اس میں معاشرتی اقدار اسلام سے بڑی حد تک ہٹ گئی ہیں، معیشت کا نظام اسلام کے مطابق نہیں ہے، حلال وحرام کی تمیز بھی کمزور پڑ گئی ہے، یہاں محض جزئیات کا جواب دینا کافی نہیں ہے۔ جزئیات کا جواب تو وہاں دیا جائے گا جہاں کلیات اسلام کے

مطابق ہوں، جزوی خلاف ورزی ہو رہی ہو تو اب اس کی رہنمائی کر دیں۔ جہاں سارے کلیات ہی بدل دیے گئے ہوں، وہاں جزئیات کا جواب دینا کافی نہیں ہے۔ اگر ایک عمارت آپ کے استعمال میں ہے اور فرض کریں کہ آپ ڈیکوریشن کے ماہر ہیں، آپ سے پوچھا جائے کہ لکڑی اس ڈیزائن کی بنواؤں یا اس ڈیزائن کی، اسٹیج اس طرف ہو یا کہ اس طرف تو آپ ان جزوی سوالات کا جواب اپنی عمارت کی بنیاد پر دے سکتے ہیں۔ لیکن خدانخواستہ عمارت ہی گری ہوئی ہو اور پھر کوئی یہ سوال پوچھے کہ کرسی کس ڈیزائن کی ہو اور اسٹیج کس طرف ہو تو یہ غیر متعلق سوال ہوگا اور یہ بحث بڑی حد تک قبل از وقت ہوگی۔ یہ جزوی سوال بعد میں آئے گا، پہلے آپ کلیات کو درست کریں۔

علمائے کرام اس تبدیلی کا احساس فرمائیں۔ یہ اسلوب اب بہت سے معاملات و مسائل میں کافی نہیں کہ آپ کے سامنے اپنے محترم شیخ کے جاری کیے ہوئے فتاوی یا معتمد علیہ اور مستند فتاویٰ کا مجموعہ رکھا ہو اور کوئی سوال آیا، آپ نے جواب دیا اور سمجھا کہ رہنمائی کا کام پورا ہو گیا۔ یہ اسلوب آج کل کی صورت حال کے لحاظ سے کافی نہیں ہے۔ جزئیات کا جواب بھی یقیناً دیا جائے گا اور جو افراد، خاندان اور ادارے اسلام پر کاربند ہیں، ان کو جزئیات کے بارے میں سوال پوچھنے کی ضرورت ہوگی، لیکن اس کے ساتھ کلیات کے معاملات بھی ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔

آج بہت سے لوگ سوال پوچھتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ کے بنیادی اوصاف کیا ہیں؟ خاندان اسلام میں کیسے قائم ہوتا ہے؟ خاندان کے مابین تعلقات کیا ہیں؟ خاندان کس بنیاد پر قائم ہوتا ہے؟ یورپ میں جو خاندان کا ادارہ ٹوٹا ہے تو کیوں ٹوٹا ہے؟ دنیائے اسلام میں جو ٹوٹ رہا ہے تو کیوں ٹوٹ رہا ہے؟ وہ کیا چیز بگڑ گئی ہے جس کی وجہ سے خاندان ٹوٹ رہا ہے؟ ان کلیات کا سوال جب کیا جاتا ہے تو اس کے جواب دینے میں اہل علم سے بالعموم دو غلطیاں ہوتی ہیں جن کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اسلام کی کلیات کا گہرا اور مربوط و متکامل علم حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ تعلیم ایسی ہے جو اکثر و بیشتر جزئیات پر مشتمل ہے۔ پھر کلیات کے لحاظ سے تین چیزوں میں بہت سے لوگ فرق نہیں کرتے۔ کچھ چیزیں وہ ہیں جو قرآن کی نصوص ہیں

جن کے بارے میں دو رائے نہیں ہوسکتیں۔ اسی طرح کچھ چیزیں وہ ہیں کہ جو احادیث صحیحہ اور سنت ثابتہ یا متواترہ سے ثابت ہیں، وہ بھی نصوص کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ وہ ہیں جو اصول فقہ کی اصطلاح میں قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں اور دین کی اساسات ہیں۔ یہ ہیں کلیات جن کی بنیاد پر معاشرے کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کلیات کی کسی تعبیر پر امت کا اتفاق ہے تو یہ تعبیر بھی انھی کا حصہ ہے، لیکن اس کے بعد کسی ایک یا دو تین فقہا کی جو اجتہادی آرا ہیں، وہ کلیات دین نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں اگر اس دور کے اہل علم یہ فیصلہ کریں کہ ہمارے لیے یہ رائے یا فلاں تعبیر یا فلاں اجتہاد زیادہ موزوں ہے، اس لیے آج کے دور میں ہم اس کو اختیار کرتے ہیں تو اس کو بھی آپ کلیات میں شامل کرلیں، لیکن ان متفقہ امور کے بعد جو جزوی اور انفرادی آرا ہیں، مثلاً امام شافعیؒ کی ایک رائے ہے، امام غزالیؒ کی ایک رائے ہے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ایک رائے ہے، ضروری نہیں کہ وہ رائے آج ہمارے لیے اسی طرح اہمیت رکھتی ہو جیسے قرآن پاک کا حکم اہمیت رکھتا ہے۔ دونوں کو ایک سطح پر رکھیں گے تو قباحتیں پیدا ہوں گی۔ قرآن پاک کو جو دوام حاصل ہے، وہ مثلاً امام غزالیؒ کی رائے کو حاصل نہیں ہے۔ سارے احترام کے باوجود دوام امام ابوحنیفہؒ یا کسی اور کی رائے کو بھی حاصل نہیں ہے۔ وہ دوام تو اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

احکام شریعت کی اس درجہ بندی اور اس فرق مراتب کا خیال نہ رکھا جائے تو بڑی قباحت پیدا ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب آپ یورپ یا امریکہ تشریف لے جائیں، وہاں ایک عالم ہندوستان سے آئے ہوئے ہیں، ایک سعودی عرب سے، ایک مصر سے۔ امریکہ کا ایک سادہ سادھا آدمی جس نے کل اسلام قبول کیا ہے، ایک اس کو ایران کی بتارہا ہے، ایک توران کی، ایک کہیں اور کی بتارہا ہے اور کوئی یہ نہیں سوچ رہا کہ یہ بے چارہ نہ شافعی ہے نہ حنبلی، نہ حنفی ہے نہ مالکی۔ یہ کچھ نہیں۔ یہ تو مسلمان ہے، یہ تو ذہنی اعتبار سے گویا ۲۵ ہجری میں مسلمان ہوا ہے۔ اس کو آپ ان چیزوں میں کیوں الجھاتے ہیں، پھنساتے ہیں؟ اس پر کیوں آپ فقہ حنفی مسلط کر رہے ہیں؟ کیوں فقہ شافعی یا فقہ اہل حدیث یا کوئی اور تعبیر زبردستی اس پر مسلط کر رہے ہیں؟ پھر اس سے بڑھ کر یہ ہوتا ہے کہ تم

ہاتھ یہاں یا وہاں باندھو، اذان ہو تو انگوٹھا چومو یا مت چومو۔

اس نومسلم کو ابھی آپ کچھ نہ کہیے۔ اس کو نماز پڑھنا سکھائیے جو کہ اساس دین ہے۔ جب وہ نماز پڑھنا سیکھ لے گا تو جس معاشرے میں اس کی تربیت ہوگی اور جس مسلم ماحول کا وہ حصہ بنے گا، بتدریج وہ خود ہی اس معاشرے کی صورت اختیار کر لے گا۔ پھر جب وہ آپ سے مسائل پوچھے تو آپ اسے مسائل بتائیں۔ فقہی اختلاف میں اس کو نہ لے جائیں، زیادہ سے زیادہ اپنا مسلک بتا دیں۔ ایک حد تک بھی یہ گوارا ہے کہ یہ بھی فقہا کے اقوال ہیں، یہ بھی دین کے شارحین کے ارشادات ہیں، اس حد تک بھی چلیے مان لیں، لیکن اس سے بھی آگے بڑھ کر کچھ چیزیں ہیں جو مختلف مسلم ممالک کے مقامی رواج ہیں۔ کسی رواج کا اسلام کے مطابق ہونا اور چیز ہے اور اسلام ہونا اور چیز۔ ایک رواج جو اسلام سے متعارض نہیں ہے، وہ قابل قبول ہے، لیکن اپنے اس مقامی رواج کو آپ دوسرے ممالک کے مسلمانوں پر زبردستی مسلط کریں، یہ اسلام کا تقاضا نہیں۔

آپ کسی شیخ کے مرید ہیں، ان کا اللہ کی بارگاہ میں بہت اونچا مقام ہے۔ ان کا کچھ ذاتی ذوق تھا، آپ کا جی چاہے تو اس ذوق کی پیروی کریں نہیں جی چاہتا تو مت کریں، لیکن پیغمبر کے علاوہ کسی کے ذوق کو زبردستی دوسروں سے منوانا، یہ شریعت کا نہ تقاضا ہے اور نہ حکم ہے۔ مثلاً آپ کے بزرگ ایک خاص انداز میں عمامہ باندھتے ہیں۔ آپ کو ان سے محبت ہے تو آپ اس طرح عمامہ باندھیے، لیکن جب آپ لوگوں سے یہ کہیں کہ اس طرح کا عمامہ باندھنا دین کا حکم ہے تو یہ چیز قابل اعتراض ہو جاتی ہے اور اس سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ دین کا تقاضا نہیں ہے۔ دین یہ نہیں کہتا کہ فلاں بزرگ کی طرح عمامہ باندھو یا فلاں بزرگ کی طرح کا لباس پہنو۔ ہاں اگر کوئی مرد سونے کی انگوٹھی استعمال کرتا ہے تو اس کی نصوص میں ممانعت ہے، اس لیے اس کو روکیں۔ کوئی عورتوں جیسا لباس پہنتا ہے تو اس کو بھی روکیں، کیوں کہ اس کی شریعت میں ممانعت ہے۔

یہ تین چیزیں ہیں جن میں عام طور پر لوگ تفریق نہیں کرتے۔ الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں اور ان کو اپنی اپنی سطح پر ہی رہنا چاہیے۔ سب سے پہلے قرآن وسنت کی نصوص ہیں جو دائمی ہیں، جو امر یکہ میں

بھی رہیں گی، برطانیہ میں بھی، مصر، بنگلہ دیش اور ہر جگہ رہیں گی۔ نصوص کے بعد ائمہ کرام کے اجتہادات کا درجہ ہے۔ یہ اجتہادات اس ماحول کے مطابق ہیں جس میں اس ماحول سے مانوس لوگ رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں امام ابوحنیفہؒ کے اجتہادات سے لوگ مانوس چلے آرہے ہیں۔ سالہا سال سے یہاں کے لوگ امام ابوحنیفہؒ کی اور انڈونیشیا اور ملائیشیا کے لوگ امام شافعی کی تقلید کرتے آرہے ہیں اور ان کے اجتہادات کو دین کی درست اور صحیح تعبیر وتشریح مان کر ان پر عمل کرتے آرہے ہیں، لیکن اس ماحول سے نکل کر آپ امریکہ جائیں اور امریکہ کے نومسلم کو زبردستی کہیں کہ تم ہاتھ یہاں باندھو، وہ کہے کہ میں یہاں باندھتا آرہا ہوں، آپ کہیں کہ آپ کی نماز نہیں ہوئی۔ اب وہ بے چارہ جو دس سال سے یہاں ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتا چلا آرہا ہے، آپ نے اس کی نماز کو شک میں ڈال دیا۔ کسی مالکی امام کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے کے باعث وہ ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتا ہے تو آپ نے کہا کہ اس طرح تو نماز نہیں ہوتی۔ اب وہ غریب پریشان ہے کہ میں کیا کروں؟ میری نماز ہوئی کہ نہیں؟

یہ ایسی چیزیں ہیں جن کو ان کی حدود میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک دفعہ مجھے بقرعید پر انگلستان کے ایک مسلم علاقے میں کچھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ طے ہوا کہ سارے مسلمان ایک جگہ پر عید ادا کریں گے۔ اب ایک خاص علاقے کے لوگوں کا اصرار تھا کہ عید منانے کا طریقہ یہ ہونا چاہیے، اس لیے کہ بچپن سے ہم اسی طرح مناتے چلے آرہے ہیں اور ہمارے آباواجداد اسی طرح کرتے آرہے ہیں۔ ایک دوسرے علاقے کے مسلمانوں کا اصرار تھا کہ ہم ایسے کریں گے۔ وہاں کے مقامی مسلمان تھے جن میں ایک شخص ایسا تھا جس کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان سے اچھا مسلمان شاید زندگی میں نہیں دیکھا اور اگر دیکھا ہے تو بہت تھوڑے ہوں گے۔ وہ نومسلم انگریز اور اس کا بیٹا حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اسلام کیا ہے؟ کہنے لگے کہ آپ بتائیں کہ ہم کیسے عید منائیں؟ آپ جیسے کہیں گے، ہم ویسا کریں گے۔ ترک کہتے تھے ایسے کرو، پاکستانی کہتے تھے نہیں ایسے کرو، مصری کہتے تھے ایسے کرو۔ حالانکہ عید کا حکم شریعت میں ہے، شریعت کچھ نہیں کہتی۔

ہمارا ایک رواج ہے جو شریعت کے مطابق ہے تو قابل قبول ہے اور شریعت سے متعارض نہیں ہے تو بھی قابل قبول ہے، لیکن وہ دین اور شریعت نہیں ہے۔ وہ بس ہمارے یہاں کا رواج ہے۔

اس لیے دین کے جو کلیات اور قرآن و سنت کی جو نصوص ہیں، وہ دین کی دعوت کا موضوع ہیں۔ باقی چیزیں دعوت کا موضوع نہیں ہیں۔ وہ تحقیق، رائے، فتویٰ اور اجتہاد اور ایک ذاتی ذوق کا موضوع ہیں، ان کو دعوت کا موضوع نہیں بنانا چاہیے۔ دعوت کا موضوع وہ چیزیں ہیں جو قرآن پاک، سنت اور دین میں متفق علیہ ہیں اور وہ چیزیں صحابہ کرامؓ سے چلی آرہی ہیں۔ جو چیزیں صحابہ کرام میں متفق علیہ نہیں تھیں، وہ دین نہیں ہوسکتیں۔ اگر آپ کہیں کہ ان اختلافی آرا میں سے کوئی ایک رائے ہی دین ہے تو جو صحابہ اس رائے سے اختلاف کرتے تھے، گویا نعوذ باللہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ جو چیز تابعین میں متفق علیہ نہیں تھی، وہ دین نہیں ہے۔ وہ اجتہاد ہے، رائے ہے اور فتویٰ ہے۔ اگر آپ اسی رائے کو دین کہیں تو دوسری رائے کو کیا کہیں گے؟

تیسری اور آخری چیز جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اور خاص طور پر جو بنیادی طور پر دین کا حوالہ رکھتے ہیں، وہ دوسروں کے بارے میں رائے دینے میں بعض اوقات جلد بازی کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں طرح طرح کے عقائد موجود ہیں۔ مسلمانوں کا جو تصور علم ہے، وہ اکثر و بیشتر عامۃ الناس کے لیے مانوس نہیں ہے۔ وہاں اصل بنیاد کو نظر انداز کر کے جب آپ کسی جزوی مسئلے پر رائے یا رویہ اختیار کریں گے تو وہ دین سے مزید دور ہوگا۔ ایسے بے شمار لوگ ملیں گے جو مسلمانوں سے ہمدردی رکھتے ہیں، اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور بحیثیت مجموعی اگر ان سے کہا جائے کہ آپ اسلام کو مانتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہاں مانتے ہیں۔ اسلام کے خلاف کوئی بات ہو تو وہ دکھ بھی محسوس کرتے ہیں، لیکن کسی جزوی معاملے میں آپ کی بات نہیں مانتے تو ایسے لوگوں کے بارے میں جلد بازی میں کوئی فتویٰ صادر نہ کریں۔ ان کے تامل یا انکار کو اسلام کے بارے میں تامل یا اسلام کا انکار قرار نہ دیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دین کے نام پر ہم جو کچھ انھیں بتا رہے ہیں، اس میں یہ تمام چیزیں یعنی

نصوص، اجتہادات، انفرادی بزرگوں کا ذوق اور کسی مقامی علاقہ کا اسلامی رواج سب کچھ شامل ہے۔اب اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ میں اس رواج کو نہیں مانتا، یہ غلط رواج ہے تو آپ اس کو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ اتنا ہی اچھا مسلمان ہو سکتا ہے جتنا کوئی اور۔ اسی طرح اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں بزرگ کی پگڑی کا اسٹائل بڑا فضول ہے، میں نہیں مانتا تو محض اتنی سی بات پر اس کو دین سے دور قرار نہ دیں، اس لیے کہ کسی بزرگ کی پگڑی کے اسٹائل کو فضول کہنے سے آدمی نہ فاجر ہوتا ہے نہ فاسق اور نہ کچھ اور۔ اس حد تک بھی درست ہے کہ وہ کہے کہ میں امام ابوحنیفہؒ کے اجتہاد کو نہیں مانتا۔ آپ دلائل سے امام صاحب کے اجتہاد کی مدافعت تو ضرور کریں مگر گستاخی اور جہالت کا کوئی عنصر نہ آنے پائے۔ یہ قابل اعتراض بات ہے۔

البتہ اگر کوئی شخص نصوص کا انکار کرے تو وہ مسئلہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی اصل ضرورت تعلیم اور تفہیم کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ جو چیزیں اسے بتائی جاتی ہیں، بظاہر وہ غلط محسوس ہوتی ہیں۔ وہ اس لیے غلط معلوم ہوتی ہیں کہ وہ شریعت کا حکم ہی نہیں ہے۔ وہ شریعت کے حکم کے طور پر اس کو سمجھتا ہے۔ اس لیے اس میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کریں، بلکہ یہ محسوس کریں کہ چونکہ اس کی دینی بنیاد کمزور ہے، اس بنیاد پر جو عمارت کھڑی ہے، اس کی کبھی ایک اینٹ گرتی ہے اور کبھی دوسری۔ تو کسی ایک اینٹ کے گرنے کی وجہ سے اس فرد پر قدغن نہ لگائیں۔ اس اینٹ کو کچھ نہ کہیں، عمارت کو دیکھیں کہ اس کی بنیاد درست ہے یا کہ نہیں۔ بنیاد کو درست کرنے کی کوشش کریں۔ جزوی اصلاحات پر اتنا زور دینا کہ اصل عمارت اور بنیاد نظر انداز ہو جائے، درست رویہ نہیں۔

# مسلکی اختلاف اور اس کی حدود

پاکستان میں فرقہ وارانہ اختلاف رائے اور مسلکی آرا اور نظریات کا تنوع شروع سے رہا ہے۔ مسلک کا وجود فی نفسہ مذموم نہیں، کیوں کہ یہ آزادیٔ رائے کا لازمی نتیجہ ہے۔ آزادیٔ رائے کا حق دنیا کے ہر مہذب نظام میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اسلام وہ پہلا مذہب ہے جس نے اختلاف رائے کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ اس کو ایک پسندیدہ چیز قرار دیا ہے۔ مسالک کا تنوع اور رائے کا صحت مندانہ اختلاف اسلام کی بہت بڑی خوبی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایات میں اہل علم کے اختلاف کو رحمت قرار دیا گیا ہے۔

صرف مذہبی عقائد ہی نہیں، بلکہ علم و دانش کے ہر شعبہ میں آرا کا اختلاف ایک حقیقت ہے اور یہ اتنا ہی پرانا ہے جتنی انسانی فکر کی تاریخ۔ یونانی فلسفہ ہو یا قدیم ہندو ریاضی، جاہلی عربی شاعری ہو یا بائبل کے مذہبی تصورات، اختلاف رائے اور اس کی بنیاد پر مسالک کا وجود ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔

اسلام نے اس اہم انسانی حقیقت کو روز اول سے نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس کو صحت مندانہ اور تعمیری بنیادوں پر فروغ دینے کے لیے ایک فکری اور علمی بنیاد بھی فراہم کی۔ اسلامی عقائد کی رو سے کسی قوم کے بنیادی تہذیبی نظریات اور مذہبی تصورات ناقابل تغیر ہوتے ہیں۔ اسلامی اصطلاحات میں جن امور کو عقائد اور نصوص قطعیہ کہا گیا ہے، وہ اسلامی معاشرہ کی فکری حد بندی کرتے ہیں۔ ان کی وجہ سے اسلامی نظریے کو تسلسل اور دوام عطا ہوتا ہے، ان کی وجہ سے اسلام کے امتیازی اوصاف کو تحفظ ملتا ہے اور انھی کی وجہ سے اسلام نے مشکل سے مشکل حالات میں اپنے تشخص کو برقرار رکھا ہے۔ اسلامی تعلیم کی رو سے آزادیٔ فکر اور اختلاف رائے کا دائرہ عقائد اور نصوص قطعیہ سے ت

دوام اور قطعیت پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ یہ دونوں چیزیں بڑی حد تک اس دائرے سے ماورا ہیں، البتہ اس دائرے سے باہر اجتہاد اور اجماع کا ایک میدان ہے جس میں اختلاف رائے کی اتنی گنجائش ہے کہ کسی اور مذہب میں اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ اجتہاد و اجماع اور قیاس و استدلال کی بنیاد پر اسلامی تاریخ کے بہترین دماغوں نے اسلامی فکر اور تہذیب کو وسعت بخشی۔ نہ صرف خالص مذہبی خیالات اور تصورات کے باب میں بلکہ قانون، فلسفہ، عقلیات، سیاسیات، طب، سائنس اور نفسیات بلکہ صرف و نحو اور ادبیات میں بھی مختلف مکاتب فکر کا وجود تاریخ میں روز اول سے رہا ہے۔ ان بے شمار علمی اور فکری رجحانات کی موجودگی نے اسلام کے فکری سرمایے میں وسعت پیدا کی اور جزیرۂ عرب کے مختلف قبائل کے علاوہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والی قریب قریب ہر قوم کے مثبت اور تعمیری عناصر کو اپنے اندر سمولیا۔

افکار و خیالات کا یہ اختلاف اور نظریات و آرا کا یہ تنوع بڑی مثبت اور خوش آئند چیز ہے، بشرطیکہ یہ اپنی حدود کے اندر رہے۔ جب یہ اختلاف اپنی فطری حدود سے نکلتا ہے تو یہ امت میں افتراق اور تشتت کا باعث بنتا ہے۔ یہ افتراق اگر جاری رہے تو تحزب کا اور تشتت اگر جاری رہے تو تشدد کا موجب بنتا ہے۔ افسوس کہ ہمارے ملک میں مختلف اسباب کی بنا پر ایسا ہی ہوا۔ وہ مسالک جنھوں نے مل کر ۱۸۵۷ء میں انگریز کے خلاف آزادی کی جنگ شروع کی تھی، جنھوں نے مل کر تحریک خلافت اور دوسری دینی و ملکی تحریکات میں حصہ لیا تھا اور جن کی غالب اکثریت نے بیک آواز قیام پاکستان کے لیے قائداعظم محمد علی جناحؒ کا ساتھ دیا تھا، مختلف اسباب کی بنا پر اپنی وحدت کو برقرار نہ رکھ سکے۔ وہ یہ بھول گئے کہ اگر جماعت میں کثرت نہ ہو تو وہ استبداد اور کلیت پسندانہ رجحانات اختیار کر لیتی ہے اور کثرت اگر وحدت کا رشتہ چھوڑ دے تو تباہی اس کا مقدر ہوتی ہے۔

اس وقت یہ بحث غیر ضروری ہے کہ مختلف مسالک میں تحزب اور تشدد کیسے پیدا ہوا، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ۸۰ء کے عشرے میں اس کے جراثیم پیدا ہوئے اور ۹۰ء کے عشرے کے آغاز میں اس تحزب اور تشدد نے ایک عفریت کی شکل اختیار کر لی۔ یہ پورا زمانہ مذہبی تشدد اور دہشت گردی کا دور ہے۔

اس کے اسباب نہ صرف اندرون ملک کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی پالیسیوں میں تلاش کیے جانے چاہییں بلکہ خطے کی دیگر قوتوں کی پالیسیاں بھی اس کو ہوا دینے کا سبب رہی ہیں۔ مثال کے طور پر مخصوص مذہبی عقائد کی اشاعت میں غیر ضروری سختی، بعض مذہبی سیاسی تصورات کو بزور بازو برآمد کرنے کی کوشش اور بعض اقلیتی خیالات اور تصورات کی غیر ملکی سرپرستی، یہ وہ چیزیں ہیں جنھوں نے صورت حال کو کشیدہ بنایا جس کے نتیجے میں متعدد تشدد پسند گروہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اگر فقہی اور کلامی اختلافات کو ان حدود کے اندر رکھا جاتا جو شریعت نے متعین کی ہیں تو اس کی گنجائش نہ ہوتی اور نہ اختلافات کسی تشدد اور منافرت کا ذریعہ بنتے۔ ہمارے ملک میں افسوس کی بات یہ ہے کہ دعوت، تبلیغ، فتویٰ، ذوق اور افتادطبع، ان سب چیزوں کے مابین اس طرح خلط مبحث ہوا ہے کہ ان سب کے تقاضے مجروح ہو کر رہ گئے ہیں۔

یہ بات ہم میں سے ہر ایک کو یاد رکھنی چاہیے کہ جہاں تک دین کی دعوت کا تعلق ہے تو وہ صرف ان اساسات اور ضروریات دین تک محدود رہنی چاہیے جو قرآن مجید کی نص قطعی، حدیث متواتر اور سنت ثابتہ کے ذریعے سے ہم تک پہنچی ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے جہاں جہاں دین کی دعوت پہنچائی، انھوں نے امور تک اپنی کاوشوں کو محدود رکھا۔ بہت کے مسائل کے بارے میں صحابہ کرامؓ کے مابین بھی فقہی اور کلامی اختلاف رائے موجود تھا جس سے حدیث اور فقہ کے طلبہ بخوبی واقف ہیں۔ نہ صرف صحابہ کرامؓ بلکہ تابعین اور تبع تابعین اور دیگر ائمہ مجتہدین اور ائمہ فقہ، کبار صحابہ کی آرا سے اختلاف کرتے آئے ہیں، لیکن ان اختلافی مباحث کو انہوں نے نہ تو کبھی عام دعوت تبلیغ کا موضوع بنایا اور نہ غیر ضروری طور پر ان مباحث کو عامۃ الناس کی مجالس میں زیر بحث لائے۔ یہ امور فتوے کا موضوع ہیں اور صرف اس وقت سامنے لائے جاتے ہیں جب کسی (مسلم) فرد یا گروہ کو ان امور میں فتویٰ لینے کی کوئی حقیقی اور واقعی ضرورت پیش آئے۔ فتوے کا اصول یہ ہے کہ وہ مفتی کی طرف سے ازخود نہیں دیا جاتا بلکہ کسی مستفتی کے استفتا کے جواب میں جاری کیا جاتا ہے۔ فتوے کے دائرۂ کار میں جو مسائل آتے ہیں، وہ دعوت و تبلیغ کے مسائل سے قطعاً مختلف ہیں۔ جب بھی مسائل فتویٰ کو

دعوت وتبلیغ کا اور مسائل دعوت وتبلیغ کو فتویٰ کا موضوع بنایا جائے گا، امت میں غیر ضروری تشویش اور تحزب پیدا ہوگا۔

فتوے سے اگلا مرحلہ تحقیق کا ہے۔ تحقیق کے موضوعات فتوے کے موضوعات سے مختلف ہیں۔ تحقیق ایک محقق کی ذاتی کاوش کے نتائج اور ثمرات ہیں۔ تحقیق سے دلچسپی صرف محققین ہی کو ہوسکتی ہے اور وہی اس کے بارے میں کوئی رائے دینے کے اہل ہیں۔ تحقیق ہی کی بنیاد پر کسی خاص شعبہ علم میں کوئی مکتب فکر جنم لے سکتا ہے۔ کسی غیر محقق یا عامی کا اس میں دخل دینا یا محض گروہی جذبات، عصبیت یا ایسے ہی دوسرے غیر علمی اور غیر تحقیقی محرکات کی بنیاد پر اپنے آپ کو کسی خاص نقطہ نظر کا موید یا حامی قرار دینا بھی بعض اوقات مسائل ومشکلات کا سبب بن جاتا ہے۔ فقہاء متقدمین نے اس صورت حال کا کافی پہلے اندازہ اور ادراک کر لیا تھا۔ ان کا وضع کردہ یہ اصول قدیم کتابوں میں ملتا ہے کہ العامی لا مذهب له، یعنی کسی غیر محقق اور عامی کا کسی مکتب فکر سے وابستگی ظاہر کرنا بے معنی چیز ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی ایسا شخص جو فلسفے کی اصطلاحات سے بھی ناواقف ہو، وہ اپنے کو مشائی یا اشراقی قرار دے اور ان لوگوں کے خلاف شمشیر برہنہ لے کر میدان کارزار میں نکل آئے جو دوسرے مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہوں یا کوئی ایسا شخص جو عربی زبان کے صرف ونحو سے نابلد ہو اور کسی علاقائی یا دوسری عصبیت کی بنا پر اپنے آپ کو کوفی یا بصری کہلوانے پر اصرار کرے اور اس کی بنیاد پر کسی جتھابندی میں شریک ہو۔

جتنا کسی عامی کا اپنے آپ کو مشائی، اشراقی، کوفی یا بصری قرار دینا مضحکہ خیز ہے، اتنا ہی یہ بات بھی مضحکہ خیز ہے کہ ایک غیر محقق عامی خود کو اشعری یا ماتریدی قرار دے یا فقہی معاملات کی ابجد کی واقفیت حاصل کیے بغیر خود کو حنفی یا شافعی قرار دیے جانے پر اصرار کرے اور اس کی بنیاد پر غیر ضروری عصبیت یا جتھابندی میں شریک ہو۔ یہ سب امور تحقیق کے موضوعات ہیں جن سے صرف محققین ہی کو دلچسپی ہوسکتی ہے اور محققین تک ہی ان امور کو محدود رہنا چاہیے۔

تحقیق کے بعد اگلا درجہ مشرب، ذوق اور افتاد طبع کے مراحل کا آتا ہے جہاں تحقیق وافتا کے

دائرے کے اندر رہتے ہوئے مختلف اہل علم اوراہل ذوق اپنے اپنے مزاج اورافتادطبع کے مطابق کام کرتے ہیں۔اسلامی شریعت میں اتنی جامعیت موجود ہے کہ ہر ذوق اور ہر مزاج کے انسان کو اپنے اندر سمو لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔شریعت کا یہ مطالبہ ہرگز نہیں ہے کہ لوگ اپنے ذاتی ذوق، مزاج اورافتادطبع کو بالکلیہ ختم کردیں۔ان سب امور کوافراد کی زندگیوں میں باقی رکھنے اوران کوترقی دینے کی پوری گنجائش اسلامی شریعت میں موجود ہے۔صحابہ کرام کو دیکھیے،ان میں ایسے حضرات بھی ملتے ہیں جومختلف معاملات کو خالص عقلی اور غیر جذباتی پیمانوں پر پرکھنے کے عادی تھے۔اس کے برعکس ایسے صحابہ کرامؓ کی بھی کمی نہ تھی جومختلف معاملات کو بڑے عاشقانہ اور والہانہ انداز میں دیکھتے اوراسی انداز میں فیصلہ کرتے تھے۔

ذوق،افتادطبع اورمزاج کے اس فرق اور تنوع کی وجہ سے اہل علم کے انداز تحقیق اوراہل تزکیہ وارشاد کے طرز تربیت میں بھی فرق واقع ہوجاتا ہے۔اس طرح کے اختلاف یا فرق کا وجود صرف اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت کے عمومی اورجامع نظام میں متنوع قسم کی چیزوں کو سمو لینے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔شریعت ان میں سے ہر ذوق اورمزاج کو اپنی حدود وشرائط کے مطابق قبول کرتی ہے،لیکن اس میں کسی بھی ذوق یاافتادطبع کو کسی شخص کے لیے لازمی یاواجب الاتباع ہرگز قرار نہیں دیتی۔لازمی اورضروری قرار دینا تو دور کی بات ہے،ان میں سے کسی ایک ذوق یارویے کو دوسرے کے مقابلے میں قابل ترجیح قرار دینااوردوسروں سے منوانا بھی شرعاً پسندیدہ نہیں۔

صحابہ کرامؓ کے طرز عمل سے اس توازن کی نشان دہی ہوتی ہے جواس معاملے میں مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیے۔صحابہ کرامؓ میں جہاں حضرت عبداللہ بن عمر اورحضرت عبداللہ بن مسعود جیسے عاشقانہ مزاج رکھنے والے فدائی شامل تھے،وہاں ان میں حضرات شیخین جیسی شخصیتیں بھی موجود تھیں جن کے فیصلے خالص عقل وشریعت کی بنیاد پر ہوا کرتے تھے اورکسی قسم کے جذبات یا شخصی احساسات کوان میں دراندازہونے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں رویوں کی بیک وقت تحسین وتصویب فرمائی ہے۔اس ضمن میں سب سے نمایاں اوردلچسپ مثال بنی قریظہ

کی گڑھی میں نماز عصر کی ادائیگی کے حکم کی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خندق کے خاتمے کے فوراً بعد حکم دیا کہ لشکر اسلام میں شریک تمام سپاہی فوری طور پر بنی قریظہ کی گڑھی کی طرف روانہ ہو جائیں اور اس کا محاصرہ کرلیں تاکہ یہودیوں کو ان کی غداری کی فوری سزا دی جا سکے۔ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات ارشاد فرمائی، وہ یہ تھی کہ تم میں سے کوئی شخص ہرگز ہرگز بنی قریظہ کی گڑھی میں پہنچے بغیر عصر کی نماز نہ پڑھے۔ اس ارشاد گرامی کے مطابق صحابہ کرامؓ کے دستے روانہ ہو گئے اور بنی قریظہ کی گڑھی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ ابھی بنی قریظہ کا علاقہ کافی دور تھا کہ عصر کا وقت تنگ ہونا شروع ہو گیا اور صحابہ کرام کو یہ یقین ہو گیا کہ غروب آفتاب سے پہلے بنی قریظہ کے علاقے میں پہنچنا ممکن نہیں۔ اب یہاں صحابہ کرامؓ کے مابین ایک اختلاف رائے سامنے آیا۔ کچھ حضرات کا خیال تھا کہ بنی قریظہ کے علاقے میں نماز عصر ادا کرنا فی نفسہ مقصود نہ تھا، بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہاں پہنچنے میں جتنی جلدی ممکن ہو، اس کی کوشش کی جائے۔ اس لیے اگر غروب آفتاب سے پہلے نماز عصر کے وقت کے اندر اندر وہاں پہنچنا ممکن نہیں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نماز عصر قضا کر دی جائے۔ جو حضرات صحابہ کرامؓ اس رائے کے حامی تھے، انہوں نے عصر کی نماز بروقت راستے ہی میں ادا کر لی اور بنی قریظہ کے علاقے میں پہنچنے کا انتظار نہ کیا۔ بظاہر ان حضرات نے ایک صریح حکم کی خلاف ورزی کی اور اپنی ذاتی رائے سے ایک ایسی چیز طے کر لی جو بظاہر حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایات سے متعارض تھی۔ اس کے برعکس صحابہ کرام کی ایک دوسری جماعت تھی جس نے مذکورۂ بالا رائے سے اختلاف کیا۔ انہوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے واضح اور دوٹوک ہدایات آ جانے کے بعد اب ہمارے لیے اپنی ذاتی رائے پر عمل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہم نماز عصر بنی قریظہ کے محلے میں جا کر ہی ادا کریں گے، چاہے وہاں پہنچنے میں ہمیں آدھی رات ہو جائے۔ ان حضرات نے ہدایات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر پر عمل کیا اور عصر کی نماز قضا کر دی۔ بعض روایات کے مطابق مغرب بھی قضا ہوئی اور ان حضرات نے رات گئے عصر، مغرب اور عشا کی نمازیں ایک ساتھ بنی قریظہ کے

علاقے میں پہنچ کر ادا کیں۔

اگلے روز دونوں جماعتوں نے اپنا اپنا نقطہ نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور حضور سے اس کی تصویب و تصحیح کے خواہاں ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تصویب فرمائی اور دونوں کے نقطہ نظر کو حق بجانب قرار دیا۔

اس مثال سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ شریعت کے کسی حکم کو سمجھنے اور اس کی تعبیر و تشریح کرنے میں دیانت داری سے اختلاف رائے کی پوری پوری گنجائش موجود ہے اور حکم شرعی کی تفسیر و تشریح میں کسی شخص کی افتادِ طبع، مزاج اور رویے کی گہری تاثیر ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا مثال میں اول الذکر حضرات نے حکم نبوی کی تفسیر خالص عقلی اور منطقی انداز میں کی جبکہ موخر الذکر کی تفسیر کا انداز عاشقانہ اور والہانہ نوعیت کا ہے۔

اس انداز کے اختلافات ہر دور میں رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔ بزرگان دین اور اکابر اسلام میں بھی اس طرح کے اختلاف ذوق اور اختلاف مزاج کی مثالیں ملتی ہیں جس کے اثرات ان کے دینی رویے اور روحانی انداز تربیت پر بھی پڑتے ہیں۔ مسلمانوں کا طریقہ روز اول سے یہی رہا ہے کہ عامۃ الناس میں سے جس کو جس بزرگ اور دینی شخصیت کے ذوق اور مزاج سے ہم آہنگی محسوس ہوئی، وہ ان کے حلقے سے وابستہ ہو گیا۔ ان حضرات کے آپس کے اختلاف مزاج اور اختلاف ذوق کی کم و بیش وہی نوعیت تھی جو ایک باپ لیکن مختلف ماؤں کی اولادوں میں عموماً پائی جاتی ہے۔ اس معاملہ میں ان کے طرز عمل کی عکاسی اس عرب شاعر کے شعر میں ہوتی ہے جس نے کہا تھا:

عباراتنا شتی و حسنك واحد

و كل الی ذاك الجمال يشير

''گو ہمارے الفاظ مختلف ہیں، لیکن یہ سب آپ ہی کے حسن کا چرچا کر رہے ہیں۔''

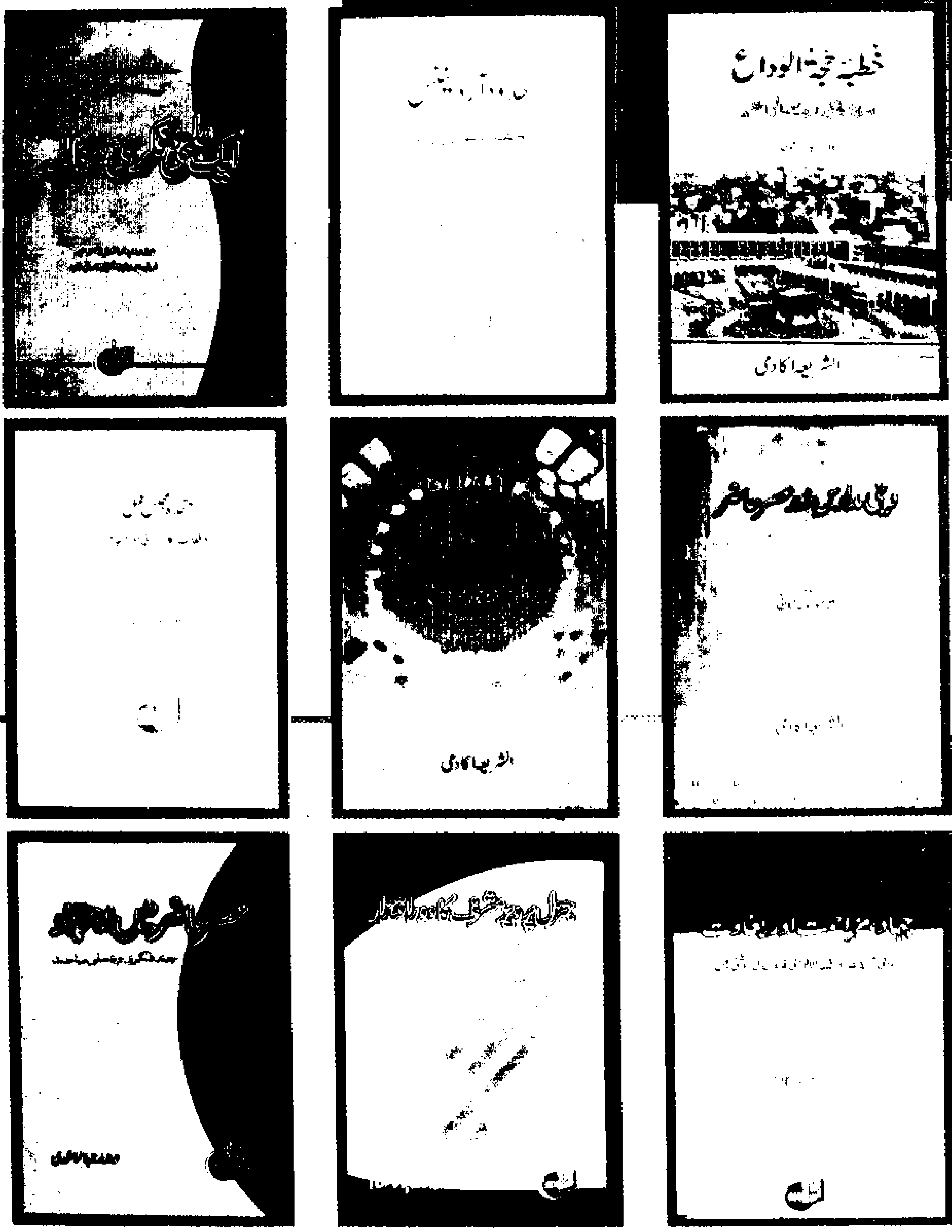
ہمارے ہاں اکثر و بیشتر کم علمی اور کم فہمی کی وجہ سے اور کسی حد تک دوسرے سیاسی اور مادی محرکات و عوامل کی وجہ سے اس اختلاف کو نمایاں کیا گیا اور اس کو وہ اہمیت دے دی گئی جو شریعت میں اس کو

ہرگز حاصل نہیں اور مسلمانوں میں کبھی بھی حاصل نہ تھی۔ شروع شروع میں یہ چیزیں تقابلی گفتگوؤں کے انداز میں سامنے آئیں۔ پھر ہر شخص نے اپنے پسندیدہ بزرگان دین کے طرز عمل کو معیاری اور دوسرے بزرگان دین کے طرز عمل کو غیر معیاری قرار دے دیا اور ہوتے ہوتے یہ چیزیں باہمی تنازعات اور تحزب کا ذریعہ بن گئیں اور یوں مجتہدین کی اجتہادی آرا ضروریات دین قرار پائیں، محققین کی انفرادی تحقیق کو نصوص شریعت جتنی اہمیت دے دی گئی اور بزرگوں کے شخصی ذوق اور رجحانات کو مسلکوں کی شکل میں منظم کرلیا گیا۔

یوں تو یہ آفت انگریزی دور میں ہی پلی اور بڑھی، انگریزی استعمار کی مصلحتوں نے ہی اسے مہمیز دی اور انگریز نے ہی اس چیز کو مسلمانوں کی قوت کو کمزور کرنے کے لیے استعمال کیا، لیکن پاکستان بننے کے بعد بالخصوص ۱۹۷۰ء کے اوائل سے یہ سارے مسلکی اختلافات انتخابی میدان میں داخل ہوگئے، انتخابی رنجشوں نے مسلکی اختلافات کی زبان اور محاورہ اپنایا اور یوں بتدریج یہ چیز مسلمانوں کو تقسیم در تقسیم کرنے کا ایک خودکار ذریعہ بن گئی۔ رہی سہی کسر اس اختلاف میں غیر ملکی عناصر کی دلچسپی نے پوری کردی۔ بیرون پاکستان کی متحارب قوتوں نے اپنے آپس کے اختلافات کو پاکستان برآمد کر دیا اور اپنے اپنے حامیوں کی مدد سے اپنی ذاتی جنگ پاکستان کی سرزمین پر لڑنی شروع کردی۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم از سرنو پوری صورت حال پر غور کریں اور اپنے دینی معاملات کو خود ہی طے کریں۔ غیر پاکستانی عناصر کو پاکستان کی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت ہرگز نہ دیں۔ جس طرح غیر مسلم قوتوں کا پاکستانی سرزمین کو حربی اور عسکری مقاصد کے لیے استعمال کرنا غلط ہے، اسی طرح دوسری قوتوں کا ہماری سرزمین کو اپنے سیاسی اور گروہی مقاصد کے لیے استعمال کرنا بھی غلط ہونا چاہیے۔

## ہماری چند مطبوعات




# الشریعہ اکادمی